

بہارِ نو

مجموعہ خطبات و مقالات

پرویز

طلوع اسلام ٹرسٹ^(رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

کتاب	بہارِ نو
مصنف	پرویز
ایڈیشن	دوسرا ۱۹۹۶ء بلاتریم
ناشر	طلوعِ لیلِ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور۔ ۱۱
طابع	خالد منصور نسیم
مطبع	التور پرنٹرز و پبلیشرز ۳۴ فیصل نگر ملتان روڈ۔ لاہور
صفحات	
قیمت	

فہرست مشمولات

۱	یورپ کا اوپلا	۱
۲۶	مثالی مملکت	۲
۴۵	قائد اعظمؒ اور اسلامک آئیڈیالوجی	۳
۵۹	قائد اعظمؒ کا پاکستان	۴
۷۴	پاکستان کس نے بنایا ؟	۵
۹۷	جنگ اور نشان	۶
۱۳۱	بنیادی حقوق النسائیت اور قرآن	۷
۱۴۷	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں	۸
۱۷۳	وحدت ملت	۹
۱۹۹	اولیاء اللہ کون ہیں	۱۰
۲۱۱	قیامت موجود	۱۱
	(دین اور مذہب کی کشمکش)	
۲۳۶	حضرت مسیحؑ کی انقلاب آفریں تعلیم	۱۲
۲۴۳	حضور رسالت مآبؐ کی کہانی، خدائے برتر کی زبانی	۱۳
۲۶۶	اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	۱۴
۲۹۲	اسلامی آئین کے بنیادی اصول	۱۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یورپ کا وادِیلا

طلوعِ اسلام کنونینشن کی ایک تقریر

(مئی ۱۹۶۱ء)

دُبار کھا ہے اس کو زخمِ در کی تیز دستی نے
بہت نیچے سرول میں ہے ابھی یورپ کا وادِیلا

جب یورپ میں انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اُس نے دیکھا کہ زندگی کے ہر شعبہ پر ایک مذہب مسلط ہے جسے عیسائیت کہا جاتا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ مذہب وہ نہیں تھا جو اللہ کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کو ملا تھا۔ یہ وہ مذہب تھا جسے بعد میں انسانوں نے خود وضع کر کے اس کی نسبت حضرت عیسیٰؑ کی طرف کر دی تھی) یہ مذہب علم و بصیرت کا دشمن، عقل و فکر کا حریف اور سائنٹفک ریسرچ کے راستے میں سب سے بڑی روک تھام۔ دنیا سے نفرت اور ہر مادی علاقے سے قطع تعلق، اس کی تعلیم کے بنیادی ستون تھے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا مذہب اُس وقت تک تو چل سکتا ہے، جب تک
عیسائیت سے بغاوت | انسان علم و عقل سے کام نہ لے۔ لیکن جب وہ عقل و بصیرت سے
کام لینے لگے، اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھنا چاہے تو پھر وہ ایسے مذہب کی راہ نمائی کبھی قبول نہیں
کر سکتا۔ اس ضمن میں مغرب کا مشہور مفکر، ولیم گیمس، اپنی کتاب

میں رقمطراز ہے کہ

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اُسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

اور تہذیب کا مؤرخ (DORSEY) اپنی کتاب (CIVILIZATION) میں لکھتا ہے :-
آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعزازِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اطمینان نہیں۔ اس میں اطمینان کی آرزو باطل، اور آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔ یہ اندازِ نگاہ، صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔

شعور کی بیداری کے بعد اس قسم کے مذہب کے خلاف ردِ عمل لازمی تھا۔ یہ ردِ عمل ہوا اور اسی شدت کے ساتھ ہوا جس شدت سے اس سے پہلے ان پر مذہب مسلط تھا۔ لیکن جیسا کہ غصے اور انتقام کے جذبات کے تابع ہوا کرتا ہے، ان لوگوں سے یہ غلطی ہوئی کہ ان کا ردِ عمل عیسائیت کے بجائے خود نفسِ مذہب کے خلاف اُبھرا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں وہ ایک حد تک حق بھی سچے ان کے سامنے عیسائیت کے سوا کوئی مذہب تھا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں تھا بھی تو وہ عیسائیت سے چنداں مختلف نہیں تھا۔ بہر حال مذہب کے خلاف ان کی طرف سے شدید ردِ عمل ہوا اور انہوں نے ہر اس چیز سے انکار کر دیا جسے مذہب کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ خدا کا انکار، مستقل اقدار کا انکار، انسانی ذات کا انکار، مکافاتِ عمل کا انکار، حیاتِ اخروی کا انکار۔ مذہب کے بجائے جو نظریاتِ زندگی انہوں نے مرتب یا اختیار کئے ان کا ملخص یہ تھا کہ

(۱)۔ کائنات کسی نہ کسی طرح از خود وجود میں آگئی ہے اور اب وہ اندھی

مادی نظریہٴ حیات

فطرت کئے آئین کے مطابق خود بخود مصروفِ عمل ہے۔

۲۔ انسان دوسرے حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے۔ یہ

حیوانات کی طرح کھاتا پیتا، افزائشِ نسل کرتا اور پھر مر جاتا ہے۔ موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ زندگی کے تمام مسائل کا حل، عقلِ انسانی کی رُو سے کیا جاسکتا ہے اور سوسائٹی کے قوانین و ضوابط

ہی اس کی آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

(MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE)

اس نظریہ زندگی کا نام، مادی تصورِ حیات

ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے ایک اہم، ہیکل (ERNST HAECKEL) نے لکھا ہے کہ

”ہم دنیا کے متعلق صحیح علم اور اس کے اہم مسائل کا صحیح حل صرف عقل کی رُو سے دریافت کر سکتے ہیں۔ عقل، انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اُسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ وحی یا معتقدات کا تصور، دانستہ یا نادانستہ یکسر فریب پر مبنی ہے۔“

(RIDDLE OF THE UNIVERSE)

اور مارکس نے کہا کہ

”مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے، جو یا تو ابھی تک اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر ہے یا جس نے اس مقام کو پا کر پھر سے کھو دیا ہے۔ مذہب مظلوموں کی سسکیاں، ایک پتھر کی دنیا کا قلب اور ان حوادث کی روح ہے جن میں روحانیت کا نام نہیں۔ مذہب کی فنا میں حقیقی انسانی مسرت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات اور دیگر تصورات، سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادی انسان کی ہے۔“

تاریخ کا مشہور نقاد اور مبقر سپنگلر (SPENGLER) لکھتا ہے کہ ایک چیز ہوتی ہے تصورِ حیات یا روحِ زندگی اور دوسری چیز ہوتی ہے وہ مادی پیکر جن میں اس تصور کی نمود ہوتی ہے۔ اس تصور یا روح کو کلچر کہا جاتا ہے اور اس کے مادی مظاہر کو تہذیب۔ اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ یورپ کا کلچر، مادی تصورِ حیات تھا اور جس طرح یہ تصور ان کا تمدنی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اخلاقی زندگی میں نمودار ہوا، اس کا نام تہذیبِ مغرب ہے۔ چونکہ اقوامِ مغرب نے سائنٹفک ریسرچ سے فطرت کی قوتوں کو مستحضر کر لیا تھا، اس لئے دنیا کی تمام دیگر اقوام پر انہیں سیاسی تغلب حاصل ہو گیا اور چونکہ محکمِ قومِ حاکم قوم کی ہر ادا میں شانِ محبوبیت نظر آیا کرتی ہے، اس لئے ان کی دیکھا دیکھی ان اقوام نے بھی اسی تہذیب کو اپنا لیا جسے یورپ نے اختیار کیا تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز، دنیا میں اسی تہذیب کی حکمرانی کے منشور سے ہوا۔ اُس وقت ہر طرف سے اس کی تعریف و توصیف کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ہر گوشہ سے اس کی حمد و ستائش کے قصیدے سنائی دیتے تھے۔ ہر قوم اس کی نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے ابنِ آدم نے پھر سے اُس فردوسِ گمشدہ کو پایا ہو جس کی

تلاش میں وہ صدیوں سے مارا مارا پھردا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اس پچاس ساٹھ سال کے عملِ تجربے نے اس تہذیب کے متعلق یورپ کے انسان کو کس نتیجے پر پہنچایا ہے؟ کیا اسے وہ انفرادی اطمینان اور اجتماعی سکون نصیب ہو گیا ہے جس کے لئے اس نے اس تہذیب کو اختیار کیا تھا؟ کیا وہ واقعی آج پہلے سے زیادہ شکھی ہے؟ کیا اسے وہ فردوسِ گم گشتہ مل گیا ہے جس کا خضرِ راہ اس نے اس نظریۂ زندگی کو سمجھا تھا؟ آئیے اس سوال کا جواب، خود یورپ کے مفکرین اور مدبرین کی زبان سے سنیں کہ بہتر اور معتبر شہادت، اس باب میں اور کس کی ہو سکتی ہے؟

مغرب کا ایک مفکر، ڈاکٹر میسن (W.T. MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM)

میں لکھتا ہے:-

”ہم نے زندگی کی ابتدا، سائنس کی کاریگری سے کی، اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقودوں کو حل کر دیں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں۔“

پروفیسر جوائڈ (C.E.M. JOAD) کہتا ہے کہ

سائنس کی تباہ کاریاں ”اس زمانہ میں مشین نے انسان کو بے پناہ قوت دے دی ہے

اور اس قوت سے وہ تعمیر و تخریب کے بے حد و حساب کام لے سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندر کو پھاڑ ڈالے اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ آسمان اس کے سامنے گرد اور کائنات سرنگوں ہے۔ لیکن اتنی قوت پا کر بھی وہ شکھی نہیں ہوا، اور دکھی ہو گیا ہے۔ آج مشین کی طاقت انسان کو مطمئن کرنے کا کام نہیں دے رہی، بلکہ اُلٹا اسے تباہ و برباد کر رہی ہے۔“

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے متعلق برٹریڈ رسل لکھتا ہے کہ

ہماری موجودہ مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو تو بے حساب انداز سے مستحکم کر لیا ہے، لیکن ان قوتوں کو قطعاً مستحکم نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں۔

(AUTHORITY AND THE INDIVIDUAL)

ڈاکٹر ولیم بریڈ (WILLIAM BREND) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:-

ڈاکٹر ولیم بریڈ

”انسان ابھی اس مقام سے بہت دُور ہے کہ وہ سیکھ لے کہ وہ اپنے آپ پر کس طرح حکومت کر سکتا ہے۔ انسان ہر جگہ پریشانی اور بے یقینی کے عالم میں پھردا ہے۔ قدیمی اقدار و عقائد ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ کسی اور چیز نے نہیں لی۔ دنیا کے بیشتر حصے پر تعمیری قوتوں کے بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں اور انسان نے جو کچھ صدیوں سے حاصل کیا تھا وہ سب ختم ہو رہا ہے۔ انسان نے اپنے طبیعی ماحول پر اچھا خاصہ قابو پا لیا ہے۔ لیکن اس نے اپنے جذباتی ماحول پر قابو پانا ابھی نہیں سیکھا۔“

(FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICTS)

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب انسان کے سامنے بلند مستقل اقدار نہ ہوں، جب کوئی غیر متبدل اصول اس کی آزادی اور پابندی کے حدود و منغیث نہ کریں، جب زندگی کا مقصد صرف مادی مفاد اور طبیعی لذت کا حصول رہ جائے، تو انسان اپنے حیوانی جذبات کے تابع زندگی بسر کرے گا۔ یہ جذبات تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ یعنی جذبہ تحفظ، خویش، جذبہ تغلب اور جذبہ افزائش نسل۔ جب ہر فرد کا مطمح نگاہ اپنے ان جذبات کی تسکین ہو تو انسان کی اجتماعی زندگی میں جس قدر تصادم و تزاخم واقع ہو گا اس کی زندہ شہادت موجودہ انسانی معاشرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی عقل و فکر اس کی راہ نمائی کر لے گی اور اسے اس کے جذبات کی تسکین میں بے زام نہیں ہونے دے گی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ عقل، انسان کے اندر ایک قوت ہے جس کا کام انسانی جذبات کے تقاضوں کے لئے جواز کے دلائل بہم پہنچانا اور انہیں بروئے کار لانے کے لئے تدابیر سمجھانا ہے۔ — چنانچہ

(DICTIONARY OF PSYCHOLOGY) کی (H.G. WARREN)

ۛ (DEFINITION) میں عقل (RATIONALISM) کی تعریف

تنہا عقل کی پوزیشن

لکھی ہے۔

”عقل اس فہمی عمل کا نام ہے جو اس کام یا رائے کے لئے خوش آئند دلائل تراشے جو درحقیقت کسی اور ہی جذبہ کے ماتحت پیدا ہوا ہو، خواہ اُس شخص کو جس کی عقل یہ کچھ کر رہی ہے اس کا احساس تک بھی نہ ہو کہ اس کام کا جذبہ محرکہ کچھ اور ہے اور یہ دلائل محض عقل کی فسوں سازی ہے۔“

پروفیسر جرد اس باب میں لکھتا ہے:-

”عقل اس قوت کا نام ہے جس سے ہم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں کہ جس بات کو ہم صحیح ماننا چاہتے ہیں وہ درحقیقت صحیح ہے۔ لہذا عقل جذبات کی لونڈی ہے اور ان کے ماتحت اسی طرح چلتی ہے جس طرح گتے کے پاؤں اس کی ناک (سونگھنے کی قوت) کے پیچھے چلتے ہیں۔“

پروفیسر آئن سٹائن ہمارے دور کا سب سے بڑا ریاضی دان سائنسٹ تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصے میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہی (OUT OF MY LATER DAYS) تھا۔

وہ اس کتاب میں لکھتا ہے:-

”ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رُو سے نہیں سلجھ سکتیں۔ سائنس کی تحقیقات اکثر اوقات نوعِ انسانی کے لئے بڑی مہلک ثابت ہوئی ہیں۔ ان سے انسان کو طبعی زندگی میں آرام اور عشرت تو ضرور مل گئے لیکن اس کی داخلی دنیا میں عجیب قسم کا کرب و اضطراب پیدا ہو گیا جس سے وہ اپنے ٹیکنیکل ماحول کا غلام بن کر رہ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اُسے خود اپنی تباہی کے لئے بڑے بڑے سامان مل گئے۔ اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنانا چاہیے۔ اس خدا کے عضلات (MUSCLES) تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات (PERSONALITY) نہیں ہے۔ عقل ذرائع و اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی ہے۔“

یہ ہے (وحی کے بغیر) وہ عقل جسے تہذیبِ مغرب نے اپنا امام بنایا تھا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا، اس کے متعلق (DORSEY) لکھتا ہے کہ

”ہماری موجودہ تہذیب، اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی نظام کے ہر شعبے میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے۔“

اس دورِ تہذیب و تمدن اور قدیم عہدِ جہالت و بربریت میں جو فرق ہے اسے (ALDOUS HUXLEY) کے الفاظ میں سنئے، وہ لکھتا ہے:-

”اس باب میں دورِ جاہلیت اور عہدِ حاضر میں بس فرق یہ ہے کہ ہم کھلے ہوئے تشدد کی دنیا سے فریب کاری

ماجب عقل و وحی کی روشنی میں چلتی ہے تو اس سے کس قدر تعمیری کام سرانجام پاتے ہیں اس کے متعلق بعد میں لکھا جائے گا۔

(ENDS AND MEANS)

کی دنیا کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔“

یعنی عہدِ جاہلیت کا وحشی انسان جو کچھ کھلے بندوں کرتا تھا ہمارے زمانے کا مہذب انسان وہی کچھ عقلِ حیدر کی قریب کاریوں کے پردے میں کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیسیاؤں میں مدرسوں میں

ہوس کی خوریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی غائش!

یہ تو ہے اس تہذیب کے لامقنوں انسانی معاشرہ کی حالت۔ اس نے افراد کے ساتھ کیا کیا ہے، اس کا نقشہ اس سے بھی بھیا نکسہ اور سولناک ہے۔ آپ نے ڈاکٹر جگت (JUNG) کا نام سنا ہوگا۔

افراد کی بیکلی

وہ عصرِ حاضر کا مشہور علم النفس کا ماہر ہے۔ اس نے اپنی عمر بچوں اور فوجانوں کی نفسیات کے مطالعہ میں گزاری ہے۔ وہ اپنی مدتِ العمر کے تجربے کے بعد دورِ حاضر کے انسان کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے اسے اس نے اپنی کتاب

(MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL)

میں

ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے :-

”عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں یعنی ان

حوادث کے مقابلہ میں ہراساں جن پر وہ اپنے دور کی سیاسی اور معاشی تدابیر کے زور پر قابو نہیں

پاسکتا۔ یہ تو اس کی خارجی حالت۔ اور اگر وہ اس خارجی دنیا سے ہٹ کر اپنی داخلی دنیا کی طرف

جھانکتا ہے تو وہاں اُسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔“

اقبالؒ مدتِ ہوئی عہدِ حاضر کے انسان کی قلبی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا۔

عشقِ ناپید و خود می گزروش صورتِ بے

عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کرنے سکا!

دھوئے ٹٹنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا

اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے سکا!

جس نے سورج کی شعاعوں کو گر فنا کیا

زندگی کی شبِ تاریک سحر کرنے سکا!

یورپ میں اس تہذیب پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن امریکہ میں یہ سنوڑ اپنے شباب پر ہے۔

وہاں یہ کس قسم کی نسل پیدا کر رہی ہے اس کے متعلق وہاں کے مشہور اہل قلم

امریکہ کی حالت

کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اپنی کتاب

(MUMFORD LEWIS)

میں لکھتا ہے :-

(FAITH FOR LIVING)

”امریکہ میں ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی، خوبصورت جسم، لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ یہ نوجوان، یہ مہذب وحشی حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں کھڑے آفتابی غسل کر رہے ہیں۔ کبھی بیکار جنسی میلان کی تحریک پر ناچنے لگ جاتے ہیں۔ یہ لوگ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں^{اللہ} مچاتے ہیں ایسی زندگی جی کر جو اگر کامیاب تو زیادہ سے زیادہ حیوانی لذتیں حاصل کرنے کی اور اگر ناکام ہے تو حسد، خوف، اور پریشانی کی حیوانی سطح کی لذتوں کے سوا، انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان لذتوں سے محروم کر دیجئے تو ان کے جینا و بال و دوش ہو جائے۔“



تہذیبِ مغرب کا سب سے بڑا مایہ ناز کارنامہ اس کا سیاسی نظام سمجھا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد نیشنلزم
نیشنلزم کی تباہ کاریاں
کی (HERD-INSTINCT) ہے جس کی رو سے

ہر حیوان محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ تنہا رہے گا تو غیر محفوظ ہوگا اور گلتے کے ساتھ رہے گا تو خطرات سے مامون ہوگا۔ اسی جذبہ کے ماتحت انسانی افراد نیشن کا جزو بن کر رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر نیشنلزم کی عمارت بھی جذبہ تحفظِ خویش پر استوار ہوتی ہے۔ اس جذبہ کے تحت جس قسم کا تصادم افراد میں ہوتا ہے اسی قسم کا اقوام میں ہوتا ہے۔ یعنی اب افراد کی جگہ اقوام ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ لندن یونیورسٹی کا پروفیسر الفریڈ کوٹن اس ضمن میں لکھتا ہے :-

”قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جو نہی کوئی قوم اپنے حقِ خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو وہ ان اقوام کا گلا دبانا شروع کر دیتی ہے، جو اپنے لئے حقِ خود مختاری کی مدعا ہوں۔“

(THE CRISIS OF CIVILISATION)

(NATIONALITY IN

اپنی کتاب

(FREDRICK HERTS)

تاریخِ قومیت کا عالم

میں لکھتا ہے :-

HISTORY AND POLITICS)

”تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے اپنے نام الگ رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) ایک انگریز کے دل میں کسی فرانسیسی، ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔“

برٹریڈ رسل اس باب میں لکھتا ہے :-

”ہمارے زمانہ میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسانی کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر غاشایہ ہے کہ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خواب چیز ہے، لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔“

(THE HOPE FOR A CHANGING WORLD)

آئس ہکسلے اس مسلک کے متعلق لکھتا ہے :-

”نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیّت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح و وحدتِ انسانیّت کے مقصد کے حصول کے لئے اس مذہب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

یہ ہے نیشنلزم کا وہ مسلک جسے مغرب نے یہ کہہ کر اختیار کیا تھا کہ اس سے نوعِ انسانی کی سیاسی اور تمدنی زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس خرابی کی بنیادی وجہ بھی وہی مادی تصورِ حیات ہے جس کی رُو سے کوئی قوم مستقل اقدار یا غیر متبدل اصولوں کی پابند

اخلاقی اصولوں سے بے اعتنائی

(MY COUNTRY RIGHT OR

نہیں ہوتی

WRONG)

ہر قوم پرست کا عقیدہ ہوتا ہے۔ لہذا وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کے مفاد کے تحفظ

(WALPOLE)

کے لئے کسی قاعدے اور قانون یا ضابطہ اور اصول کی پروا نہیں کرتا۔ اسی بناء پر

نے کہا تھا کہ

۱۔ اپنے وطن کی حفاظت اور چیز ہے اور نیشنلزم بطور مسلک اور چیز۔ قرآنِ کریم مستقل اقدارِ انسانیّت کی حفاظت کے لئے وطن کی حفاظت ضروری قرار دیتا ہے، لیکن انسانیّت سے نفرت کے لئے نہیں۔

”نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک نہیں جاسکتے۔“
 اس حقیقت کو اٹلی کے مدبّر (CAVOUR) نے سمجھا کہ ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ
 ”اگر ہم اپنی ذات کے لئے وہی کچھ کریں جو ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیطاں بن جائیں گے۔“

اب رہا جمہوری طرزِ حکومت، سو مغربی جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ ایک قوم کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنا لے۔ ان کے اوپر کوئی اور **مغربی جمہوریت کی فساد انگیزیاں** اقتدار نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ اپنے حقِ قانون سازی میں اپنے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط کے سوا کسی اور حد و دو قیود کی پابند ہوتی ہے۔ اس طرزِ حکومت کا نتیجہ کیا ہے، اس کے متعلق کیمرج یونیورسٹی کا پروفیسر (A.C. EWING) اپنی کتاب

(THE INDIVIDUAL, THE STATE AND WORLD GOVERNMENT)

میں لکھتا ہے کہ

”اگر روس، عہدِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔“

یہ اس لئے کہ مشہور اطالوی مدبّر مینینی (MEZZINE) کے الفاظ میں :-

”اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔“

ظاہر ہے کہ جس نظام کی بنیاد ہی مفادِ خویش کے تحفظ اور مصلحتِ بینی کے مسلک پر ہو اور جس میں خدِ صداقت کو اپنے فیصلوں کے پرکھنے کا معیار نہ قرار دیا جائے، وہ نظام کبھی دیر پا نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں تہذیب کا مشہور مؤرخ (BRIFFAULT) اپنی شہرہ آفاق تصنیف (THE MAKING

OF HUMANITY) میں لکھتا ہے :-

”انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا، خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی حسنِ تدبیر اور دانش مندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیاد ہی کمزوری، خارجی

نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔“

اقبالؒ کے الفاظ میں :۔

تدبیر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، مغرب کے مشینی دور (نظامِ کارخانہ داری) نے اس باب میں اس قدر

تباہی پیدا کی ہے کہ اس سے انسانیت کی روح کا نپ اٹھتی ہے اس نظام

نظامِ کارخانہ داری

کی بنیاد کس تصور پر ہے؟ اس کے متعلق (BRIC GILL) اپنی

میں لکھتا ہے کہ

(MONEY AND MORALS)

مشہور کتاب

”ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں، مشینیں ان سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد سے انسانی محنت

میں بڑی بچت ہو جاتی ہے۔ لہذا ہمیں مشین کو نہیں انسان کو ختم کرنا چاہیے۔ یہ انسان، جنہیں ہم دنیا کے

مشادینے کے خواہش مند ہیں، وہ انسان ہیں جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں، نہ کہ وہ انسان جو گلی محلوں

میں بیٹے ہیں۔ یہ انسان تو ہمارے سامنے ہیں، ہمارے دوست ہیں، کیونکہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آج کل

سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ چیزوں کے پیدا کرنے میں انسانی محنت میں کس طرح زیادہ سے زیادہ بچت

کی جائے۔ اور ان چیزوں کے استعمال کرنے والوں کی تعداد میں کس طرح زیادہ سے زیادہ اضافہ

کیا جائے اور ان کے خریدنے کی قوت کو بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ جڑ بھی یہی

ہے اور شاخ بھی یہی۔“

بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ ساری خرابی نظامِ سرمایہ داری کی ہے اور اشتراکی نظام (کمیونزم) اس کا

حل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نظامِ سرمایہ داری انسانیت کے لئے پیامِ مرگ ہے، لیکن کمیونزم اس کا

حل کس طرح پیش کر سکتی تھی؟ خرابی کی اصل بنیاد یہ تصور ہے کہ انسان کے اوپر کوئی مستقل اقدار نہیں

جن کی پابندی اس پر لازم ہو۔ کمیونزم کی ساری عمارت اسی بنیاد پر استوار

کمیونزم کی خرابیاں

ہوتی ہے۔ لیکن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے۔

”ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائط کی مذمت کرتے ہیں جو کسی باخلاق عظیمہ عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے

خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ پارٹی کے مفاد کی جنگ کے تابع رہتا چاہیے۔ ہر وہ حربہ جو قیم غاصباً

نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے عین اخلاق

ہے۔ اشتراکیوں کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت کا استحکام کس صورت میں ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے۔ چنانچہ پارٹی کے مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب دروغ بانی، فریب دہی عین حق و صداقت ہے۔ نہیں! بلکہ دشمنوں کے خلاف کذب و اقرا ہی بعض..... اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔“

یہ فریب دہی اور دروغ بانی دشمنوں کے خلاف ہی نہیں، بلکہ عند الضرورت خود اپنی جماعت کے خلاف بھی انہی حربوں سے کام لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ (GOI. ANCZ) اپنی کتاب (OUR THREATENED VALUES) میں لکھتا ہے کہ (DR. G. LUCKUE) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی فریب دہی سے کام لیں؟ اس نے جواب میں کہا کہ ”اشتراکی اخلاق کی رد سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔“

لہذا سوال نہ نظام سرمایہ داری کا ہے نہ اشتراکیت کا نہ جمہوری نظام حکومت کا نہ ڈکٹیٹر شپ کا۔ اصل سوال ہے اس تہذیب کا جو مادی تصور حیات کی پیداوار ہے اور جس کا شکار تمام اقوام مغرب اور ان کی دیکھا دکھی دیگر اقوام عالم ہو چکی ہیں۔



اب سوال یہ ہے کہ مادی تصور حیات کی پیدا کردہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا ستایا ہوا، مغربی انسان اب اپنے لئے کس قسم کی زندگی کی تلاش کر رہا ہے؟ آپ جب ان تصورات و احساسات اور خیالات پر غور کریں گے جو گزشتہ پچاس سال کے تلخ تجربہ کے بعد یورپ کے مفکرین و مدبرین کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ اب ان کے سامنے جس قسم کی زندگی کے دُشمنانہ سے نقوش اُبھر رہے ہیں وہ وہی ہے جسے آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن کریم نے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود اور امن و سکون کا ضامن قرار دیا تھا۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ مادی تصور حیات باطل ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی بے شک انہی قوانین کے تابع ہے جن کے تابع دیگر حیوانات کی زندگی ہے۔ لیکن

انسانی ذات کا اقرار

ہے۔ انسانی جسم ہر آن بدلتا ہے۔ لیکن انسانی ذات تغیرنا آشنا ہے مشہور
پولش مفکر یارڈیو (NICHOLAS BERDYEAU) اس

باب میں لکھتا ہے:-

”دنیا میں جس قدر تغیرات رونما ہوتے ہیں ان کے متعلق انسان کا اندازِ نگاہ دہرا ہونا چاہیے۔ زندگی تغیرات کا نام ہے اور جدت کے بغیر زندگی کچھ نہیں۔ لیکن صرف تغیر کا تصور فریب انگیز ہے۔ شخص خویش کے لئے تغیر اور جدت کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں ایک ایسی شے بھی ہے جو مستقل اور تغیرنا آشنا ہے۔ لہذا اپنی نشوونما میں انسان کو خود اپنے آپ سے فریب دہی نہیں کرنی چاہیے۔ یعنی اس مستقل شے کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو اسے ابدی طور پر ملے ہے۔ زندگی کے لئے یہ چیز نہایت ضروری ہے کہ تغیرات کے اس پیہم عمل سے جس سے جدت نمودار ہوتی ہے ذات کے ثبات کا استخراج کیا جائے۔“ (THE DIVINE AND HUMAN)

قرآن نے کہا تھا کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کو حیات جاوید حاصل ہو جاتی ہے۔ انسان کی طبعی موت سے انسانی ذات نہیں مرنی۔ یہی وہ بنیادی تصور ہے، جس پر دہی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے مشہور روسی مفکر اوسپنسکی

حیات بعد الممات

(P.D. OUSPENSKY) اپنی کتاب (IN SEARCH OF THE MIRACULOUS) میں

اپنے استاد گرجیف کے الفاظ میں لکھتا ہے:-

”اگر انسان ہر آن بدلتا رہے، اگر اس میں کوئی ایسی شے نہ ہو جو خارجی تغیرات سے متاثر نہ ہو، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ عام حالات میں ہم ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے اور اس طرح طبعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔“

قرآن کریم نے کہا تھا کہ جس طرح انسان کی طبعی زندگی کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اصول متعین ہیں۔ انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار نہ ہر فرد کی ذاتی پیدا کردہ ہوتی ہیں، نہ انہیں انسان مل کر باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ ان کا ایک مطلق معیار (ABSOLUTE STANDARD)

ہے جو کسی کے لئے نہیں بدلتا۔ جب انسان کے کسی طبعی تقاضے اور مستقل قدر میں (TIE) پڑ جائے تو

اخلاقی اقدار

مستقل قدر کے تحفظ کے لئے جسمانی تقاضے کو قربان کر دینا، کیریگٹریا اخلاق کہا جاتا ہے مغرب کے مادی تصویر حیات نے ان تمام اصولوں کا مذاق اڑایا، لیکن اب دیکھئے کہ وہیں کے مفکر

اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ راشڈل (RASHDAL HASTINGE) اپنی کتاب (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے:-

”اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔ یہ اقدار مستقل ہیں۔ مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کر لے کہ مستقل قدر کیا ہے انہیں عالمگیر ہونا چاہیئے، جنہیں ہر شخص تسلیم کرے اور اس کا معترف ہو۔“

قرآن نے کہا تھا یہ مستقل اقدار، عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ انسان کو وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ مادی نظریہ حیات، عقلِ انسانی سے ماوراء کسی سرچشمہ علم کا قائل نہیں تھا۔ اب دیکھئے کہ مغرب کے مفکرین اس باب میں کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ آئن سٹائن اپنی کتاب (OUT OF MY LATER DAYS) میں جس

کا حوالہ پہلے بھی دیا جا چکا ہے، لکھتا ہے:-

وحی کی ضرورت

”سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ کیا ہے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ کیا ہونا چاہیئے۔“

اس لئے اقدار کا متعین کرنا اس کے اثر سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے وہ مذہب کے خلاف محاذِ قائم کر بیٹھتے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک شے ہوتی ہے۔ اس کی دنیا میں آرزو، اقدار، خیر و شر، نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین کر سکتی ہے اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کر سکتی۔“

آگے چل کر یہ سائنس دان لکھتا ہے:-

”یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اُسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔“

(ERNST CASSIRER)

کا مصنف پروفیسر

(AN ESSAY ON MAN)

شہرہ آفاق کتاب

لکھتا ہے:-

”یہ حقیقت کہ دنیا میں بڑی مبہم چیز ہے اور اس کے فیصلے یوں ہی تسلیم کر لینے کے قابل نہیں ہو سکتے، انسان کو کبھی معلوم نہ ہو سکتی اگر اس کی طرف وحی کی روشنی نہ آتی۔ وحی نے ہی اگر اُسے اس حقیقت سے آگاہ کیا عقل اس قابل ہی نہیں کہ وہ صداقت اور حکمت کی طرف راہنمائی کر سکے۔“

مادی نظریہ حیات کے ماتحت، اول تو خدا کی ہستی سے یکسر انکار ہی کر دیا جاتا ہے لیکن اگر اسے مانا بھی جاتا ہے تو صرف اس حد تک کہ خارجی کائنات میں اس کے وضع کردہ قوانین نافذ ہیں۔ جہاں تک انسانوں کی دنیا کا تعلق ہے اس میں اس کے قوانین کا کوئی عمل دخل نہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ خدا کی ہستی پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ انسان کو اس کی طرف سے راہنمائی ملتی ہے۔ اٹیڑنگٹن ہمارے دور کا بہت بڑا عالم طبیعیات گذرا ہے، وہ اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے:-

”اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔“

یہ صاحبِ وحی ہستیاں کس قسم کی ہوتی ہیں، اس کے متعلق بار دیو لکھتا ہے:-

”نبوتِ خدا لای الہام پر مبنی ہوتی ہے۔ صاحبِ وحی، دنیا اور انسان کے مقدرات اور مستقبل کے متعلق خدا کی آواز سنتا ہے۔ حاملِ وحی اپنے آپ کو دنیا میں تنہا پاتا ہے۔ وہ جن قوموں کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے وہ اسے بچھڑاتی ہیں لیکن بایں ہمہ وہ انہیں چھوڑ کر الگ نہیں ہو جاتا۔ یہ وحی اکتسابی نہیں ہوتی جسے ارتقائی مدارج سے حاصل کیا جاسکے۔ یہ تو ایک داخلی شے ہے۔ ایک پیغمبر کی وحی ہندوستان اور یونان کے صوفیوں کے کشف سے بالکل منفرد ہوتی ہے۔“

ان ہستیوں پر ایمان، انسان کی منزلِ مقصود کے لئے خطرِ راہ بنتا ہے اور یہی ہے وہ ایمان جس کے فقدان سے یورپ کا نوجوان اس قدر پریشان ہے اور جس کی تلاش میں آج وہ مارا مارا پھرتا ہے۔ ڈاکٹر ٹینگ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس باب میں لکھتا ہے:-

ایمان کا فقدان میں نے اپنی زندگی کے نصفِ آخر میں جس قدر مریفوں کا تجزیہ نفس کیا ان میں سے ایک

بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویہ نگاہ کی تلاش نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس شے کو ضائع کر دیا تھا جو ”زندہ مذہب“ انسان کو مہیا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی شے ”دے دی جاتی جو ان سے گم ہو چکی تھی۔ یہی ان کی دوا تھی۔ ایمان، اُمید، محبت، نگہِ خود ہیں۔

ایمان کس بات پر؟ خود اپنی ذات پر مستقل اقدار پر؟ ان اقدار کے سرچشمہ، ذاتِ خداوندی پر؟ اس کی طرف سے عطا کردہ وحی پر۔ اور انسانی ذات کے حیاتِ جاوید حاصل کر لینے پر۔ قرآن نے یہی ایمان کے اجزاء بنائے ہیں۔ یہ ایمان، انسان اور کائنات اور انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ صحیح تعلقات اُسٹوار کرنے کے علاوہ ان تضادات کو بھی رفع کر دیتا ہے جو خود انسان کی اپنی ذات میں جذبات اور عقل اور عقل اور بلند اقدار کی کش مکش سے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی پریشانی کا اصل سبب اس کے یہی داخلی تضادات ہوتے ہیں۔ میسن اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

داخلی تضادات کا حل ”اخلاق صرف اس ضابطہ کا نام نہیں جو انسان اور انسان کے درمیان تعلقات

کو صحیح معیار کے مطابق طے کرتا ہے، بلکہ اس میں وہ ضابطہ بھی شامل ہے جس کی رُو سے انسان کے خود اپنی ذات کے ساتھ تعلقات بھی صحیح خطوط پر متشکل رہتے ہیں۔“

یہ گستاخانہ کہتا ہے کہ انسان کو جب یہ داخلی توافق حاصل نہ ہو، معاشرت میں کبھی وحدت اور توافق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے۔

”جو توازن ہمیں سطح پر نظر آتا ہے، اس سے کہیں گہرا اور حقیقی توازن انسان کی اپنی ذات کے اندر ہونا چاہیئے۔ جن معاہدات کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی رُو سے معاشرہ کا ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے، ان کا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ خود ہمیں ہماری ذات کے ساتھ مربوط کر دیں۔“

(THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION)

نیشے نے اس باب میں ایک عجیب بات کہی ہے، وہ کہتا ہے کہ

”جو برائی تم نے میرے ساتھ کی ہے اُسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن جو برائی تم نے اپنے ساتھ کی ہے اُسے کون معاف کرے گا؟“

قرآن ایسی تعلیم دیتا ہے جس سے انسان، نہ دوسرے انسان کے ساتھ برائی کرے اور نہ ہی اپنی ذات کے خلاف اسی سے انسان کے خارجی اور داخلی تضادات میں توافق پیدا ہوتا ہے۔



تصویر کا بالادفع ہے کہ یورپ کو اب پھر مذہب کی تلاش ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے مذہب کا متلاشی ہے؟

یورپ کس قسم کا مذہب چاہتا ہے

مذہب متضاد انسانی قویٰ میں وحدت پیدا کر کے ان میں سے ہر قوت کے لئے اختیار و استعمال کا میدان پیدا کر دیتا ہے۔“

قرآن کریم انسانی ترقی کے میدان کی وسعت کے متعلق کہتا ہے: **وَمَنَّحَرَّ تَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ** — (۲۵۴) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے لئے مستخر کر دیا ہے۔ تم اٹھو اور ان سے کام لو۔

یورپ کو جس مذہب کی تلاش ہے اس کے لئے وہ دوسری شرط یہ عائد کرتا ہے کہ اسے عقل و بصیرت کا

دشمن نہیں ہونا چاہیے۔ مغرب کے نامور مفکر لاک (LOCKE)

عقل و بصیرت کا دشمن نہ ہو

نے اس تقاضے کو چند الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے سمجھا

دیا ہے جب وہ کہتا ہے کہ :-

”جو شخص وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر عقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں

(ESSAYS-BOOK IV)

کے چراغ گل کر دیتا ہے۔“

ڈاکٹر آٹو (OTTO) اس ضمن میں لکھتا ہے :-

”جب تک کوئی مذہب عقل و بصیرت کے غلام اپنے اندر رکھتا ہے وہ قعصب اور توہم پرستانہ

باطنیت کی پست سطح پر گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی مذہب جو انسانیت کا مذہب بن سکے گا اہل

(THE IDEA OF THE HOLY)

ہوتا ہے۔“

قرآن کریم، بدترین خلائق اُن انسانوں کو قرار دیتا ہے جو عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ وہ کہتا ہے کہ: **إِنَّ شَرَّ الْأَشْيَاءِ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ**۔ (۲۴۴) اللہ کے نزدیک تمام ذی حیات

مخلوق میں بدتر وہ انسان ہیں جو بہرے گوئی بن کر زندگی گزار دیتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ وہ

ایسے لوگوں کو جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے: **وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ**

وَالِإِنْسِ۔ اور بہت سے مذہب اور غیر مذہب انسان تو محض جہنم کا ایندھن بننے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔ یہ

وہ لوگ ہیں۔ **لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ** یہاں۔ ”وہ دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں

لیتے۔ **وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ** یہاں۔ ”اُن کی آنکھیں تو ہوتی ہیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں

لیتے۔ **وَلَهُمْ أُذُنٌ لَا يَسْمَعُونَ** یہاں۔ ”ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے سننے کا کام

نہیں لیتے۔ ”اُولَئِكَ كَانَا نَعَامَ بَنٍ هُمْ اَصْلُ“۔ ”یہ بظاہر انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ حیوانوں کے مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔“ اُولَئِكَ هُمُ الْخَافِلُونَ (پہ) اس لئے کہ وہ علم حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔“

اس مذہب کے متعلق مغربی مفکرین بھی کہتے ہیں کہ اسے اندھی تقلید سے نہ مانا جائے۔ بلکہ انسان اسے

خود سوچ سمجھ کر اختیار کرے۔ وہاٹس پیڈ اس ضمن میں کہتا ہے کہ

اندھی تقلید نہ ہو

”یہ قطعاً ناکافی ہے کہ انسان صرف یہ دیکھے کہ سابقہ زمانے میں کیا کچھ ہوتا رہا اور کس طرح ہوتا رہا ہے اور خود بھی اُسی طرح کرتا چلا جائے۔ اس اسلوب زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی جامد بن کر رہ جاتی ہے۔“

راشل اس باب میں لکھتا ہے کہ

”کیا ہم یہ سمجھیں کہ اخلاقی امور میں غور و فکر، گناہِ عظیم ہے؟ کیا ہم اسے تسلیم کر لیں کہ انسان کو آنکھیں بند کئے ان قواعد و ضوابط کی پابندی کئے جانا چاہیئے جنہیں وہ اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے۔ اگر ہم ایک ثانیہ کے لئے بھی غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ان سوالات کا جواب یکسر نفی میں ہے۔ اخلاقی تعلیم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان خود سوچے۔ جو انسان خود نہ سوچے بلکہ زندگی کی تمام جزئیات میں دوسروں کی تقلید کرتا چلا جائے، اس کے متعلق سمجھ لو کہ وہ ایسا انسان ہے، جس میں کیریکٹر ہی نہیں۔ بریڈلے نے کیا خوب کہا ہے کہ ”جو شخص اپنے ماحول سے بہتر بننے کی خواہش کرتا ہے، سمجھ لو کہ وہ حیاتِ جاوداں کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔“

قرآن کریم، اندھی تقلید کو انسانیت کا بدترین جرم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: ”وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا آَلَفَيْنَا عَلَيْهِ“ ”جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ وحیِ خداوندی کا اتباع کریں تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مسلک پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے۔“ اس پر قرآن کہتا ہے کہ: ”أَوَلَمْ نَكُنْ أَوْلَىٰ بِآبَاءِهِمْ لَا يَحْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ“ (پہ) ”خواہ ان کے آباؤ اجداد نہ کچھ سوچھ بوجھ رکھتے ہوں اور نہ ہی صحیح راستے پر چلتے ہوں۔“ یہ پھر بھی انہیں کی پیروی کرتے جائیں گے۔

وہ وحی پر بلا سوچے سمجھے ایمان لانے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ مؤمنین کی خصوصیت یہ بتاتا

ہے کہ: اَلَسِّنِّیْنَ اِذَا اُذْکِرُوْا بِآیَاتِ رَبِّہِمَّ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْہَا صُغًۢمًا (۲۵)۔
 ”یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور
 اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔“ وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور علم و بصیرت کی بنا پر انہیں تسلیم کرتے ہیں۔
 اس مذہب کے متعلق وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے اصول غیر متبدل
اصول غیر متبدل ہوں | ہونے چاہئیں۔ لیکن ان اصولوں کی جزئیات زمانے کے بدلتے

ہوئے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہنی چاہیے۔

وہاٹس ہیڈ اس ضمن میں لکھتا ہے کہ :-

”زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں مقید رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو
 بھی سائنس کی طرح بدلتے ہوئے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس کے اصول ابدی ہو سکتے
 ہیں لیکن ان اصولوں کی تعبیرات تو حالات کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔“

(SCIENCE AND THE MODERN WORLD)

(CASSIRER) لکھتا ہے :-

”قدیم الایام کا مذہبی تصور انسانی آزادی کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ وہ انسانی اعمال
 کے لئے ہی نہیں بلکہ انسانی جذبات تک کے لئے جامد اور ناقابلِ تغیر قوانین مقرر کرتا ہے۔ اس سے
 انسانی زندگی ایک مستقل بوجھ کے نیچے دبی رہتی ہے۔ وہ قدم قدم پر ”یہ کرو۔ یہ نہ کرو“ کی زنجیروں
 میں جکڑی رہتی ہے۔“

قرآنِ کریم انسانی اعمال و جذبات کے لئے بڑا وسیع میدان کھلا رہتا ہے۔ اس نے صرف چند احکام اور قواعد
 دیئے ہیں۔ باقی معاملات کے لئے وہ صرف حدود (BOUNDARY LINES) مقرر کرتا ہے جن

کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے آپ جزئیات متعین
 کرتے ہیں۔ اس کی یہ حدود غیر متبدل رہتی ہیں اور ان کے اندر مرتب کردہ ضوابط، زمانے کے تقاضوں کے
 ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کے متعلق کہتا ہے: وَكَلَّمَكَ رَبِّكَ مِنْ فِیْءِ قَاعٍ وَعَدَّ لَا مُبَدِّلَ
 لَیْلَہِ (۲۶) تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے انہیں کوئی بدلنے والا نہیں۔
 جہاں تک ان اصولوں کی روشنی میں طے کئے جانے والے ضوابط کا تعلق ہے، وہ جماعتِ مومنین کے متعلق

کہتا ہے: ”وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ“ (۴۲) ”ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔“ اس طرح غیر متبدل اور بدلنے والے عناصر کے امتزاج سے انسانی زندگی ترقی کرتے آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ قرآن کی رو سے زندگی ایک جوڑے رواں ہے جسے ہر آن متحرک رہنا اور آگے بڑھتے چلے جانا چاہیے۔ وہ زندگی کے رُک جانے کے مقام کو جہنم کہتا ہے۔



ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یورپ نے اپنے سیاسی نظام کی بنیاد نیشنلزم اور جمہوریت پر رکھی تھی اور اب وہ ان دونوں کے ہاتھوں بُری طرح تنگ آچکا ہے۔ قرآنِ کریم نے نیشنلزم کی جگہ عالمگیر انسانیت کا نظام تجویز کیا ہے۔ یعنی ایسا نظام جس میں تمام نوری انسانی کو ایک عالمگیر برادری کے افراد تصور کیا جائے۔

عالمگیر انسانیت کا قیام | كَانِ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (۲۱۳) اس کا بنیادی اصول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ثبات و دوام صرف اسی نظام کو حاصل ہو سکتا ہے جو کسی ایک پارٹی، ایک گروہ، ایک نسل، ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام نوری انسانی کے لئے یکساں طور پر منفعت بخش ہو۔ اس کا ارشاد ہے کہ: ”وَأَمَّا مَا يَبْتَغِي النَّاسُ فَبِمَا كُنْتُمْ فِي الْأَرْضِ“ (۲۱۴) اس قسم کے عالمگیر نظام کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ تمام کرہ ارض کو اصولی طور پر ایک اقتدار کے تابع رکھا جائے۔ اس کے نزدیک یہ اقتدار ان مستقل اقتدار کے سوا جو خدا نے بذریعہ وحی دی ہیں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ (اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر ”جمہوریت“ کے تحت دی جائیگی۔) اب دیکھیے کہ اس باب میں مفکرینِ مغرب کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ پروفیسر کوٹن اپنی اس کتاب کے آخر میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے لکھتا ہے:-

”دنیا کے مسائل کا جو حل سامنے آ رہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے“

یورپ کے مدبرین نے نیشنلزم کی پیدا کردہ مصیبتوں کا حل ”لیگ آف نیشنز“ یا متحدہ اقوام جیسے

انٹرنیشنل اداروں کے قیام میں سوچا۔ اس سلسلہ میں پولیٹیکل سائنس کے ماہر (EMERY REVES)

نے ایک مختصر لیکن بڑی جامع اور فکر انگیز کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے

(THE ANATOMY OF PEACE)

وہ اس میں لکھتا ہے:-

”ہم انٹرنیشنلزم سے بھی کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے، وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں

جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریے نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر امن قائم کرنا چاہتی ہے۔“

یہی مفکر دوسرے مقام پر لکھتا ہے:-

”کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح جمہوری انداز سے اس اقتدار واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیے جن پر یہ اقتدار متشکل ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیے تاکہ یہ مقصد نعوں ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔ اگر اس اقتدار کا حصول اس طرح ممکن نہ ہو تو پھر تاریخ کا فولادی ہتھیار مجبور کر دے گا کہ ہم اور خونریزی کریں۔ اور آج سے زیادہ مہلک آلات حرب و ضرب وضع کریں تاکہ سب سے زیادہ طاقتور جماعت باقی دنیا کو مجبور کر کے وحدتِ اقتدار قائم کر لے۔“

اول ثبہ ناممکن نظر آتا ہے کہ اور زیادہ مہلک ہتھیاروں سے کسی ایک جماعت کو غلبہ کُلّی حاصل ہو جائے۔ نظر یہی آتا ہے کہ اس سے پوری نسلِ انسانی دنیا سے محو ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس طرح کسی ایک جماعت نے واحد اقتدار قائم کر بھی لیا تو اس کی آہنی گرفت میں انسانیت کا جو حشر ہوگا اس کے تصور سے روح کا بیتی ہے۔ قرآن کے پیش کردہ عالمگیر اقتدار کے معنی یہ ہیں حکومت کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کے ہتھ میں نہ رہے۔ وہ کسی انسان کو اس کا حق ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ اقتدار ان غیر متبادل اصولوں کو حاصل ہو جو تمام نوعِ انسانی پر یکساں طور پر نافذ ہوں اور جن میں تغیر و تبدل کا کسی کو اختیار نہ ہو۔ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲) کے یہی معنی ہیں۔ یہ موقع نہیں کہ میں ان اصولوں کو تفصیل طور پر پیش کروں۔ اس وقت صرف اتنا کہ دنیا کافی ہوگا کہ ان اصولوں کے لئے خود مغرب کے مفکرین اور مدبرین بے حد مضطرب و

بے تاب ہیں۔

جہاں تک اندازِ حکومت کا تعلق ہے، قرآن کا اصول یہ ہے کہ مملکت کے قانون سازی کے اختیارات غیر مقید (UN-RESTRICTED) نہیں۔ وہ صرف ان حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتب کر سکتی ہے جو وحی کے غیر متبدل عالمگیر اصول متعین کرتے ہیں۔ ان اصولوں میں تغیر کرنا یا انہیں بدلنا مملکت کے حیطہ اقتدار سے باہر ہے۔ مغربی تصورِ مملکت میں

قرآنی جمہوریت

اختیارات مطلق (ABSOLUTE) ہوتے ہیں اور اسی سے وہ تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جن سے یورپ اس وقت دوچار ہے۔ میزینی اس باب میں لکھتا ہے :-

”اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو حکومت بھی قائم ہو، اس میں نتائج کی حقیقت ایک سی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھئے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں

بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو“ (C.F. INTERPRETTERS OF MAN)

قرآنِ کویم، حکومت کو قوانینِ خداوندی کے نافذ اور مستقل اقدار کے رائج کرنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ: وَمَنْ تَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (۵۶) جو خدا کے نازل کردہ قوانین کے مطابق حکومت نہیں کرتے تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔ البتہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ان قوانین کی جزئیات مرتب کرنے اور ان کے نفاذ کے لئے اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا کام نمائندگانِ ملت کے باہمی مشورہ سے ہوگا۔ اس حد تک یہ حکومت جمہوری ہوگی۔

یوں تو مادی نظریہ حیات نے زندگی کے ہر شعبہ میں فساد پیدا کیا ہے۔ لیکن معاشی گوشے میں

اس کی تباہیاں بڑی انسانیت سوز ثابت ہوئی ہیں۔ عیسائیت کے اس عقیدہ نے کہ غریبوں کی یادداشت بہت آسمان میں ہے، زمین پر نہیں، رزق کے تمام سرچشموں کو بے محابا "دنیا داروں" کے سپرد کر دیا۔ اس سے..... دہاؤں کے نظام سرمایہ داری کو بڑی تقویت ملی۔ اس کا رد عمل کمیونزم کی شکل میں رونما ہوا۔ کمیونزم میں ایک چیز ہے اس کا معاشی نظام (ECONOMIC ORDER) اور دوسری چیز ہے،

وہ فلسفہ زندگی، جس پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار ہے۔ اس کے معاشی نظام

معاشی نظام بعض اجزاء قرآن کے معاشی نظام سے ملتے جلتے ہیں (قرآن نظام سرمایہ داری کا شدید دشمن ہے) لیکن اس کا فلسفہ زندگی جو مادی تصور حیات کی شدید ترین شکل کا مظہر ہے، قرآنی تصور زندگی کی نفیض ہے۔ اس لئے اسلام کے نزدیک یکسر ناقابل قبول۔ کمیونزم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "جو کچھ..... معاشی نقطہ

نگاہ سے اچھا ہے، وہی اخلاقی نقطہ نگاہ سے اچھا ہے (WHAT IS ECONOMICALLY GOOD IS MORALLY GOOD)

کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد اس نظریہ

IS MORALLY GOOD)

پر ہے کہ "ہر شخص زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے۔" قرآن کا بھی یہی نظریہ ہے۔ لیکن کمیونزم کے فلسفہ کی رو سے اس سوال کا جواب کسی کو نہیں مل سکتا کہ ایک شخص زیادہ سے زیادہ کما کر کم از کم اپنے لئے کیوں رکھے، اور باقی سب دوسروں کو کیوں دے دے؟ اس کا اطمینان بخش جواب صرف قرآنی تصور حیات کی رو سے مل سکتا ہے۔ اس تصور کی رو سے جس طرح انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے کوئی فرد خود استعمال کرے۔ اس کی ذات کی نشو و نما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دے اور چونکہ ذات کی نشو و نما بلند ترین مقصد زندگی ہے، اس لئے اس تصور پر ایمان رکھنے والا انسان کوشش کریگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کمائے اور پھر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیدے۔ یوں وہ مقصد، جو کمیونزم آپنی پردوں کے پیچھے استبداد کے ڈنڈے سے چھل کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہے، قرآنی نظام میں از خود، بطیب خاطر، حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔

پروفیسر (HAWTREY) نے لکھا ہے:-

ہرچیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جس سے وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔"

کمپوزم کا مادی نظریہ حیات، اس مقصد کے لئے کوئی جذبہ محرکہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس قرآنی نظریہ حیات ایسا مستحکم جذبہ محرکہ عطا کرتا ہے جو کبھی ٹھنڈا نہیں پڑ سکتا۔ (جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ میری کتاب ”نظامِ ربوبیت“ کا مطالعہ فرمائیں)۔ مغرب نے اپنے نظامِ سرمایہ داری کو بھی آزما کر دیکھ لیا اور کمپوزم کی تباہ کاریاں بھی دنیا کے سامنے آ گئیں۔ اب دنیا کو ایک ایسے معاشی نظام کی تلاش ہے، جس میں نہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے اور نہ کمپوزم۔ اور جس سے روٹی کا مسئلہ فرد کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے حل ہو جائے۔ یہ نظام قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔



برادرانِ عربز! آپ نے دیکھ لیا کہ مغرب نے جو تصورِ حیات اختیار کیا تھا، اس کے تباہ کن نتائج سے وہ کس قدر ہراساں و پریشان ہے اور اب کس طرح جدید نظام کی تلاش میں مضطرب و سرگرداں۔ یہ نظام اسے قرآن کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآن کا نام لینے والی قومیں زندگی کی دوڑ میں اقوامِ مغرب سے بھی پیچھے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آگے بڑھنے والی قومیں کبھی ان قوموں کی بات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا کرتیں جو خود ان کی دستِ نگر ہوں۔ مسلمانوں کے لئے خود عزت کا مقام حاصل کرنے اور دنیا کو موجودہ جہنم سے نجات دلانے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ کسی ایک خطہ، زمین میں قرآنی نظام کو عملاً رائج کر کے اس کے انسانیّت ساز نتائج سامنے لائے جائیں۔ ان نتائج کو دیکھ کر دنیا خود بخود اس کی طرف لپک کر آئے گی، اور اس طرح جنت سے نکلا ہوا آدم، اپنے فردوسِ گمشدہ کو پھر سے پالے گا۔ میری آرزو ہے کہ یہ خطہ، پاکستان کی سرزمین ہو۔ یہی طلوعِ اسلام کی تحریک کا مقصد ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِيَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

(۱۹۶۱ء)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مثالی مملکت

(طلوع اسلام کنونشن ۱۹۶۲ء کا خطاب)

”تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اُس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی اطمینان اور سب سے زیادہ عقلمندی ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی، اچھی حکومت کہا جاسکے۔ اُس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ عجیب العقول ہیں۔ اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزمائشیں۔ لیکن جب اُن کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اُسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اس بابِ حکومت پبلک گفٹ خادِم ہیں۔ لیکن درحقیقت حکومت کا فریضہ، پبلک کی خدمت نہیں، بلکہ سلب و مہذب ہو جانا ہے۔“

یہ الفاظ عہدِ قدیم کے کسی سیاست دان یا مفکر کے نہیں، جو اس نتیجہ پر اُس زمانے میں پہنچا ہو جب انسان نے ہنوز محض دو ایک اسالیبِ حکومت کا تجربہ کیا تھا اور اُسے ان نظامِ ہائے مملکت کا علم نہیں تھا جنہیں افسانہ نے بعد میں وضع اور اختیار کیا۔ اگر اس کے سامنے، بعد کے وضع کردہ نظام ہوتے تو وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔ یہ الفاظ خود ہمارے زمانے کے ایک ماہرِ سیاست

(H.J. MENCKEN)

کے ہیں جنہیں اس نے

(TREATISE ON RIGHT AND WRONG)

اپنی کتاب

میں عہدِ قدیم سے لے کر عصرِ حاضر

تک کے تمام نظام ہائے حکومت، کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے۔ اس میں مغرب کا وہ جمہوری نظام بھی شامل ہے جو اس وقت تک کی فکرِ انسانی کی آخری ایجاد ہے اور جس پر یورپ کو بڑا ناز ہے دیا بڑا ناز تھا۔ اس، سب سے آخری نظام کے متعلق پروفیسر مینکن لکھتا ہے کہ

جمہوری نظام

”ان مختلف، اسالیبِ حکومت میں سب سے زیادہ ناکام، نظامِ جمہوریت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے اربابِ حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیے۔ لیکن ان کا جذبہ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے، اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے، یہ لوگ ان عناصر کے توسط سے فی الحقیقت پیابک کے دشمن ہوتے ہیں، لامتناہی عرصہ تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں۔“

مغرب کے جمہوری نظام کی ناکامی کی اصل وجہ کیا ہے، اس کے متعلق ہم بعد میں دیکھیں گے۔ سِرِ دستِ صرف اتنا دیکھئے کہ مؤرخین اور مفکرین کی رائے یہ ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کے پانچ چھ ہزار سال کے عرصہ میں جس قدر اسالیبِ حکومت وضع کئے ہیں، ان میں ایک بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ سب ناکام رہے ہیں۔ میں نے ”مؤرخین اور مفکرین“ اس لئے کہا ہے کہ انسان نے سابقہ نظام ہائے حکومت کے ناکام تجارب کے بعد جس جمہوری نظام کو اختیار کیا تھا، اس کے ہاتھوں یورپ کے قریب قریب تمام اربابِ فکر و نظر تنگ آچکے ہیں۔ اور اس کی بجائے کسی بہتر نظام کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پھر رہے ہیں (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”انسان نے کیا سوچا“ میں ملے گی)۔

سوال یہ ہے کہ انسان نے، اتنے طولِ طویل عرصہ میں، اس قدر مختلف اور متنوع تجربے کئے تو اس کی کیا وجہ تھی کہ ان میں کوئی تجربہ بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ سب ناکام رہ گئے۔ انسان کی مایوس کن ناکامی کے اسباب و وجوہات کی تفصیل میں جائیں تو نہ معلوم داستان کس قدر طویل ہو جائے۔ لیکن اسے اگر چند لفظوں میں سمیٹنا چاہیں تو اس ناکامی کی بنیاد

ناکامی کی وجہ کیا ہے؟

وجہ یہ سامنے آئے گی، کہ انسان نے جو نظامِ حکومت بھی وضع کیا، اس میں حکومت کا اختیار و اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔ مختلف زمانوں میں حکومت کی شکلیں بدلتی رہیں، لیکن ہر یک میں یہی کارفرما رہی۔ وہ قدیم ترین زمانے کا قبائلی نظام تھا، یا بعد کا شاہنشاہی نظام، وہ مذہبی پیشوائیت کے سہاروں پر قائم شدہ

خداوندی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا حامل نظام تھا، یا خدا کو حدودِ مملکت سے باہر نکال کر، سب کو لہذا کا نظام، وہ عصرِ حاضر کا کٹھنر شپ کا نظام تھا یا انسانی ذہن کی آخری تصنیف — جمہوری نظام، ان سب میں ایک ہی حقیقت کار فرما رہی اور کار فرما ہے۔ اور وہ یہ کہ ان میں حکومت کا اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت، اس نے قوتِ بازو سے سلطنت حاصل کی ہو یا وہ لوگوں کا منتخب کردہ ہو، اس کا نتیجہ، آٹھ دس ہکسلے کے الفاظ میں یہ کہ

”تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوتِ اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو اور ایسا باور کرنے کے لئے کوئی دجہ موجود نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آ رہا ہے وہ آج نہیں ہو گا یا آئندہ بھی ایسا ہی نہیں ہوتا رہے گا۔“

(SCIENCE, LIBERTY AND PEACE)

”تشکیلِ انسانیت“ کا مصنف بر فو، اس سلسلہ میں لکھتا ہے :-
یہ بیماری لازمی اور لاعلاج ہے۔ ارادے کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، جب اقتدار ہاتھ میں آ جائے تو اس کے مہلک اثرات سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ نشہِ اقتدار وہ بلا ہے جس سے انسانی قلب کی ہر حرکت اُلٹی ہو جاتی ہے۔
ہر شے ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ ہر نقطہ نگاہ باطل ہو جاتا ہے۔ ہر فیصلہ میں ذاتی رجحانات کی رنگ آمیزی ہو جاتی ہے۔ ہر معاملہ میں تعصبِ ذخیل ہو جاتا ہے۔ تمام ذہنی سکے، فریب کے ٹیکسٹ میں ڈھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ پُر فریب اقتدار دل و دماغ پر مستولی ہو جاتا ہے۔“

اسی حقیقت کو ہمارا حکیم مشرق ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سوار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ اہم کا یہ سپاسِ ازی ہے
صاحبِ نظر ان نشہِ قوت ہے خطرِ ناک
اس سبب سبھی میوز میں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و مہر میں خس و خاشاک
”اسکندر و چنگیز کی طرف اشارہ کرنے سے یہ مقصد نہیں کہ انسانیت کی بیہنہا ہیاں، صرف شخصی حکمرانوں کے ہاتھوں سے آئی ہیں۔ جمہوری حکومت میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ
ہے وہی سازِ کہنِ مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیرانِ نوائے قیصری

دیوارِ استبدادِ جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے سلیم پری!

سوال شخصی اور جمہوری حکومت کا نہیں۔

”ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، استبداد ہے۔ طاقتور ہمیشہ کمزور کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔ قوت، عدل و انصاف کو پامال کر دیتی ہے۔ اس لئے ظالم و جابر ہوتی ہے۔ یہ انکشاف آج کا نہیں، بہت قدیمی ہے کہ اقتدارِ مطلق بنیادی طور پر باطل ہے خواہ یہ کسی کے ہاتھ میں بھی کیوں نہ ہو۔ لارڈ آئیچٹن لٹے ٹھیک کہا تھا کہ قوت انسان کو خراب کر دیتی ہے، اور مطلق قوت، اسے بالکل خراب کر دیتی ہے۔ نشہ اقتدار سے انسان میں معقولیت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ قوت کسی رنگ میں ہو، اس کے پی تباہ ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجرہ فولاد کی، دولت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی، دفاتری زندگی میں کسی افسر کی ہو یا حاکم کی، کسی پادری کی ہو یا پروہت کی، قوت بہر حال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیداد گری ہوتا ہے اور ان سب میں سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت، محض اپنی تعداد کے زور پر، اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ (برفو۔ تشکیلِ انسانیت)

یورپ کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے خلاف کمیونزم نے آواز بلند کی تھی اور دنیا کے مزدوروں کو پکار کر کہا تھا کہ، اس لعنت کے خلاف متحدہ طور پر محاذ قائم کرو۔ اس میں سوائے تمہاری نہ بخیریں ٹوٹ جانے کے اور کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ جو رواجِ استبداد کے سنائے ہوئے انسانوں نے، اس آواز کو نویدِ مسیحا سمجھا اور اس آئینِ نو کو گھلے سے لگایا۔ لیکن تجربہ نے جلد ہی بتا دیا کہ کمزوروں کو آزادی اس سے بھی نہیں نصیب ہو سکتی ہے

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!

طریقِ کوہن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

لارڈ اسٹیل اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ

”حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو نوعِ انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں،

وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوش مند نہیں ہو سکتے (THE NEW WORLD)

اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ انسان فطرۃً ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ کوئی قابلِ اطمینان نظامِ حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن برعکس انسان کی بدفطرتی پر محمول نہیں کرتا۔ وہ اپنے اسی نظریہ کو دہراتا ہے کہ »قوت بہر حال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہر شخص فطرۃً بد واقع ہوا ہے بلکہ اس لئے کہ قوت کا نشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔«

ان نصریات سے واضح ہے کہ انسان اپنے پانچ چھ ہزار سال کے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جب تک اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں رہے گا، (خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت) دنیا میں اطمینان بخش نظامِ تمدن و مملکت قائم نہیں ہو سکے گا۔ ایسے نظام کے قیام کے لئے اولیں اور بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت کا اختیار اور اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہے۔

سوال یہ ہے کہ جس نتیجہ پر انسان، اتنے طویل المیعاد تجربات اور اس قدر جانکاہ مشقّتوں اور جگر پاش مصیبتوں کے بعد پہنچا ہے، جس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے اسے اس قدر خون کے دریا بہانے اور آگ کی خندقیں پرانی پڑیں، جس کے لئے انسانیت صدیوں تک ٹرپتی، پھڑکتی، لٹتی جھلستی اور ذبح ہوتی رہی، کیا یہ آواز اس سے پہلے بھی کہیں گنائی دی تھی۔ اور اگر گنائی دی تھی تو اس نے کیا نتیجہ پیدا کیا تھا؟ ہاں! یہ آواز آج سے قریب ڈیڑھ ہزار برس پہلے، عرب کی سرزمین میں، جہاں اس سے پہلے علم و بصیرت کی کرن تک کا گزرنہ ہوا تھا، ایک صحرائی شہر کی زبان سے بلند ہوئی تھی جس نے وحیِ خداوندی کے الفاظ میں ساری دنیا کو دکا کر کہا تھا کہ: **إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ**۔ (۱۶)

زبانِ وحی کا اعلان

حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے

سروری زیناً فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

حکمران ہے کہ اک وہی باقی تباہِ آذری

وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۶) اور حقیقت یہ ہے کہ اس حق میں کسی کو شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم کائنات کی ساری مخلوق میں انسان کا مقام سب سے اونچا ہے۔ جب انسان اس حقِ خداوندی میں شریک نہیں تو اس کے بعد اس میں اور کون شریک ہو سکتا ہے۔

برگستان نے کہا تھا کہ

”مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ، انسانوں پر نہیں بلکہ اشیاء پر ہونا چاہیے، تاکہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اقتدار نہ ہو۔“

(THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION)

جہاں تک اشیائے کائنات پر اقتدار کا تعلق ہے، زبانِ وحی نے انسانوں سے کہہ دیا کہ: وَتَسْخَرُ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ۔ (۲۵/۱۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے سب کو، اپنے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا تاکہ انسان، ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے۔ آدم کے سامنے ملائکہ کے سجدہ ریز ہونے سے مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان، کائنات کی ہر قوت کو مستحضر کر سکتا ہے۔ اس لئے اشیائے کائنات پر انسان کا کل اقتدار ہے لیکن جہاں تک خود انسانوں کا تعلق ہے، خدائے کائنات نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْبَةَ شَعًا يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲۱/۳۱) کسی انسان کے..... شایانِ شان نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین، ان قوانین کو نافذ کرنے کا اختیار اور توبت تک بھی دے دے تو وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کی محکومی

لیکن انسانوں پر نہیں | کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو۔۔۔۔۔ اسے پھر سن لیجئے کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ دنیاوی حکومت کی مسندوں پر ہر جہاں ہو جانے والے تو ایک طرف رہے کسی نبی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں پر اپنی حکومت چلائے۔ وہ یہی کہے گا کہ: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ (۱۹/۱۹) میں خود خدا کا محکوم ہوں، اس لئے مجھے حق حکومت کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

برادرانِ عربیہ! غور کیجئے اس سے بڑا انقلابی اعلان، کائنات کی فضاؤں میں کہیں اور بھی سنا گیا ہے؟ وہ اعلان جس نے اس تصور کو یکسر باطل قرار دے دیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار اختیار حاصل ہے۔ اس اعلانِ عظیم نے انسانوں کے خود ساختہ ایوانہائے حکومت و سطوت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا۔ اور غلامی اور محکومی کی ان تمام زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا جس میں انسانیت صدیوں سے جکڑے چل رہی تھی۔ وَیَفْضَحْ عَنْهُمْ اَمْْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ۔ (۲۵/۱۱۳) خواہ یہ زنجیریں، دنیاوی حکمرانوں کے تغلب و تسلط نے انسانوں کی گردن میں ڈال رکھی ہوں اور خواہ مذہبی

پیشوائیت نے تقدس و عقیدت کے ہاتھوں، انہیں لوگوں کے دل و دماغ کے گرد لپیٹ ہو۔ اس زلزلہ انگیز اعلانِ حریت نے ان تمام زنجیروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور انسان کو دنیا میں گردن اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔

خدا کی حکومت مفہوم

یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ”خدا کی حکومت سے مفہوم کیا ہے؟“ خدا نہ کسی کے سامنے آتا ہے نہ اس کا تختِ حکومت کہیں بچھا ہوا نظر آتا ہے۔ نہ کسی نے اُسے کوئی حکم دیتے دیکھا ہے، نہ اس کی آواز سنی ہے۔ پھر اس کی حکومت کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس سے مراد، انسانوں کا، خدا کے نام پر حکومت کرنا ہے؟ کیا اس سے مطلب یہ ہے کہ بعض انسانوں کو خدائی اختیارات حاصل ہوتے ہیں، اگر یہی مطلب ہے تو، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ اس سے بڑھ کر انسانی استبداد اور سخت گیری کی مثال کسی اور اندازِ حکومت میں نہیں ملے گی؟ انسان نے جس قدر خدا کا نام لے کر دوسرے انسانوں کو ستایا ہے، شیطان کے حقے میں اس کا عشرِ عشر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اور تماشا یہ کہ فرعون اور ہلکوں اور چنگیز نے اگر انسانوں پر مظالم روا رکھے تو دنیا آج تک اُن کا نام لعنت اور مچھٹکار سے لیتی ہے۔ لیکن جن ”مقدسین کے طائفہ“ نے ان سے کہیں زیادہ انسانیت کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگے، ان کے مجسمے پرستش گاہوں میں نصب کئے گئے۔ لہذا خدا کی حکومت یہ مفہوم تو ہو نہیں سکتا۔ وہ قرآن جو کسی نبی تک کو انسانوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں دیتا، عام انسانوں کو اختیاراتِ خداوندی استعمال کرنے کا حق کیسے دے گا؟ آپ دیکھئے کہ انسانی اقتدار و اختیار سے مراد کیا ہے؟ انسان دوسرے انسانوں پر کس طرح حکومت کرتا ہے؟ آپ عہدِ قدیم کے بے آئینی کے دور کو چھوڑ بیٹے، جب ایک انسان محض قوت کے زور پر دوسرے انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ حکومت ”قانون“ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جس انسان یا انسانوں کی جماعت کو قانون سازی کا حق ہوتا ہے، زمانِ اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ جماعت جو کچھ کرنا چاہتی ہے پہلے اس کے لئے ایک قانون وضع کر لیتی ہے۔ اس کے بعد، اس کا ہر قدم، قانون کے مطابق (LEGAL) ہو جاتا ہے اور ہر حرکت، آئینی (CONSTITUTIONAL) قرار پا جاتی ہے۔ اس کا نام انسانوں کی ڈکٹنری میں ”ہندب طرزِ حکومت“ یا عادلانہ اندازِ مملکت ہے۔ لیکن اگر الفاظ کے ان حسین و جمیل پردوں کو ہٹا کر اصل حقیقت کو دیکھیں تو آٹھ دوس ہیکے کے الفاظ میں :-

اس باب میں دوسرے جاہلیت اور عہدِ حاضر میں بس یہ فرق نظر آئے گا کہ ہم کھلے ہوئے تشدد کی

(ENDS AND MEANS)

دنیا سے فریب کاری کی دنیا کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

قرآن قانون سازی کا حق کسی انسان، یا انسانوں کی جماعت کو نہیں دیتا۔

قانون سازی کا حق

وہ قانون کے سرچشمہ اور ماخذ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ وَعِنْدَهُ

اُمُّ الْكِتَابِ (۱۳۹) وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جس قدر قوانین و ضوابط کی ضرورت تھی ان کے اصول و حدود، خدا نے متعین کر دیئے ہیں جن میں تغیر و تبدل کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ وَتَشْهَدُ كَلِمَاتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَاعْدًا لَا طَوْلَ لَاصِبٍ (۶) اب انسانوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ان اصول و قوانین کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کا فیصلہ کرتے جائیں۔ خدا نے یہ قوانین، قرآن کریم کے اندر منضبط و محفوظ کر دیئے۔ اور اس کے بعد اور تو اور خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا کہ: قَا حُكْمُ بَيْنَهُمْ يَمَّا اَنْزَلِ اللّٰهُ۔ (۵۸) ان کے معاملات کے فیصلے، انہی قوانین کی روشنی میں کرتے جاؤ۔ اور دوسری طرف یہ اعلان کر دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاولئك هم الكافرون (۵۹)

جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے جو خدا نے نازل کیا ہے انہیں کافر کہا جائیگا۔

ان اصول و قوانین کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ مملکت کا

فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق، ان اقدار کو نافذ کرنے کے لئے عملی تدابیر سوچے اور ذرائع و وسائل بہم پہنچائے اس کا ”حق قانون سازی“ صرف اس حد تک محدود ہوگا۔ یہی وہ بنیادی اصول مملکت ہے جس کے متعلق پروفیسر جود نے کہا تھا کہ

”اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے۔ بنا بریں میں کہہ سکتا ہوں کہ

مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار

کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔“

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

قرآن کریم جب مملکت کو مستقل اقدار کے تحفظ کا ذریعہ بتاتا ہے تو اس سے یہ مطلب

مادی اقدار

نہیں کہ وہ محض اخلاقی اقدار (ETHICAL VALUES) کا تحفظ چاہتا ہے

اور مادی اقدار (MATERIAL VALUES) سے اسے کچھ سروکار نہیں۔ وہ نظامِ مملکت کو مادی اقدار کے تحفظ کا بھی ضامن قرار دیتا ہے، اس لئے کہ انسان کی موجودہ سطحِ زندگی پر، اخلاقی اقدار، مادی ذرائع سے ہی بروئے کار آتی ہیں۔ اسی لئے قرآن (SOUND MIND IN A SOUND BODY)

— تو انا جسم میں تو انا قلب — کے اصول کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا نظامِ مملکت کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے مملکت، خدا کی طرف سے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے اور افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاٰبَاہُمْ (۶۶) تمہیں اور تمہاری اولاد کو سامانِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ جب تک مملکت اس فریضہِ خداوندی کو ادا کرتی رہتی ہے، وہ خدا کی حفاظت میں رہتی ہے۔ جب وہ اس سے غافل ہو جاتی ہے، خدا کی ذمہ داری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ :-

اگر کسی بستی میں کوئی ایک شخص بھی اس حالت میں صبح کرے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو، تو اس بستی کے رہنے والوں سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

اور اسی عظیم ذمہ داری کا احساس تھا جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کتا باز پرس ہوگی۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی میں روٹی، کپڑا، مکان، علاج، سب کچھ آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ مملکت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔ اس لئے کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے فرائض کے ضمن میں یہ بھی کہا ہے کہ: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَّہُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوْا الزَّكٰوۃَ (۲۴) وہ سامانِ نشوونما بہم پہنچاتی ہے۔ دوسری جگہ ہے: هُمْ يَلْزَمُوۡا زَكٰوۃً فَاٰتُوۡنَ (۲۳) وہ لوگوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کی تدابیر کرتے ہیں۔ پروفیسر میکنن نے کہا تھا کہ نظری طور پر مملکت، افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی تہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن قرآن نے اس سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ نظری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر، مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی تہیا کرے۔ اور ان کی مضر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامانِ ذرائع بہم پہنچائے۔

یہ مملکت، اس سامانِ پرورش اور اسبابِ نشوونما کو صرف اپنے شہریوں تک محدود نہیں رکھے گی۔ ایسے خدا کے احکام و قوانین کو جاری و ساری کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے جو رب العالمین اور رب الناس ہے۔

یعنی تمام بنی نوع انسان کا پرورش کرنے والا۔ اس لئے یہ مملکت،
تمام انسانوں کی پرورش | اس باب میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرے گی۔ اس
 ضمن میں قوم، ملک، رنگ، نسل، زبان، حتیٰ کہ مذہب تک کا اختلاف بھی کوئی تفریق پیدا نہیں کرے گا۔
 اس کے لئے بس "انسان" ہونا کافی ہوگا۔ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو، کسی قوم کا فرد ہو، کسی نسل سے
 متعلق ہو، کوئی زبان بولتا ہو اور اس کا مذہب بھی کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ مملکت ان سب سے یکساں
 سلوک کرے گی۔ صرف "یکساں سلوک" ہی نہیں، بلکہ ان سب کی یکساں عزت کرے گی۔ اس لئے کہ وہ
 مستقل اقدار جن کے تحفظ کے لئے اس مملکت کی تشکیل ہوتی ہے، ان میں بنیادی حیثیت اس قدر
 کو حاصل ہے کہ: **وَلَقَدْ كَسَّرْنَا بِخِیْ اَدَمَ (ج ۱)** "خدا نے تمام
تکرمیم آدمیت | انسانوں کو، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر واجب التکرمیم
 پیدا کیا ہے۔ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے یکساں عزت کا مستحق ہے۔ اس عزت و تکریم کے لئے
 اس کا آدمی زاد ہونا کافی ہے۔

آدمیت احترامِ آدمی!

اس مملکت کا منشور ہوگا۔

ہمارے زمانے میں، انسانی تباہی کا سب سے بڑا سبب، نیشنلزم کا مغربی
نیشنلزم | تصور ہے جس نے انسانوں کی برادری کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں کہ ایک
 انسان، دوسرے انسانوں کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ انسان کی، اس سے بڑی حماقت کیا ہو گی کہ وہ نقشے
 پر ایک لکیر کھینچ لیتا ہے اور پھر اس لکیر کے دوسری طرف بسنے والے، اپنے ہی جیسے انسانوں سے، شدید
 نفرت اور سخت عداوت دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ ہمارے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ
 مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب، اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ انسانوں کی مختلف
 جماعتوں نے اپنے اپنے نام رکھ لئے تھے۔

(FREDRICK HERTZ: NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS)

ما بعض اقتباسات اس سے پہلے، اس مقالہ میں بھی آچکے ہیں جس کا عنوان ہے "یورپ کا داویلا"۔

یہی وہ نیشنلزم ہے جو برٹریڈرسل کے الفاظ میں :-

نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تاشاہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ ۔
دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ اور اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

(THE HOPES FOR A CHANGING WORLD)

اقبالؒ نے آج سے پچاس سال پہلے کہا تھا کہ تہذیب کے آذر نے جس قدر صنم ترشوائے ہیں ۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے !

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبالؒ نے یہ بات وحی کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں کہی تھی۔ یورپ کے مفکر، پچاس سال کے تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

”نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیّت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیّت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔“

(A. HUXLEY—THE PRENNIAN PHILOSOPHY)

اسی لئے ے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے !

خالی ہے صداقت سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے !

قومیتِ اسلام کی چڑکھتی ہے اس سے

مغرب کے تصورِ قومیت کے مقابلہ میں یہ ”قومیتِ اسلام“ کیا ہے جس کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے ؟ اسے

سمجھ لینے سے قرآن کی پیش کردہ مثالی مملکت کا واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ : **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** | **انسانوں کی عالمگیر برادری**

تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ اس لئے وہی نظامِ تمدنِ صحیح اور کامیاب ہو سکتا ہے جو

پوری انسانیّت کو ایک قوم تصور کر کے قائم کیا جائے۔ جب تک انسان، رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود

کی بنیادوں پر مختلف قوموں میں بٹا رہے گا، دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ یورپ نے نیشنلزم کی تباہیوں کا علاج انٹرنیشنلزم میں سوچا لیکن اتنے مختصر سے عرصے میں تجربہ نے ہی یہ حقیقت اس پرواشگاف کر دی کہ اس مصیبت کا یہ حل بھی نہیں۔ اس لئے کہ

جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل عالمگیر انسانیت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر امن قائم کرنا چاہتی ہے۔

(EMREY REVES-THE ANATOMY OF PEACE)

انسان کے تمدنی مسائل کا یہ وہ حل ہے جسے زبان وحی نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے پیش کیا تھا۔ انسانی ذہن نے اسے اس وقت نہ اپنایا، لیکن اب، صدیوں تک آگ اور خون کی بولی کھینے کے بعد بالآخر وہ اس حل کی طرف آرہا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو مثالی مملکت ان خطوط کے مطابق متشکل کی جائے گی اس کی ابتدا کسی ایک خطہ زمین سے ہوگی۔ یہ خطہ زمین اس عظیم، عالمگیر انقلابی نظریہ کی تجربہ گاہ بنے گا۔ اس خطہ زمین کی حفاظت نہایت ضروری ہوگی۔ اس لئے کہ اگر لیبارٹری ہی محفوظ نہیں رہے گی تو تجربہ کہاں ہوگا؟

مثالی مملکت کی تجربہ گاہ

اس کا مستحکم اور محفوظ رکھنا افراد وطن کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔ وطن وہ صدف ہے جس میں جوہر انسانیت گہر آباد بنا ہے۔ اس لئے گہر کی پرورش اور نشوونما کے لئے صدف کی حفاظت اور استحکام ضروری ہے۔ وطن ہی نہیں بلکہ ساری طبیعی زندگی اور مادی اسباب و وسائل وہ مرکب (VEHICLE) ہیں جن پر سوار ہو کر جوہر انسانیت اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ جو مسافر اپنی سواری کی پروا اور حفاظت نہیں کرتا، اس سے زیادہ حق کون ہے؟ لیکن سواری بہر حال ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے، مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ — وہ (MEANS) ہوتی ہے (END) نہیں ہوتی۔

اب مجھے اس سوال کی طرف آنا چاہیے جو اس مقام پر آپ کے دل میں بار بار اٹھ رہا ہے۔ یعنی اس سوال کی طرف

کہ ”جہاں تک ان اصولوں کا تعلق ہے، وہ توفی الواقعہ مثالی (IDEAL) ہیں، لیکن مملکت کا کاروبار بالآخر

انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پائے گا۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ

وہ انسان ان اصولوں کو اچھی طرح چلا سکیں گے اور انہیں (ABUSE)

نہیں کریں گے۔ جہاں تک محض اصولوں کا تعلق ہے دنیا کی کوئی

مملکت بھی ایسی نہیں جس کے آئین و ضوابط میں کوئی نہ کوئی اچھا

اصول نہ ہو۔ ان سب کے ہاں اچھے اچھے اصول، آئینی ضابطوں میں درج ہیں۔ لیکن انسانی ہاتھوں سے ان اصولوں

کی جو درگت بنتی ہے، وہ سب کے سامنے ہے؟ سوال یہ ہے کہ قرآن اس مشکل کا حل کیا تجویز کرتا ہے؟ سوال بڑا

اہم اور بنیادی ہے، اس لئے اس کا جواب بھی، اسی نسبت سے غور طلب اور محتاجِ توجہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ دنیا کی مختلف مملکتوں میں، باوجودیکہ ان کے آئین و ضوابط میں بلند پایہ اصول مندرج

ہیں، اس قدر فساد کیوں برپا ہے؟ مختلف اقوام میں، باوجودیکہ ان میں بین الاقوامی معاہدات اور عالمی اداروں

کی بلند آہنگ قراردادیں موجود ہیں، باہمی بے اعتمادی اور تخریب کوشی کیوں ہے؟ پھر کسی ایک ملک یا قوم میں

نہایت عمدہ ضوابطِ قوانین و ہدایات کے باوجود، اربابِ اقتدار ان کی پاسداری، اور عام افرادِ مملکت

قانون کا احترام کیوں نہیں کرتے؟

(SPALDING) ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب دیتا ہے۔ وہ اپنی کتاب —

(CIVILIZATION IN EAST AND WEST) میں لکھتا ہے۔

”موجودہ یورپ، دنیا کو ”مادی انجیل“ کا سبق دیتا ہے جس سے زندگی

کے متعلق وہ تصور پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ انسانی امن کے بجائے

دزدوں کی جنگ ہے۔ یہ عالمگیر شورش اور عدم اطمینان اسی تصور کا نتیجہ ہے۔ تہذیبِ مغرب کے

لئے (اور اس کے ساتھ دوسری تمام تہذیب کے لئے جو اس کی نقل کرتی ہیں) خطرہ کا موجب حکومت

کی کوئی خاص شکل نہیں۔ اصل خطرہ کی بات یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت خالص مادی بنیادوں پر قائم ہے جب تک

یہ بنیاد نہیں بدلتی، شکلوں کے بدل دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

سوال یہ ہے کہ مادی ”تصورِ حیات“ کیا ہے جو عالمگیر فساد کی جڑ، قومی تباہ کاریوں کا موجب اور انفرادی خرابیوں کا

باعث ہے۔ اس تصورِ حیات کی تفصیل تو طویل ہے لیکن اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی عبارت ہے اس

مادی تصورِ حیات

کے جسم سے جو طبعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق ایک دن ختم ہو جاتا ہے اور اسی کے خاتمے سے اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہ انسان کی زندگی اس کے مادرِ کچھ اور ہے اور نہ ہی اس کے اوپر کوئی اور قوت ہے۔

اس تصویرِ حیات کا جو اثر زندگی کے اور شعبوں پر پڑتا ہے، سرِ دست اسے چھوڑ بیٹے۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ جہاں تک انسان کی تمدنی اور سیاسی زندگی کا تعلق ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ذیل کی مثالیں اس حقیقت کو واضح کر دیں گی۔

(۱) خروشیف جیسا آمرِ مطلق ہو یا امریکی حکومت جیسا جمہوری ادارہ، **قانون سازی کے اختیارات** دونوں میں قانون سازی کے اختیارات لا محدود ہوں گے۔ سیکولر گورنمنٹ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ کسی غیر متبدل اصول کی پابند ہو نہ کسی ناقابلِ تغیر خلائی شرط سے مشروط۔ وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنائے اور جب جی چاہے اس میں ترمیم کر دے یا اسے منسوخ ہی کر دے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہر مملکت ایسے قوانین مرتب کرے گی جو اس مملکت کے لئے فائدہ مند ہوں۔ اسے باقی دنیا میں پسے والے انسانوں کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ (ROMELIN) نے ٹھیک کہا تھا کہ

”مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کا

خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیے جب اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔“

ان حالات میں جو بین الاقوامی فساد برپا ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

(۲) حکومت میں جو پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی، وہ ایسے قوانین بنائے گی جن سے اس جماعت کے مفادات کا تحفظ

ہو سکے جس کی وہ ناسندگی کرتی ہے، خواہ دوسری پارٹیوں کے مفاد پر اس کی زد کیسی ہی کیوں نہ پڑے۔ جب اس کی جگہ دوسری پارٹی برسرِ حکومت آئے گی تو وہ پہلی پارٹی کے وضع کردہ قوانین کو منسوخ قرار دیگی اور ایسے جدید قوانین مرتب کرے گی جن سے ان کی پارٹی کے مفاد کا تحفظ ہو۔ اس سے خود ملک کے اندر، مختلف جماعتوں اور طبقات میں جس قدر فساد برپا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۳) اس تصویرِ حیات کے تحت، ملک کے قانون کی پابندی صرف وہ شخص کرے گا جسے

قانون کی پابندی اس کا احساس ہو کہ قانون کی خلاف ورزی سے :-

(ا) وہ سوسائٹی میں بدنام ہو جائے گا۔

(ب) پولیس کی گرفت میں آجائے گا، اور

(ج) عدالت اُسے سزا دے گی۔

اگر کوئی شخص ایسا انتظام کرے کہ وہ خلاف ورزی قانون سے پولیس کی گرفت میں نہ آ سکے اور اگر وہ پکڑا بھی جائے تو عدالت سے چھوٹ جائے۔ نیز معاشرہ میں وہ ایسا بااثر ہو کہ کوئی شخص اس کے خلاف لب کشائی نہ کر سکے یا معاشرہ میں جرائم اس قدر عام ہو جائیں کہ جرم کا ارتکاب باعثِ ذلت ہی نہ سمجھا جائے تو اس کے بعد کوئی جذبہ محرمہ ایسا نہیں رہے گا جس کے ماتحت قانون کی پابندی یا اس کا احترام باقی رہ سکے۔ چنانچہ آج کل تمام مہذب ممالک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر جگہ جرائم بڑھتے جاتے ہیں اور جرائم کے انسداد کا علاج، اربابِ نظم و نسق کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جرائم کی کثرت اور پولیس کے اضافہ کی رفتار میں مسلسل دوڑ (RACE) جاری رہتی ہے۔ یہ تو کسی مملکت میں بھی ممکن نہیں کہ ہر شخص کے سر پر ایک سپاہی مسلط رہے۔ اس لئے جرائم کی روک تھام ناممکن ہو چکی ہے۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں کوئی مملکت بھی ایسی ہو سکتی ہے جس کا نظم و نسق صحیح خطوط پر قائم رہ سکے۔ اور کوئی پارٹی بھی ایسی ہو سکتی ہے کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں آئے اور وہ اپنے فائدے کی نہ سوچے؟

یہ ہیں اس مادی تصورِ حیات کے فطری نتائج جس پر تہذیبِ مغرب کی اساس و بنیاد ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی رو سے تصورِ حیات یہ ہے کہ

(ا) انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے

قرآنی تصورِ حیات

انسانی ذات کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشو و نما، مقصدِ حیات ہے۔

(ب) جس طرح خارجی کائنات کے لئے خدا کے متعین کردہ قوانین از خود موجود ہیں۔ وہ انسانوں کے وضع کردہ

نہیں۔ نہ ہی انسان ان میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی ابدی اصول متعین ہیں جن میں کوئی انسان یا انسانوں کی جماعت کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔

(ج) خدا کے مقرر کردہ قوانین کی خلاف ورزی کی سزا کا انحصار اس پر نہیں کہ اگر جرم کرنے والے کو کوئی شخص

دیکھ لے یا اُسے گرفتار کر لے، تو اسے اس کی سزا ملے اور اگر ایسا نہ ہو، تو وہ سزا سے بچ جائے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے انگلی جل جائے گی اور اس میں سخت تکلیف ہوگی۔ اس میں صورت یہ نہیں کہ اگر کوئی شخص آپ کو آگ میں انگلی ڈالتے ہوئے دیکھ لے تو آپ کی انگلی جلے اور اس میں تکلیف ہو اور اگر اسے کوئی دیکھنے نہ پائے تو آپ اس ”جسم“ کی سزا سے بچ جائیں۔ یہ سزا آپ کو بہر حال مل کر رہے گی۔ خواہ آپ اس کا ارتکاب، پہاڑ کی چوٹی پر، یا زمین کے غار کے اندر تنہائی میں بھی کیوں نہ کریں۔ اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

قانونِ مکافات

جس طرح طبعی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کے جسم پر ہوتا ہے، اسی طرح، اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کی ذات پر پڑتا ہے۔ یعنی جس طرح منکھیا کھانے سے انسان کی جسمانی زندگی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح حرام کا مال کھانے سے اس کی ذات تباہ ہو جاتی ہے۔ جس طرح آگ کے غلط استعمال سے ہاتھ جل جاتا ہے اسی طرح اختیارات کے غلط استعمال سے انسانی ذات کی صلاحیتیں مجلس جاتی ہیں۔ اسے جہنم کا عذاب کہا جاتا ہے جس طرح منکھیا اپنا ہلاکت آفریں اثر کر کے رہنا ہے خواہ آپ اسے بند کر کے اندر ایسے وقت میں کھائیں جب کہ آپ کو دیکھنے والا کوئی نہ ہو، اسی طرح مالِ حرام اپنا تباہ کن اثر کر کے رہنا ہے خواہ اس کا کسی کو علم ہو سکے یا نہ۔

سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسْرَأَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ
وَسَايَرُ يَا لَتَهَارَاهُ لَهُ مُعَقِّبٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ
مِّنْ أَمْرِ اللَّهِ ط

(۱۳۳)

اس کے لئے برابر ہے خواہ تم میں سے کوئی بات کو چھپائے یا اُسے بلند آواز سے کہے۔ خواہ وہ رات کی تاریکیوں میں کچھ کرے یا دن کی روشنی میں چلے۔ اس کے آگے اور پیچھے ایسے پاس بان لگے ہوئے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے اور اس کی ہر نقل و حرکت اور قول و فعل کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ریکارڈ کبھی ضائع نہیں ہو سکتا۔ یہ ریکارڈ ہر انسان کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَةً فِي عُنُقِهِ ط

جہاں تک طبعی قوانین کا تعلق ہے، ان کا نقصان صرف اس وقت پہنچتا ہے جب ان کی خلاف ورزی عمل میں آجائے۔ آپ ہزار مرتبہ دل میں خیال کریں کہ جب آپ کے سامنے آگ آئے گی تو آپ اس میں کود جائیں گے۔ اس سے آپ کے جسم پر ذرا بھی آنچ نہیں آئے گی۔ آپ

نگاہ کی خیانت

کا جسم اس وقت جلے گا جب آپ عملاً آگ میں کود جائیں گے۔ لیکن جہاں تک اخلاقی اقدار کا تعلق ہے ان کی خلاف ورزی کا نقصان ارادہ کرنے سے بھی پہنچ جاتا ہے۔ آپ کسی کے ہاں بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ وہ ذرا اندر جائے اور آپ اس کا قلم اُڑالیں۔ آپ دیر تک اسی خیال میں بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن (آپ کی بد قسمتی کہ) وہ اٹھ کر اندر نہیں جاتا۔ آپ بالآخر تھک کر ناکام چلے آتے ہیں۔ آپ نے چوری نہیں کی۔ دنیا کا کوئی قانون آپ سے مواخذہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اخلاقی اقدار کے قانون کی رد سے آپ کی ذات کو اس ارادہ سے بھی سزا مل جائے گی۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ **يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۱۴۱)** ”وہ نگاہ کی خیانتوں اور دل کے ارادوں تک سے واقف ہوتا ہے“

دنیاوی جرائم کی عدالت میں اگر مجرم کے خلاف شہادت یا ثبوت نہ ملے تو وہ چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اخلاقی اقدار کی عدالت میں، نہ کسی خارجی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے نہ باہر کے گواہ کی۔ وہاں ہر مجرم اپنے خلاف خود گواہی دیتا اور ثبوت پیش کرتا ہے۔

اپنے خلاف آپ شہادت

كُفِيَ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِبًا (۱۴۲) ”آج خود تیری اپنی ذات تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے“

پھر جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے کے بعد، گورنر جنرل کی سفارش بھی آپ کو اس کے درد سے محفوظ نہیں رکھ سکتی اور لکھ روپے کی رشوت بھی آپ کو اس تکلیف سے بچا نہیں سکتی۔ نہ ہی کوئی دوسرا آپ کی جگہ وہ دکھ بھگت سکتا ہے۔ اسی طرح مستقل اقدار کی خلاف ورزی کی سزا سے کسی صورت چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔

يَوْمَ مَا لَ الْخَازِي نَفْسٍ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةً وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝ (۲۸)

”اس دن نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کسی کام آسکے گا نہ کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ کچھ معاذ ضحیٰ کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی اس کا کوئی حامی و ناصر ہوگا۔“

قرآن کی مثالی مملکت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جن کا خدا کے اس قانونِ مکافات پر پورا پورا یقین ہو، اس پر ان

ان لوگوں کے ہاتھ میں نظم و نسق

کا ایمان ہو جنہیں یقین محکم ہو کہ اقدارِ انسانیّت کی خلاف ورزی سے ان کی ذات کا نقصان ہوگا اور یہ نقصان دنیاوی فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جس طرح عام مملکت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا جنہیں اپنے نفع نقصان کا بھی ہوش نہ ہو۔ اسی طرح اس مثالی مملکت کا انتظام بھی ان لوگوں کو نہیں سونپا جاتا

جنہیں اپنی ذات کے نفع و نقصان کا خیال نہ ہو۔ ایسے لوگ اس کے اہل ہی تصور نہیں کئے جاتے وہ اس کے لئے (DISQUALIFY) ہو جاتے ہیں۔

ایمان کیسے کہتے ہیں | کہہ دیا جائے گا کہ کرنے کو تو اس قسم کا اقرار ہر شخص کر لیتا ہے لیکن ان باتوں کو عمل میں کوئی نہیں لاتا۔ اس لئے بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ لوگ اپنے ایمان کے مطابق عمل بھی کریں گے۔ اس کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ آپ..... آگ میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟ اس لئے کہ آپ کو یقین ہے کہ آگ میں ہاتھ ڈالتے سے آپ کا ہاتھ جل جائے گا۔ اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان طبعی قوانین کے متعلق ہے۔ مستقل اقدار کے متعلق بھی جس کا ایمان اس قسم کا ہو، اسے ایمان والا کہا جائے گا۔ اس قسم کے ایمان کے بعد ممکن نہیں کہ انسان زبان سے کچھ کہے اور عمل اس کے خلاف کرے۔ جو شخص جانتا ہے کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اس کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ زبان سے تو سنکھیا کو مہلک کہے لیکن جب سنکھیا سامنے آئے تو اسے جھٹ سے نکل لے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ بڑی سے بڑی رشوت بھی اسے اس پر آمادہ نہیں کر سکے گی۔ مال و دولت کا عظیم نقصان بھی اسے اس کے لئے تیار نہیں کر سکے گا۔ وہ سب کچھ برداشت کرے گا لیکن سنکھیا نہیں کھائے گا۔ اسے کہتے ہیں سنکھیا کی ہلاکت آفرینی پر ایمان۔ اس سے کم درجے کا اقرار ایمان کہلاتا ہی نہیں۔ لہذا کسی مومن کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی ایسے کام کے لئے آمادہ ہو جائے جس سے اس کی ذات کی ہلاکت ہوتی ہو۔

ایسے لوگ ہوں گے اس مثالی مملکت کے اربابِ حل و عقد۔

دین کی بنیادوں کی مملکت | یہ بنیادیں جن پر اس مثالی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے، قرآن کی اصطلاح میں دین کے اجزاء کہلاتے ہیں۔ جب مملکت دین کے تابع رہے تو نوعِ انسان کے لئے ایڑ رحمت ہوتی ہے اور جب دین سے الگ ہو جائے تو تباہیوں کا موجب۔ طرزِ حکومت کے بدلنے سے اس میں کچھ فرق نہیں آتا۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو!

جدا ہو دین سیاست تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ مثالی مملکت قائم ہوتی ہے، مستقل اقدار کی بنیادوں پر، اور اس کی بقا کاران، اس غیر متبدل ابدی اصول میں ہوتا ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَحْكُمْتُ فِي الْآسْرِ هَبْ - (۱۳)

بقا اسی کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

کسی خاص جماعت، خاص پارٹی، خاص گروہ، خاص ملک، خاص قوم کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے نفع بخش جتنی کہ

انسانیت کے لئے نفع بخش

اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس مملکت کی نفع رسانیوں سے فیضیاب ہو سکتا ہے۔ اس میں غیر مسلموں کی جان، مال، عزت، آبرو ہی کی حفاظت نہیں بلکہ ان کی پرورش گاہوں تک کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کے معاملات عدل و انصاف کی رو سے طے پاتے ہیں۔

حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس حکم کی تعمیل اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَلَّا تَعْدِلُوْا اَعْدِيْكُمْ اَوْ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵)

کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی

روشِ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

نے کہا تھا کہ

(J.D. MABBOTT)

پروفیسر

”اچھی حکومت اسے کہنا چاہیے جس میں تمام افراد کی حفاظت ہو۔ کسی کو کسی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔

باہمی معاملات میں خوشگواہی ہو۔ افراد کے تنازعات کے فیصلے عدل کی رو سے کئے جاسکیں۔“

(THE STATE AND THE CITIZENS)

قرآنی تصور کے مطابق قائم شدہ مملکت، ان تمام شرائط پر پوری اترتی ہے۔ یہی وہ مملکت ہوتی ہے جس کے انسانیت ساز اور زندگی بخش نتائج سے دنیا دیکھ لیتی ہے کہ ذہنِ انسانی کے تجویز کردہ نظامِ حکومت اور وحی کے خطوط پر متشکل مملکت میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہی فرق جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ مملکت

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بدتر!

ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

۱۹۶۲ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قائدِ اعظمؒ اور اسلام کا آئینہ یاجی

قائدِ اعظمؒ کے یومِ پیدائش پر ۲۵ دسمبر ۱۹۵۹ء کو

سینٹ ہال لاہور میں تقریر

برادرانِ عزیز! آج کی تقریب میں شرکت میرے لئے دو وجوہات سے باعثِ فخر و مسرت ہے۔ ایک وجہ تو بالکل ظاہر اور بین ہے اور وہ یہ کہ یہ تقریب ملتِ اسلامیہ کے اس محسنِ عظیم کی یاد میں منائی جا رہی ہے جس کے یقینِ محکم اور غلِ پیہم کے صدقہ میں آج ہمارا شمار دنیا کی آزاد قوموں میں ہو رہا ہے۔ تاریخ کے جس نازک دور سے ہم گزر رہے تھے، اگر اس وقت حکیمُ الامت علامہ اقبال (علیہ الرحمۃ) پاکستان کا تصور نہ دیتے اور اُس کے بعد قائدِ اعظم (علیہ الرحمۃ) بساطِ سیاست پر نمودار نہ ہوتے تو خود قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہتا۔ اس اعتبار سے ملتِ پاکستانیہ، روحِ قائدِ اعظمؒ کو مخاطب کر کے بجا طور پر کہہ سکتی ہے کہ

حیرت کے علمِ کدہ میں خوشی کا گذر کہاں

تم آگئے تو رونی کا شانہ بند گئی

لہذا قوم کے اتنے بڑے محسن کا حق ہے کہ اس کی یاد اس شان سے منائی جائے جس کی مستحق اس کی عزت اور عظمت ہے۔ میری مسرت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ تقریب قوم کے نوجوان طالب علموں کے زیرِ اہتمام منائی جا رہی ہے، وہ نوجوان

جن کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے (نومبر ۱۹۳۹ء میں اپنے پیغامِ عید میں) فرمایا تھا کہ ”ہم بڑے بڑھوں کی کافی آزمائشیں ہو چکی ہیں۔ لیکن میں آج اپنے نوجوان دم سیتوں کے حلقہ میں بیٹھ کر انہیں بھلا دینا چاہتا ہوں۔ میں ان کے دلوں کے ان تاروں کو چھڑنا چاہتا ہوں جن میں تازہ دلوں کے نغمے خوابیدہ ہیں۔ اس لئے کہ یہی نوجوان ہیں جن کے کندھوں پر ہماری آرزوؤں کے بروئے کار لگنے کا بار بڑھنے والا ہے۔“

آج سے بیس اکیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ انٹر کالجیٹ مسلم برادر بڑھنے (جنوری ۱۹۳۸ء میں) پہلا یومِ اقبالؒ منایا جس میں شرکت کے لئے ہمارا قافلہ علامہ اسلم جیرا چوری (علیہ الرحمۃ) کے زیرِ قیادت دہلی سے یہاں آیا۔ سامنے لاہور کا لچ کے ہال میں جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس وقت لاہور کے کالجوں کے درودیوار، اقبالؒ کے پیغام اور جناح کے نام سے گونج رہے تھے۔ اور ایسا نظر آتا تھا کہ یہ نوجوان طالبِ العلم نہیں، عمل و عقیدت اور ذوق و شوق کا ایک کارواں ہے جو رقصاں و جنباں اور شاداں و فرهاں، جانبِ منزل کشاں کشاں جا رہا ہے۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ اقبالؒ کا پیغام اور قائدِ اعظمؒ کا نام دونوں نظر انداز ہوتے چلے گئے اور اب ایسے طالبِ علم خال خال دکھائی دیں گے جنہیں ان سے کوئی دل بستگی اور پیوستگی باقی رہی ہو۔ ان حالات میں، انہی نوجوان طالبِ علموں کے ایک گروہ کا آگے بڑھ کر، ایسی تقاریب منانا، میرے نزدیک قوم کی نشاۃِ ثانیہ کی علامت اور اس کے مستقبل کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ میں ان نوجوانوں کو ان کے اس جذبہ اور عمل پرستہ حقِ مبارک باد سمجھتا ہوں۔

ن
برادرانِ عزیز! یہ سمجھنے کے لئے کہ قائدِ اعظمؒ کے سامنے معاملہ کیا تھا، ان کی دشواریاں کیا تھیں؟ انہوں نے ان تمام دشواریوں پر کس طرح قابو پا لیا، اور پاکستان کا کونسا تختہ انہوں اور بے گانوں کے سامنے پیش کیا ضروری ہے کہ ہمیں اس دور کا پس منظر معلوم ہو۔ یہ ہماری قیمتی ہے کہ آج ہمارے پاس نہ تو قائدِ اعظمؒ کے کوئی قابلِ اطمینان سوانح حیات ہیں اور نہ ہی ہماری جنگِ آزادی کی کوئی مفصل اور مستند تاریخ۔ آج تو پھر بھی ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جنہوں نے اس جنگ میں خود حصہ لیا اور اس کے مناظر دیکھے تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب یہ لوگ اٹھ جائیں گے تو آنے والی نسلوں کے لئے یہ داستان ایک فسادہ کہن بن کر رہ جائے گی۔ قوم کے مستقبل کے لئے اس کے ماضی کی سچی اور صحیح تاریخ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

بہت بڑی کمی

تھا: ایک سیاسی زندگی، دوسری معاشرتی زندگی۔ لیکن گاندھی جی نے اگر اس اصول کو توڑ دیا۔ انہوں نے پرانے طور اکتروں کی تشخیص کو غلط قرار دے کر بتایا کہ ہماری سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم اخلاقی، روحانی اور معاشرتی زندگی سے جدا کر سکیں۔ اس لئے ہماری سیاسی جدوجہد کو معاشرتی، اخلاقی اور روحانی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہی نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر اہل ملک کے ہاتھ میں دے دیں، بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفہ، حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفہ، زندگی کے ماتحت ہونا چاہیے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہو اور ہماری زندگی کا ایک بالکل نیا باب شروع ہو، جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

اس اقتباس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کانگریس کا نصب العین ہندوستان میں ایسے معاشرہ کا قیام تھا جو مہاتما گاندھی کے پیش کردہ فلسفہ و حیات پر مبنی ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی کس فلسفہ و حیات کے معتقد تھے۔ سوال کا جواب خود ان کی اپنی زبان سے سنئے۔ انہوں نے اپنے متعلق لکھا تھا:-

”میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں۔ کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پراون اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو ماننا ہوں۔ افتادوں کا قائل ہوں اور ناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گنور کھنشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔... میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔“

(بحوالہ خطبہ صدارت، قائد اعظم، آل انڈیا مسلم لیگ سیشن دہلی ۳۰/۴/۲۷)

یہ مظاہر اور ان عزیز! وہ عجیب خطرہ جس سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے قائد اعظم انگلستان میں بودو مانڈ اختیار کر لینے کے بعد پھر ہندوستان آئے اور میدان سیاست میں اترے تھے۔ انہوں نے اگر اعلان کیا کہ مسلمان اپنا جداگانہ تصور زندگی، جداگانہ فلسفہ و حیات، جداگانہ

قائد اعظم کا اعلان

کلچر رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو کسی اور فلسفہ و حیات میں جذب نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے ملازمین سیشن (۱۹۴۱ء) کے خطبہ و صدارت میں فرمایا:-

”مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں اس لئے انہیں کسی دوسری قومیت میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائے گی اس کی سخت مخالفت کی جائے گی۔ ہم نے تہذیبہ کر لیا ہے کہ ہم اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے“

انہوں نے (۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو) مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں اپنی تقریر کے دوران میں کہا:-

”ہندو اور مسلمان خواہ ایک گاؤں یا ایک شہر ہی میں کیوں نہ رہتے ہوں وہ کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ وہ ہمیشہ الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں۔“

انہوں نے لیگ کے کراچی سیشن میں ان لگاتار کو زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا اور صراحت سے بتایا کہ جب ہم کہتے ہیں کہ مسلمان اپنا مخصوص فلسفہ و حیات رکھتے ہیں اور ایک جداگانہ قوم ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے۔ انہوں نے پہلے یہ سوال کیا کہ

وہ کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایک رشتہ میں پرو رکھا ہے۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملی عمارت کی بنیاد ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے ان کی کشتی بندھ رہی ہے۔

اور اس کے بعد خود ہی اس کا جواب ان الفاظ میں دیا:-

ان سوالوں کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ محکم رشتہ، یہ سنگین چٹان، یہ آہنی لنگر خدا کی وہ کائناتِ عظیم (قرآن) ہے جس نے تمام مسلمانوں کو جسدِ واحد بنا رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں وحدت زیادہ ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ ہمارا خدا ایک، خدا کی کتاب ایک، اس کا رسول ایک، اس لئے ہماری ملت بھی ایک ہے۔

یہ کہہ کر قائدِ اعظم نے گویا بھڑوں کے چھتے میں پھتر مار دیا۔ جہاں تا گاندھی پھنکار تے ہوئے اٹھے اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں فرمایا:-

”میری روح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریہ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مراد ہے کیونکہ میرا

قلبی عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔

(ہندوستان ٹائمز - ۱۲/۲/۱۷)

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو لکھا کہ

”میں ایک تنگ نظر ہندو مت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک

ہے اور ایک بہت بڑی قوم ہے، جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں ایک دوسری میں جذب

ہونی شروع ہو گئی ہیں لیکن مسلم لیگ نے مسالوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے

میں جذب نہیں ہو سکتیں۔“ (ہندوستان ٹائمز ۱۵/۲/۱۵)

لیکن قائد اعظمؒ پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا یہ

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے

جیسے حق نے کیا ہونیستناں کے واسطے پیدا

انہوں نے یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو مسٹر گاندھی کے نام وہ معرکہ آرا خط

لکھا جو تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خط کافی مفصل ہے اور

اس قابل ہے کہ اس کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔ میں اس کا مختصر سا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے اس میں

(مسٹر گاندھی کو) لکھا کہ

مسٹر گاندھی کے نام

”آپ آج اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے لیکن کل تک جب آپ سے پوچھا جاتا تھا

کہ زندگی میں آپ کا نصب العین کیا ہے؟ وہ کو نسا جذبہ محرکہ ہے جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لئے

آمادہ کرتا ہے؟ کیا وہ سیاست ہے؟ معاشرت ہے؟ یا مذہب ہے؟ تو آپ کا جواب یہ ہوتا تھا کہ وہ مذہب

اور خالص مذہب ہے۔ کل تک تو آپ یہ کہتے تھے اور آج آپ مجھ سے یہ فرما رہے ہیں کہ مذہب کو سیاست

میں کیوں گھسیٹ لائے ہو۔ سن لیجئے میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو، مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی

بنیاد عطا کرتا ہے۔ اگر مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور و شغب کے سوا

اور کبارہ جاتا ہے۔“

اس پر چاروں طرف سے مخالفت کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر مہولابھائی دتتا نے

نے کہا کہ

”نہیں۔ اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جاسکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیرِ مذہب: خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی بھی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عہدِ حاضر میں بہترین نظام حکومت کی بنا اس نظریہ پر قائم ہو سکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں۔“

(ہندوستان ٹائمز، ۵/۹/۵۹ء)

اور تمام ہندو پریس میں چیخ و پکار شروع ہو گئی کہ مسٹر جناح پاکستان کا نیا (STUNT) لے کر آگئے ہیں۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے فرمایا کہ

”پاکستان کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ تو صدیوں سے موجود ہے۔ شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستانوں کا حقیقی ملک ہے جہاں آج بھی (۷۰) فیصدی سے زیادہ ان کی آبادی ہے۔ ان علاقوں میں ایسی آزاد اسلامی حکومت ہونی چاہیے جس میں مسلمان اپنے مذہب، اپنے کلچر اور اپنے قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔“

یہ تقریر انہوں نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں احمد آباد کے ایک جلسہ عام میں کی تھی۔

آزاد اسلامی حکومت

جلسہ میں اقلیت کے صوبوں کے بہت سے مسلمان بھی موجود تھے۔ (خود

قائدِ اعظمؒ بھی اقلیت کے صوبہ سے متعلق تھے) آپ نے ان مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا:-

”ہم اقلیت کے صوبوں والوں پر جو گزرتی ہے گزر جانے دو۔ لیکن آؤ ہم اپنے ان بھائیوں کو تو آزاد کرا دیں جو اکثریت میں ہیں تاکہ وہ اسلامی قوانین کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کر سکیں۔“

مداخِ رہے کہ تقریر میں ان اقتباسات کو ربطِ مضمون کے لئے اسی تسلسل سے پیش کیا گیا تھا نہ کہ ان بیانات کی تاریخی ترتیب کی ٹو سے۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ اس زمانے میں کانگریسیوں کے خیالات کیا تھے اور قائدِ اعظمؒ ان کو کیا جواب دیتے تھے۔

قائدِ عظمیٰ نے مسلم لیگ کے نصب العین اور پاکستان کے مفہوم کو اس شد و مد سے پیش کیا اور اس اصرار و تکرار سے دہرایا تھا کہ کسی کو اس کے متعلق کوئی مغالطہ نہیں رہا تھا۔ مثلاً ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے کہ یہ تجویز زبیر غفری کی کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومتیں قائم کرے۔ اس پر مسٹر ستیہ مورتی نے کہا تھا کہ ”کانگریس اس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت کس طرح بنا سکتی ہے جس کا نصب العین اسلامی حکومت کا احیاء ہو۔“ (ہندوستان ٹائمز - ۱۱/۶)

۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ ہندوستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبہٴ صدارت میں کہا:-

”تمہیں کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ تمہیں معلوم تو سن لیجئے۔ نظریہٴ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو۔ اس کے برعکس تم جانتے ہو کہ اکھنڈ ہندوستان کے سامنے کیا مقصد ہے۔ اس کا مقصد وہ عظیم الشان کلچر ہے جسے ہندی کلچر کہا جاتا ہے۔ وہ کلچر جو زمانہٴ قبل التاریخ میں پیدا ہوا اور چھ ہزار سال کی مدتِ مدید میں بڑھتا، مچھلتا، پھلتا، زمانہٴ کی سطح کو یوں روندتا ہوا آگے بڑھتا گیا جس طرح مادرِ گنگا گھوٹان کے وقت اُسڈی چلی جا رہی ہو۔“ (ٹریبیون ۲۴/۱۱)

خطبہ کے آخر میں مسٹر منشی نے مسلمان قومیت پرستوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے مسلم عوام تک پہنچ کر انہیں اس نظریہٴ افتراق (پاکستان) کے خطرات سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟ جلسہ میں جمیعت العلماء کے ایک رکن تشریف فرما تھے۔ انہوں نے اُمیر کر کہا کہ ہم نظریہٴ پاکستان کی مخالفت کریں گے کیونکہ یہ نظریہٴ اسلام کے خلاف ہے۔ (بحوالہ ہندوستان ٹائمز)

پاکستان کے مخالف

آپ کو آج اس پر یقیناً حیرت ہوتی ہوگی کہ وہ کونسا مسلمان ہو سکتا تھا جو اس نظریہٴ کو خلافِ اسلام قرار دے کہ مسلمان ایک آزاد خطہ میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں زندگی قرآنِ کریم کے اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ لیکن اس نظریہٴ کی مخالفت ہوتی تھی اور سخت مخالفت ہوتی تھی۔ یہ مخالفت کرنے والے کون تھے؟ جمیعت العلماء ہند، جس کے سرغنہ مولانا ابوالکلام آزاد مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کھایت اللہ، مولانا احمد سعید وغیرہم ”علمائے کرام“ تھے۔ بہار میں اس

کے مخالف انصار، پنجاب میں مجلس احرار اور جماعت اسلامی سرحد میں سرخپوش، یہ سب اس مطالبہ کے خلاف تھے کہ مسلمان اپنی آزاد حکومت قائم کریں جس میں طرزِ زندگی اسلامی قالب میں ڈھل جائے۔ یا للہجب! میں نے پہلے کہا ہے کہ ہندو اچھی طرح سے جانتا تھا کہ فطرتِ پاکستان سے مفہوم کیا ہے اور جداگانہ قومیت کی بنیاد کس اصول پر ہے۔ جب قائدِ اعظم نے (۱۹۳۹ء میں) اپنا پیغامِ عید نشر کیا جس میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے تصور کی وضاحت کی تو مہاتما گاندھی کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر مہادیو دیسائی نے اخبار ہری جن میں ایک مقالہ لکھا جس میں اس نے کہا کہ

”ایک جداگانہ قومیت کا تخیل ہی اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے“

(ہری جن - ۱۱/۲۵)

قائدِ اعظم نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا تصور دے کر اس حقیقت کا اعلان کیا کہ اس میں شک کیا ہے کہ اسلام کا مقابلہ کوئی دوسرا مذہب نہیں کر سکتا۔ لیکن اُدھر سے مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ یہ غلط ہے۔

عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن نے

نوعِ انسان کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا یہ اصول پیش کیا ہے کہ

تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن پروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائیوں کو از سر نو اختیار کر لیں تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔

(ترجمان القرآن، جلد اول - تفسیر سورہ فاتحہ)

اس طرح انہوں نے ”مہاتما گاندھی“ کے اس فلسفہ کی ”قرآن“ سند بہم پہنچادی کہ قرآن اور گیتا کا خدا ایک ہے۔ اس لئے اسلام کو ہندو پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ یہ انہی مہاتما جی کا فلسفہ تھا جن کے جسم کاڑواں رُواں ”ہندو“ تھا۔ لیکن جنابِ آزاد نے جن کے متعلق اپنے رام گڈھ کے کانگریس کے خطبہٴ صدارت میں فرمایا تھا کہ ”وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی روحِ عظیم کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔“

اللہ کبروہ شخص جو اپنے آپ کو فخر سے بت پرست کہتا ہے اسے روحِ عظیم کا حامل بتایا جاتا ہے! بہر حال یہ تھا ہندو کے یاس جناح کے مطالبہٴ اسلامی حکومت کا توڑ۔ انہوں نے مولانا آزاد کی اس تفسیر کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا کہ اس کی عام اشاعت کی۔ دوسری طرف ”واروہا کی تعلیمی اسکیم“ کے ذریعے (جسے پھر بدقسمتی سے

ایک مسلمان — ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی طرف منسوب کر کے شائع کیا گیا تھا) اس نظریہ کو بچوں کے نصاب میں داخل کرانے کی کوشش کی گئی۔

یہ کچھ براہِ درانِ عزیز! مذہب کے علمبرداروں کی طرف سے جہوں اور قبوں، علماموں اور دستاروں سے مرتع ہو کر کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف ایک ہیٹ اور سوٹ پوش ”مسٹر“ تھا — جس کے متعلق جماعتِ اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بڑے طنز اور تحقیر سے کہتے رہتے تھے کہ ان کی ذہنیت مغربی تعلیم و تربیت کی تخلیق ہے اور

”ان کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیات کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی۔“

(سیاسی کش مکش، مطبوعہ ترجمان القرآن، جلد ۱، ص ۶۶، عدد ۷)

وہ میر قافلہ، کا یہاں ملت کو برابر قرآن کی طرف دعوت دیتے چلا جاتا تھا۔ اس نے ۱۹۴۵ء میں اپنے عید کے پیام میں قوم سے کہا کہ

دعوت الی القرآن

”اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے احکام صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں رہیں گے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ بحرِ اطلالِ شک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو مضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے، جس کا تعلق صرف الہیات سے نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا مضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسانی کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور وہ قوانین منشاء خداوندی کے مظہر ہیں۔“

اس حقیقت سے سوائے جہلہ کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا مضابطہ حیات ہے۔ یہ مضابطہ حیات، مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول، فوجداری کے قوانین کو اپنے اندر لئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا سوال ہو یا انفرادی حقوق کا، اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا، اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا، ان تمام معاملات کے لئے اس مضابطہ میں قوانین موجود ہیں اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

اس پر یقیناً ہر شخص کو تعجب ہوگا کہ جس شخص کے خیالات میں ”خورد بین“ لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہ دیکھی جاسکتی تھی؟ اس نے دین کے ان غوامض کو کہاں سے حاصل کر لیا۔

سَرِ خدا کہ زاہد و عابد بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ کشاں از کجا شنید!

اس کا جواب اقبالؒ کے ان الفاظ کے سوا کیا دیا جاسکتا ہے کہ

خرد نے اس کو عطا کی نظر حکیمانہ!

سکھائی عشق نے اس کو حدیثِ زندانہ

اس نے اپنی خدا واد بصیرت سے، خالی الذہن ہو کر، خدا کی کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور اس کتابِ عظیم نے اپنے یہ حقائق اس پر واضح گاف کر دیئے تھے۔

برادرانِ عرب! وقت تیزی سے دوڑ رہا ہے اور یہ داستان ابھی طویل ہے لیکن میں اسے ایک اقتباس پر ختم

کر دینا چاہتا ہوں۔ اگست ۱۹۴۱ء میں قائدِ عظیمؒ حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں چند جوانوں نے آپ

سے انٹرویو لیا۔ اور کچھ سوالات پوچھے۔ یہ سوال و جواب اور نیٹ پریس کی دساتھ سے باہر آئے۔ آپ انہیں

سنیئے اور پھر غور کیجئے کہ جس اختصار اور جامعیت سے اسلامی حکومت کے خصائص اور لوازم کو اس ”سہر و فرزانہ“

نے بیان کیا ہے اس پر کسی اضافہ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟۔

اسلامی حکومت کے خصائص | غور سے سنیئے۔

سوال: مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب: جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان

اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے

لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقبض مفہوم یا تصور نہیں

میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملائکہؒ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور

قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی

زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی و سیاسی پہلو یا معاشی،

غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی

طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسائل کا دراصل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سارے اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال۔ ترکی حکومت نو سیکولر اسٹیٹ ہے۔ کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

اس سوال کا پہلا حصہ تو ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے۔ لیکن دوسرے حصہ میں جو کچھ قائدِ اعظم نے کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر بار بار غور کیا جائے اس لئے کہ یہ جواب ان تمام پیچیدگیوں کو صاف کر دیتا ہے جو اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق آج کل عام طور پر ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا:-

جواب۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز تو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اہم پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

برادرانِ عرب! ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ

(۱) اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے، جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

(۲) اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی اور شخص کی یا ادارہ کی۔

(۳) قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے

ہیں۔

(۲) اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

فرمائیے! کیا اسلامی حکومت کے اصول و مہمانی کے متعلق اس سے زیادہ صاف، واضح اور جامع بات کچھ اور بھی کہی جا سکتی ہے؟

یہ تھی برادران عزیز! وہ اسلامک ایڈیٹوریالوجی جسے قائد اعظم محمد علی جناح پیش کرتے تھے اور وہ تھے حالات جن میں انہوں نے اس ایڈیٹوریالوجی کو پیش کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ میری ان مختصر سی معروضات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ہماری جنگ آزادی سے مفہوم کیا تھا؟ وہ کون سا خطرہ تھا جس سے ملت کو بچانے کے لئے قوم کا یہ مشفق و غم خوار، دوبارہ میدان سیاست میں آیا تھا۔ ہندوؤں کے مشنوم عرائم کیا تھے اور ان کے ہمنوا مسلمان افراد اور جماعتیں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کیا کرنا چاہتی تھیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا ہوگا کہ پاکستان کی سر زمین حاصل کرنے سے حقیقی مقصود کیا تھا؟

اس کے بعد یہ ہماری انتہائی بد قسمتی تھی کہ اس خطرہ زمین کے چل ہونے کے ساتھ ہی یہ کارڈ اپی سالار ہم میں باقی نہ رہا۔ اور اس کے بعد

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ
فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹۰)

اس کے بعد ایک طرف ایسے ناخلف پیدا ہو گئے جنہوں نے زندگی کے بلند مقاصد کو فراموش کر دیا، اعلیٰ اقدار کو ضائع کر دیا، اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے اہل قانون مکانات کے مطابق تباہیاں ان کے سامنے آ کھڑی ہو گئیں۔ دوسری طرف وہی عناصر جو آخری وقت تک پاکستان کی مخالفت میں ایٹری چوٹی کا نورنگار رہے تھے، نہایت ڈھٹائی سے پاکستان آگئے اور بڑے بڑے مقدس اور معصوم نقابوں میں اس آتش انتقام کے فرو کرنے میں مصروف ہو گئے جو قائد اعظم کے ہاتھوں شکست عظیم سے ان کے دلوں میں بھڑک اٹھی تھی۔ ان سب حالات نے مل کر ہمیں اس معتم تک پہنچا دیا جس سے ہر شخص باخیر ہے۔

لیکن اس سے برادران عزیز! مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی ہر چیز بنی اور بگڑتی — بگڑتی اور

بنتی ہے۔

آنی دفنائی تمام معجزہ ہائے ہنر کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
 ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
 جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام!
 یہی وہ مردِ خدا ہے جس کی پائمنانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ یاد کہ جس سے ایک طرف ہر صاحب
 نظر کی کیفیت ہے کہ

موجہ دگل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال

اور دوسری طرف ہر قلبِ حساس کا یہ عالم کہ

فرشتے پونچھ لیتے ہیں مرے رخسار سے آنسو!

الہی! آج کس کی یاد میں شبنم فشاں ہوں میں

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ اَتْبَعَ الْهَدٰی۔

(۱۹۵۹ء)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قائدِ اعظم کا پاکستان

(یومِ قائدِ اعظم کی تقریب پر دسمبر ۱۹۶۲ء میں تقریریں)

صدرِ محترم و برادرانِ عزیز! سلام و رحمت!

کیا اس قسم کی بات آپ کے لئے وجہِ تعجب نہ ہوگی کہ ایک شخص کسی شے کی تلاش میں برسوں تک مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کے حصول کے لئے اس نے دن رات ایک کر دیئے۔ دنیا بھر کی مخالفت مول کی۔ وقت، دولت، توانائی صرف کی۔ بالآخر خدا خدا کر کے وہ گوہرِ مقصود ہاتھ آیا تو وہ سوچنے بیٹھ گیا کہ میں نے اس چیز کو مانگا کیوں تھا؟ میں نے اسے حاصل کس مقصد کے لئے کیا ہے؟ اسے کس مصرف میں لایا جائے گا؟

یقیناً یہ کہانی آپ کے لئے وجہِ تعجب ہوگی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ وجہِ تعجب اور باعثِ حیرت یہ حقیقت ہوگی کہ یہ کہانی کسی اور کی نہیں خود ہماری اپنی کہانی ہے۔ ملتِ پاکستانیہ کی کہانی ہے۔ ہم نے دنیا کے سامنے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مطالبہ کی سخت مخالفت ہوئی۔ ہم نے ان مخالفتوں کا سرٹوڑ مقابلہ کیا۔ اس لئے کہ یہ ہماری زندگی کا نصب العین، ہماری تمناؤں کا مرکز اور ہماری آرزوؤں کا محور تھا۔ اس کے ساتھ ہماری موت اور زندگی کا سوال وابستہ تھا۔ ہم نے اس کے حصول کے لئے دس برس تک مسلسل جدوجہد کی۔ بالآخر ۱۹۴۷ء میں ہمارا مقصد

حاصل اس تقریر میں اور جو اس سے پہلے آچکی ہے اور جو اس کے بعد آنے والی ہے، بعض اقتباسات مشترک ملیں گے۔ ان میں سے بعض کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور بعض باقی رہنے دیئے گئے ہیں تاکہ مضمون کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔

حاصل ہو گیا۔ پاکستان وجود میں آ گیا۔

پاکستان کیوں مانگا تھا؟

لیکن جب یہ وجود میں آ گیا تو ہم نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا؟ اس مطالبہ سے ہمارا مقصد کیا تھا؟ پاکستان سے بالآخر مفہوم کیا ہے؟ اسے کیا کیا جائے؟ اسے کیسا بنایا جائے وغیرہ وغیرہ۔ پاکستان کو وجود میں آئے پندرہ برس ہو گئے لیکن ہم ملی اعتبار سے ابھی تک متعین نہیں کر سکے کہ ہم اسے اصل کس مقصد کے لئے کیا تھا؟ ہمارے اس ذہنی انتشار کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ ہندوؤں کی تنگ نظری نے پاکستان بنوایا۔ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ کشادہ دلی سے پیش آتے؟ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تو انہیں ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک بھی نہ آتا۔ گویا مطالبہ پاکستان کی بنیاد کسی مثبت جذبہ پر نہیں تھی۔ محض ہندوؤں کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر ہم نے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آج بھی ہندو یہ وعدہ کر لے

بھانت بھانت کی بولیاں

چھوڑ کر پھر اس کے ساتھ جا ملیں گے۔ (یا للعجب)

دوسری طرف سے آواز آتی ہے کہ صاحب! یہ تو انگریز کی چالی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو چھوڑ کر جائے تو ایسی شکل میں کہ ہندو اور مسلمان ہمیشہ آپس میں لڑتے رہیں۔ اس لئے اس نے پاکستان کا تصور پیدا کیا۔ اور مسٹر جناح کو آگے بڑھایا۔ گویا مسٹر جناح انگریز کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے آکر دکھائے تھے۔ یہ اس شخص کی نسبت کہا جاتا ہے جس کے متعلق اس کے بدترین دشمنوں تک کو اعتراف تھا کہ — وہ کسی قیمت پر، کسی کے ہاتھ پک نہیں سکتا تھا۔

غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں — کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ — آئیے اس مٹھوڑے سے دقت کو غنیمت جانیں اور ہم خود قائدِ اعظمؒ سے پوچھیں کہ آپ نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ آپ انک مملکت کیوں چاہتے تھے؟ اس مملکت کا تصور آپ کے ذہن میں کیا تھا؟ اسے آپ نے کس مقصد کے لئے حاصل کیا تھا؟ اسے آپ کیا دیکھنا چاہتے تھے؟ کیا بنانا چاہتے تھے؟ ان سوالات کے جواب میں جو کچھ قائدِ اعظمؒ کہیں، اس سے بڑی شہادت اس باب میں کوئی اور ہو نہیں سکتی۔



دیر تک رہا۔ اس میں سوال زیرِ نظر یہ تھا کہ پاکستان کے تصور سے

مطلب کیا ہے؟ اس مطالبہ کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی وجہ جواز کیا ہے؟

یہ یکایک اُفتِ ذہنی سے کیسے اُبھر آیا۔ یہ نظریہ نکل کہاں سے پڑا..... یہ تھے وہ سوالات جن کا جواب دینے کے لئے قائدِ اعظم اُٹھے تھے۔

قائدِ اعظم کا انداز یہ تھا کہ وہ بات بڑی مختصر کرتے تھے لیکن وہ ہوتی تھی بڑی جامع، صاف، سیدھی، دو لوگ نہ

اس میں نہ کوئی پیچ و خم ہوتا تھا نہ ابہام نہ الجھاؤ۔ انہوں نے مذکورہ بالا سوالات کا جواب ایک فقرہ میں دے دیا۔

اور وہ فقرہ ایسا ہے کہ جوں جوں اس پر غور کیجئے نگہ بصیرت وجد میں آ جاتی ہے۔ اس سے نہ صرف مطالبہ پاکستان

کی بنیاد اور وجہ جواز ہی سامنے آ جاتی ہے بلکہ خود اسلام کا ایک بنیادی اصول بھی اس طرح اجاگر ہوتا ہے کہ

اس سے بہت سے سیاسی عقدے حل ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ

”پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات

ہے، جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی“

غور فرمایا آپ نے کہ اس سیدھے سادے اور مختصر سے جملے میں کتنی بڑی حقیقت کو بے نقاب

کر دیا گیا ہے۔ آج اگر ہندوستان میں کوئی ہندو عیسائی ہو جائے تو اس کے صرف مذہبی

نظریہ قومیت

عقیدہ میں تبدیلی آتی ہے۔ اس کی سیاسی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ جس طرح پہلے ہندوستانی قوم کا

فرد تھا اسی طرح اس تبدیلی مذہب کے بعد بھی اسی قوم کا فرد رہے گا۔ یا مثلاً انگلستان میں یہودیت کے پیرو بھی

بستے ہیں اور عیسائی بھی۔ اگر کوئی یہودی اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائی ہو جاتا ہے تو اس سے اس کی قومیت

(NATIONALITY) پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ بدستور انگلستانی رہتا ہے لیکن اسلام کی کیفیت

اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں جہاں کوئی شخص اسلام لاتا ہے وہ ایک جداگانہ قوم (امتِ مسلمہ) کا فرد بن جاتا

ہے۔ اس سے صرف اس کا مذہب ہی نہیں بدلتا، اس کی قومیت بھی بدل جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلام میں، قومیت

کا مدار، نسل، رنگ، زبان یا وطن کا اشتراک نہیں، اس کا مدار دین کا اشتراک ہے۔ جو لوگ دین میں مشترک (مسلمان)

ہیں وہ دنیا کے کسی خطے میں بستے ہوں، کسی نسل سے متعلق ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں، وہ سب ایک قوم کے افراد

ہیں، اس کے برعکس اگر وہ ایک ہی ملک میں بستے ہوں اور ایک ہی نسل کیا، بلکہ ایک ہی خاندان سے بھی متعلق

کیوں نہ ہوں، اگر وہ دین میں مشترک نہیں (دونوں مسلمان نہیں) تو وہ دو الگ الگ قوموں کے افراد ہیں۔ فارس کا

سلمان، روم کا صہیبؓ، حبشہ کا بلالؓ اور عرب کا عمرؓ، نسل، رنگ، زبان، وطن کے اختلاف کے باوجود محض دین کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ اور حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب — دو الگ الگ قومیتیں رکھتے تھے — یہی وہ اسلام کا اصل الاصول تھا جسے علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ —

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ مآبِ شعی
ان کی جمعیت کا ہے ملک نسب پر انحصار قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

دامن دیں ہاتھ سے چھوڑنا تو جمعیت کہاں

اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

اور اسی حقیقت کو قائدِ اعظمؒ نے اس چھوٹے سے فقرے میں بیان کر دیا تھا کہ

پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔

وہ غیر مسلم جب مسلمان ہوا تو پہلی قوم کا فرد نہیں رہا، وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔ اور جب ایک نئی قوم وجود میں آگئی تو اس کے لئے ایک الگ مملکت کی ضرورت بھی مسلم ہو گئی۔ اس طرح پاکستان کی پہلی اینٹ اس دن رکھی گئی جب پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ اس کی وجہ نہ ہند کی تنگ نظری تھی نہ انگریز کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔ یہ مسلمانوں کے دین کا تقاضا تھا۔ چونکہ دنیا کے لئے یہ نظریہ بالکل نیا اور قومیت کا یہ تصور، مروجہ راستوں سے ہٹا ہوا تھا اگرچہ اسلام نے اسے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا — چودہ سو سال پہلے کیوں؟ یہ تو اس دن پیش کر دیا گیا تھا جب سب سے پہلے نبی کی وساطت سے خدا کی وحی انسانوں تک آئی تھی، اس لئے اس کی ضرورت تھی کہ اسے بار بار دہرایا جائے اور مختلف گوشوں سے اس کی وضاحت کی جائے۔ چنانچہ قائدِ اعظمؒ اسے مسلسل دس برس تک دہراتے رہے۔ انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

مسلمان الگ قوم ہیں | ”میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دباندار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان

بجائے خویش، ہندوؤں سے ایک الگ مستقل قوم ہیں“

یہ فرق اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا تھا جب ”مذہب اور دین“ کا فرق سمجھ میں آجاتا۔ ”مذہب“ (جسے عام طور پر RELIGION کہہ کر پکایا جاتا ہے) ”خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسان کی تمدنی، عمرانی، سیاسی، معاشی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس پرائیویٹ تعلق کو ایک عیسائی اپنے گرجے میں، ایک پارسی اپنے آتش کدہ میں، ایک ہندو اپنے مندر میں (اور انہی لوگوں کے خیال کے مطابق) ایک مسلمان اپنی مسجد میں — بلکہ یوں کہئے کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کے کسی کونے میں یا پہاڑ کے کسی غار میں، اپنے اپنے طور پر قائم کر سکتا ہے۔ جب وہ ایسا کر لیتا ہے تو مذہب کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنی عملی زندگی میں اپنے اپنے ہاں کی سیاست کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ ہے مذہب کا تصور۔ اس کے برعکس، دین کا تصور یہ ہے کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں۔ یہ زندگی کا ایک ضابطہ اور نظام حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ

مذہب اور دین کا فرق کرتے ہوئے قائد اعظم نے ۲۷ نومبر ۱۹۲۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

”ہم دونوں قوموں میں صرف ”مذہب“ کا فرق نہیں، ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔“

اس سے ظاہر ہے کہ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے جسے آج کی اصطلاح میں تمدنی نظام کہنا چاہیے۔ یہ دین ایک الگ آزاد مملکت ہی برائے کار آسکتا ہے جہاں اس کے احکام اور اصول، قانون کی شکل میں نافذ کئے جاسکیں۔

(جہاں تمام گاندھی کی دھڑلے سے لگا ہوا) نے اس ”خطہ“ کو بھانپ لیا اور سمجھ لیا کہ جب تک مسلمانوں کے دل

سے مذہب اور دین کے اس تصور کو نکال نہ دیا جائے اور انہیں یہ باور

نہ کر دیا جائے کہ اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے اس

اس تصور کی مخالفت

وقت تک پاکستان کے مقدمہ کو جیتا نہیں جاسکتا۔ اس کے لئے انہوں نے سب سے بہتر طریق کار یہ سوچا کہ،

ہندوستانی بچوں (ہندوؤں اور مسلمانوں، سب کے بچوں) کی تعلیم میں یہ بات داخل کر دی جائے کہ سب مذاہب

سچے ہیں۔ رام بھی وہی ہے رحیم بھی وہی۔ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فضیلت نہیں۔ اسلام ہندو دھرم،

عیسائیت وغیرہ سب یکساں ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی مشہور تعلیمی اسکیم (وڈیا مندرہ یا وار دھاکا اسکیم) جاری کی اور اسے عملاً مدرسوں میں نافذ کرنا چاہا۔

ہندو یہ کچھ کہ رہا تھا۔۔۔ اس نے یہ کچھ کرنا ہی تھا۔ پاکستان کے مطالبہ سے اس کا وہ خواب، پریشان ہوا جا رہا تھا جس کی رُو سے وہ ہندوستان کی مسلم آبادی پر اپنی حکومت مسلط کرنا چاہتا تھا لیکن آسمان کی آنکھ اس عبرت انگیز تماشاً کو حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ اس کی اس مخالفت میں خود مسلمانوں کے اکابرین۔۔۔ بالخصوص دین کے علمبردار حضرات۔۔۔ ان سے بھی آگے آگے تھے۔ چنانچہ مذہب اور دین کے اس فرق کو بٹانے اور اسلام کو باقی مذاہب جیسا ایک مذہب ثابت کرنے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر القرآن (ترجمان القرآن) لکھی جس کی جلد اول (تفسیر سورہ فاتحہ) میں بار بار اس دعوے کو دہرایا گیا کہ

”عامگیر ستائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اسلام کا کہنا ہے کہ اگر مذہب کے پیرو

اپنے اپنے مذہب پر کار بند ہو جائیں تو میرا منشا پورا ہو جاتا ہے۔“

کانگریس نے ان کی اس تفسیر کا ترجمہ مختلف زبانوں میں، لاکھوں کی تعداد میں شائع کرایا۔

ادھر یہ کچھ سو رہا تھا اور ادھر تائد اعظم اپنی اس پکار کو برابر دہرائے جا رہے تھے کہ اسلام ایک مذہب نہیں، دین ہے۔ چنانچہ جب مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (لاہور) میں پاکستان کا ریزولیشن پیش ہوا تو انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:-

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے گریز کیوں کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیے ہندو اور مسلمان مذہب کے ہر معاملے میں دو جدا گانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔

مولانا آزاد (مرحوم) کی اس تفسیر کی تردید میں، میں نے اسی زمانے میں ایک بھرپور مقالہ لکھا تھا جسے ملک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مقالہ اب میرے مجموعہ مضامین رفردوس گم گشتہ میں شامل ہو چکا ہے۔

دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یک جا کر دینا باہمی مناقشت کو برہائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

ان تصریحات کے ساتھ مطالبہ پاکستان کا ریزولوشن پاس کیا گیا جس سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے مطالبہ کو سیاسی سند حاصل ہو گئی۔



اسلامی مملکت کے قیام کے لئے

اس کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ جب یہ خطرہ زہر میں حاصل ہو جائے گا تو اس میں مملکت کس انداز کی ہوگی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان کا تصور، علامہ اقبالؒ نے اپنے الہ آباد (مسلم لیگ) کے خطبہ ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا اس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ”مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ، ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہوگا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہوگی اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپے کو مٹا سکے جو عرب (ملوکیت) نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔“

اسلامِ خالص

برادرانِ گرامی! قدر! وقت نہیں ورہ میں وضاحت سے بتانا کہ علامہ اقبالؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں، اسلام کو موقع میسر آ جائے گا کہ یہ اس ٹھپے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے تو اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے، جس کی طرف وہ چند لفظوں میں اشارہ کر گئے ہیں۔ میں اس وقت صرف اتنا کہہ کر اپنے موضوع کی طرف آ جانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں جو اسلام اس وقت بالعموم مروج ہے وہ یہ ہیئتِ مجموعی، ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔ علامہ اقبالؒ یہ چاہتے تھے کہ اگر پاکستان کا خطرہ زہر میں حاصل ہو جائے تو اس میں، اس حقیقی اسلام کو پھر سے علامہ متشکل کیا جائے جو عبدِ محمد رسول اللہ والذین معہ میں وجہ ”تائیدی“ عالم تھا۔ اس طرح اسلام سے وہ ٹھپے مٹ سکے گا جو اس پر عرب حکومت نے صدیوں سے لگا رکھا ہے۔ یعنی پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگا اور اس میں اسلام اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں رائج ہوگا۔

علامہ اقبالؒ کے یہی وہ بلند تصورات تھے جن کی بنا پر قائمِ عظمؒ نے ۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو یومِ اقبالؒ کی تقریب پر

انہیں ان گراں قدر الفاظ میں یاد فرمایا تھا :-

علامہ اقبالؒ اگرچہ ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے لیکن وہ غلی سیاست دان بھی کم پائے کے نہ تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمانِ کامل اور یقینِ محکم کی بنیاد پر، ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا کہ ہندوستان کے شمالی مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو ہندوستان سے الگ کر کے ایک اسلامی مملکت تشکیل کی جاسکتی ہے۔

یعنی پاکستان سے مفصود وہ خطہ زمین تھا جس میں اسلامی مملکت قائم کی جائے چنانچہ انہوں نے مارچ ۱۹۴۷ء میں، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

”پاکستان کے تصور کو جو مسلمانوں کے لئے اب ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اس سے یہ آواز اٹھائے عالم میں گونجنے لگی کہ دنیا میں ایک ایسی مسلم مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو از سر نو زندہ کرے گی۔“

اس سے ظاہر ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں یہ تصور موجود تھا کہ پاکستان، مسلمانوں کی دوسری مملکتوں جیسی مملکت نہیں ہوگی۔ یہ وہ مملکت ہوگی جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو از سر نو زندہ کرے گی۔

انہوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو (فرنٹیئر مسلم لیگ (پشاور) کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا :-

اسلامی قوانین

”مسلمان، پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطہ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔“

جون ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں فرمایا :-

”پاکستان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں، اس سے حقیقی مراد مسلم آئین و اصول ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی، ہمیں اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی قصورات اور اصلاحات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔“

میں نے ابھی کہا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کا یہ انداز تھا کہ وہ کسی بات کو مبہم اور غیر واضح نہیں رہنے دیتے تھے۔ پاکستان

کے متعلق ابھی تک۔ ان کے یہ خیالات ہمارے سامنے آسکے ہیں کہ اس سے مقصد اسلامی مملکت تھا جس میں ہم اپنے تصورات کے مطابق اسلامی قوانین کے تابع زندگی بسر کریں۔ "اسلامی مملکت" اسلامی نظام" حتیٰ کہ "اسلامی قوانین" سے کیا مراد ہے؟ مختلف سمتوں سے اس کا جواب مختلف ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قائدِ عظیم نے ان اصطلاحات کو ایسے ہی استعمال کر دیا تھا یا اپنے مفہوم کو متعین طور پر بھی بیان کیا تھا۔!

انہوں نے حسبِ عادت متعین طور پر بنا دیا تھا کہ "اسلامی نظام" سے ان کا مقصد کیا ہے؟ اگست ۱۹۴۱ء میں وہ حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے، ان سے اس باب میں کچھ سوالات پوچھے۔ ان سوالات کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظام سے ان کا متعین مفہوم کیا تھا؟

یہ اتنباس سابقہ تقریر میں آچکا ہے، وہاں سے دیکھ لیا جائے۔ (ص ۵۶ پر)

آپ اس جواب کے ایک ایک فقرہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس حقیقت کو کس قدر غیر مبہم، مختصر لیکن جامع لفظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ کوئی مملکت اسلامی کس طرح بنتی ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ اس کے سوا کسی اور کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ کسی اور کو اس کا سختی سے حاصل نہیں کہ کسی سے اپنا فیصلہ اور حکم منواتے۔

لیکن خدا تو ایک آن دیکھی، مطلق ذات کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہوگی؟ کیسے معلوم کیا جائے گا کہ فلاں معاملہ میں اس کا حکم اور فیصلہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ: اَتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِمْ اَوْ لِيْسَاءُ (پ) جو کچھ تمہاری طرف خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی اور سرپرست کا اتباع مت کرو۔ بالفاظِ دیگر "اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے"۔ اسی کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ یہی چیز کفر اور ایمان کا خط امتیاز قرار پاتی ہے۔ وَمَنْ لَّحَ يَحْكَمْ بِمَا اَنْزَلَ اللَّهُ فَتَا وَلِيْكَ هُمْ اَلْكَافِرُوْنَ (پ)۔ جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔

"مسٹر جناح" پاکستان کی اسلامی مملکت کے متعلق یہ تصور پیش کر رہا تھا اور دین کے علمبردار حضرات یہ کہہ کر

مطالبہ پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے کہ

”جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں

جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے

نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔“

یعنی جس حکومت کے متعلق یہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ اس میں آزادی اور پابندی کے حدود، خدا کے متعین کردہ ہوں گے،

اس کے خلاف لوگوں کو یہ کہہ کر مٹھکا یا جارہا تھا کہ وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔



ہم نے برادرانِ عزیز! دیکھ لیا ہے کہ تائیدِ عظیم کے نزدیک مملکتِ پاکستان کا بنیادی دستور اور ضابطہ قرآنِ کریم کو قرار پانا تھا۔ قرآنِ مجید کی عظمت اور جامعیت تائیدِ عظیم کے اُفقِ ذہن پر کس طرح چھا رہی تھی اس کا اندازہ ان کے ان بیانات سے لگایا جاسکتا ہے جن میں وقتاً فوقتاً اس حقیقت کو سامنے لاتے رہے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں قوم کے نام عید کے پیغام میں انہوں نے جو کچھ فرمایا اسے سابقہ تقریریں مکھا جا چکا ہے۔ (دیکھئے ص ۵۴)

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان، مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی الگ پارٹیاں بھی تھیں۔ ان میں نسلی اور صوبائی تقصیب بھی تھا۔ خود پاکستان نے جن دو بڑے بڑے خطوں پر مشتمل ہونا تھا (یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان) ان میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ سانی اور نسلی نقطہ نگاہ سے بھی ان دونوں خطوں کے رہنے والوں میں کوئی وجہ اشتراک نہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان تمام وجوہ

مسلمانوں میں وجہ جامعیت

اختلاف کے باوجود، وہ کون سی قدر مشترک ہے جو ان باہم دگر متضاد عناصر کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی۔ اس کا جواب تائیدِ عظیم کے الفاظ میں سنئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۳ء۔ واقعہ کراچی) میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ

”وہ کونسا مشترک ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس

پیران کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔“

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ

”وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ منکر، خدا کی کتابِ عظیم قرآنِ کریم ہے۔ مجھے یقین محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک امت“

پھر سے ہوئے مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنے کا یہ وہ طریق تھا جسے خود خدا نے تجویز کیا تھا۔ جب کہا تھا کہ.....
وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا..... (۳۱۰) ”تم سب مل کے خدا کے اس سررشتہ کو محکم طور پر تھام لو اور تفرقہ پیدا نہ کرو“ قرآن پر ایمان لانے سے، دنیا کے مختلف انسان، ایک قوم بنتے ہیں اور اس کے ساتھ وابستہ رہنے سے ان کی وحدت برقرار رہ سکتی ہے۔ اسی کو قائدِ اعظمؒ نے اہل پاکستان کے لئے وجہِ جامعیت قرار دیا تھا۔

یہ کچھ قائدِ اعظمؒ نے حصولِ پاکستان سے پہلے کہا تھا۔ بعض گوشوں سے اب یہ آواز اٹھاتی جاتی ہے کہ پاکستان سے پہلے تو بینک قائدِ اعظمؒ نے یہی کچھ کہا تھا لیکن حصولِ پاکستان کے بعد انہوں نے اپنے خیالات میں تبدیلی پیدا کر لی تھی۔

حصولِ پاکستان کے بعد

نہ صرف یہ کہ یہ دعویٰ واقعات کے خلاف ہے بلکہ جس شخص کو قائدِ اعظمؒ کی طبیعت اور کردار سے ذرا سی بھی واقفیت ہے وہ بلا توقف کہہ دے گا کہ ”ہذا ابھتان عظیمہ“ حصولِ پاکستان کے بعد انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں، خانی دینا مال (کراچی) میں حکومت کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:-

”پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابت بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق تشو و تہا پاسکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رُو بہ عمل لائے جاسکیں۔“

”اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول“ کیا ہیں، اس کی تشریح ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ اس مقام پر میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن اسلامی اصولوں کا اعلان، قائدِ اعظمؒ، تحریکِ پاکستان کے دوران کیا کرتے تھے، انہی کا اعادہ پاکستان کے حصول کے بعد بھی کرتے رہے تقسیمِ ہند کے بعد ہندوؤں نے جس قدر مسلمانوں کا کشت و خون کیا وہ

تاریخ کی نہایت عبرت انگیز نوحی داستان ہے۔ اس وقت حالات بڑے زک تھے، جن کی وجہ مسلمان بہت مضطرب و پریشان تھے۔ ان حالات میں قائدِ اعظمؒ نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی اسٹیڈیم (لاہور) میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-
 ”اگر ہم نے ان حالات میں، قرآن سے راہ نمائی لی، تو ہم ہندوؤں کی سازش کے علی الرغم کامیاب ہو کر رہیں گے۔
 وہ ایسے نامساعد حالات میں بھی، قرآن ہی سے راہ نمائی حاصل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔“



دستورِ پاکستان
 تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ دستورِ پاکستان کی تدوین کا تھا۔ ساری دنیا کی نظریں پاکستان کی طرف اٹھ رہی تھیں، یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ نوزائیدہ مملکت جو اسلام کے از سر نو احیاء کا دعویٰ لے کر وجود میں آئی ہے، اپنے لئے دستور کس انداز کا مرتب کرتی ہے۔ اس سلسلے میں قائدِ اعظمؒ نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کیا، جس میں کہا کہ

”پاکستان کانٹیننٹل ڈیمینٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار، جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔“

مختیارِ کیسی نہیں ہوگی
 آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے

ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسئلہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی مختیارِ کیسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ماتھے میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزرگِ خویش) ”خدا کی مشن“ کو پورا کریں۔“

اب آپ نے سمجھ لیا عزیزانِ من! کہ ہمارے مذہبی پیشوا تحریکِ پاکستان کے خلاف کیوں تھے؟ اور وہ کیوں ”مسٹر جناح“ کے خلاف اس قدر پروپیگنڈہ کرتے تھے؟ یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ قائدِ اعظمؒ کی عمر نے ایفانہ کیا اور انہیں اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ وہ دستورِ پاکستان مرتب کر سکتے، ورنہ یہاں چودہ پندرہ سال سے مذہب کے نام پر جو انتشار پیدا کیا جا رہا ہے، ملک اس سے بچ جاتا اور اس وقت تک ہماری کشتیِ ملت کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوتی۔ بہر حال یہ ایک الگ داستان ہے جو ہمارے آج کے

موضوع سے ہٹی ہوئی ہے۔

اب اسلام کے عدلِ عمرانی کے ان اصولوں کو دیکھئے جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اسلام کا منتہی یہ ہے کہ ایک فرد کی تمام مضر صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں اور اس کے بعد حیاتِ اُخروی میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ سب سے پہلے، افراد کو زندگی کی بنیادی ضروریات (خوراک، لباس،

اسلام کے عدلِ عمرانی

مکان وغیرہ) کی طرف سے بے فکر کر دیتا ہے، تاکہ وہ اطمینان سے بلند مقاصدِ انسانیت کے حصول کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ اس کے لئے اسلامی نظامِ مملکت، تمام افرادِ مملکت کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ ”ہم خدا کی طرف سے تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریاتِ زندگی کا ذمہ لیتے ہیں۔“ اس کا نام اسلام کا عدلِ عمرانی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں قائدِ اعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ ”سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے؛ لیگ کا مستقبل اس سوال کے حل پر موقوف ہے۔“

اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضر کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیما کریسی کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا، لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیما کریسی کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو چہرے سے

اس منترہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ یہ شروع میں تھا۔“

تشکیلِ پاکستان کے بعد جب مملکت نے اپنا (اسٹیٹ) بینک کھولا، تو جولائی ۱۹۴۸ء میں اس کے افتتاح کی تقریب، قائدِ اعظمؒ کے ہاتھوں سرانجام پائی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے جو تقریر فرمائی (اور میرا خیال ہے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں کہا کہ

”ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حال اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا

حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ اپنی متعین کرنا چاہیئے۔ اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو اسلامی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حقیقت سے عائد ہوتا ہے۔ اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو آئینہ تباہیوں سے بچالے گا اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔“

لیکن ظاہر ہے کہ جاگیر داری، زمین داری اور سرمایہ داری کی موجودگی میں، اسلام کا یہ معاشی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ملک کے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن قائدِ اعظمؒ انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ حصولِ پاکستان کے بعد ان کی پوزیشن کیا ہوگی۔ انہوں نے تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے ۱۹۴۳ء میں، آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے سیشن میں بر ملا اعلان کیا کہ

”اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلسی نظام کی رو سے جو انسان

زمین داری اور سرمایہ داری

کو ایسا بدست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کو سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ عوام کے گارو پیسے کی کمائی پر رنگ رلیاں مٹاتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر دٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“

برادرانِ عربز! یہ تھا مختصر الفاظ میں، قائدِ اعظمؒ کے تصور کی رو سے پاکستان کا نقشہ۔ یعنی

مملکتِ پاکستان کا نقشہ

(۱) ایک ایسی مملکت جس میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود قرآنِ کریم کی رو سے متعین ہوں۔

(۲) جس میں کوئی قانون ایسا نہ ہو جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو۔

(۳) جس میں مقبلاً کہہ بسی یعنی مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری کا کوئی سوال نہ ہو۔

(۴) جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

(۵) اور جس میں سرمایہ داری اور زمینداری کے غیر اسلامی نظام کو ختم کر دیا جائے۔

(۶) جس میں نہ مغرب کی بے لگام جمہوریتِ راہِ پاسکے نہ روس کی سرسام خیز اشتراکیت — جس میں

نظامِ سیاست و معیشت بہر حال حدودِ اللہ کے تابع رہے۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کے لئے انگریز، ہندو اور خود مسلمانوں کے علمائے کرام کے خلاف چومکھی لڑائی لڑی تھی۔ ہماری بد بختی یہی نہیں کہ ہم اس وقت تک، پاکستان کو ان تصورات کے مطابق متشکل نہیں کر سکے، اس سے بڑی بد بختی یہ ہے کہ خود یہ تصورات ہی رفتہ رفتہ قوم کی نظروں سے اوجھل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ابھی یہاں، دہاں، ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں علیٰ حصہ لیا، جنہیں قائدِ اعظمؒ کے ساتھ کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، جنہوں نے، ان کے ان ارشادات و

پیغامات کو اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے پڑھا۔

لیکن یہ لوگ آہستہ آہستہ اٹھتے چلے جائیں گے۔ ان کے بعد

یہ تصورات اوجھل ہو رہے ہیں

ہماری آنے والی نسلوں کو اتنا بتانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا کہ پاکستان کیوں مانگا گیا تھا۔ اور اس سے مقصود و مفہوم کیا تھا؟ کس قدر سنگین ہے ہمارا یہ جرم کہ ہم نے آج تک نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی ایسی مستند تاریخ مرتب کی ہے جس میں یہ مقاصد ابھر کر سامنے آجائیں اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ کی کوئی ایسی سوانح عمری مڑوں کہ جسے جوان کے ان تصورات کی آئینہ دار ہو۔

والسلام

(۱۹۶۲ء ۶)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پاکستان کس نے بنایا؟

۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح، ساڑھے نو بجے قائدِ عظمیٰ کے یومِ وفات پر،
بینِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام وائے ایم سی اے ہال میں تقریر

کہتے ہیں کہ جب سیمرغ (PHOENIX) کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے آخری دن قریب آگئے ہیں تو وہ اپنے گرد نکلے جمع کر لیتا ہے اور اس آشیاں میں بچھ کر دیپک راگ لالتا ہے جس سے اس کے پروں سے شعلے نکلتے ہیں۔ ان سے اس کا آشیانہ بھی جل جاتا ہے اور وہ خود بھی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس راکھ پر بارش کا چھینٹا پڑتا ہے تو اس میں سے ایک نیا سیمرغ پیدا ہو جاتا ہے۔

سیمرغ کے متعلق تو معلوم نہیں، لیکن جن قوموں میں زندگی کی کوئی رمت باقی ہوتی ہے، حوادثِ زمانہ انہیں جلا کر راکھ کا ڈھیر بھی کیوں نہ بنا دیں، ان کی خاکستر کے اندر سے دلی

قوموں کی حیاتِ نو
میوئی چنگاری ابھرتی ہے اور اس سے ایک ایسا زندہ انسان پیدا ہو جاتا

ہے جو اس قوم کو حیاتِ نو عطا کر دیتا ہے۔ اقبالؒ نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا جب کہا تھا کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے سیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ میں و آسمانِ مستحار! اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

طیہ ایک افسانوی پرندہ ہے۔ کوئی اسے سیمرغ کہتا ہے کوئی ققنس، کوئی موسیقار۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد — کہ جسے انگریز کی استعمارت نے ”غدر“ سے تعبیر کر کے تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی، مسلمان بکسر راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے تھے۔ ان کی سلطنت ہی نہیں چھنی تھی، ان کی ملی ہستی ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک قوم کی حیثیت سے باقی ہی نہیں رہے تھے۔ انگریز کی سیاست نے **۱۸۵۷ء کے بعد** *یَدِ یَحْوَۃِ اَبْنَاءِ کُھَم و یَسْتَحْیَوْنَ نِسَاءَ کُھَم* پھیل

کی بلیت کش پالیسی اختیار کر کے، ایک بار پھر فرعونِ استبداد کی یاد تازہ کرادی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہند نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام ان مسلمانوں سے لے گا جو کسی نہ کسی طرح زندہ رہ گئے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے ہر اقدام کا مورد مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ لائل محمد نزار اڈیا کے مصنف کے الفاظ میں :-

”اس وقت کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے برپا کیا تھا، خواہ اسے رام دین اور مانا دین نے ہی برپا کیوں نہ کیا ہو۔ کوئی بلا آسمانوں سے ایسی نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ تاکا ہو۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ یہ مسلمانوں نے بویا ہے۔ کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ مشہور نہ کیا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اٹھایا ہے۔“

یہی تھے اس قوم کے وہ ناکردہ گناہ جن کی پاواش میں ڈاکٹر منہٹر نے اپنی کتاب (ذمی انڈین مسلمانز) میں تجویز کر دیا تھا کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا مقام لکڑیوں اور ستھاؤں سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔

لیکن عین اسی زمانے میں خود انگریزی حکومت کے ایک دفتر کا معمولی ملازم (صدر ایجنسی کا سر رشتہ دار) جس کے بچپن اور جوانی کا زمانہ خود اس کے اپنے الفاظ میں ”کدڑی کھیلنے، کنکڑے اڑانے اور ناچ مجرے دیکھنے میں“ گزرا تھا، اس قوم کی خاک تر سے چنگاری بن کر اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے قوم کے عروقِ مردہ میں زندگی بخش حرات بن کر سرایت کر گیا۔ جب اس کے دل میں قوم کو سنبھالنے کا احساس **سربید کی نمود** *بیدار ہوا ہے تو فضا میں چاروں طرف چھائی ہوئی مایوسی کا عالم کیا تھا، اس*

کے متعلق اس نے بعد میں خود کہا تھا کہ

”میں اس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنبہ سکے گی اور اندر سرِ نو عزت پانے کے قابل ہو جائے گی۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڑھا کر دیا اور میرے بال سفید ہو گئے۔“

یہ میچائے ملت، کہ قوم کے غم نے جس کے جوانی ہی ہیں بال سفید کر دیئے تھے، سید احمد خاں تھا جو بعد میں سرسید کے نام سے منعارف ہوا۔ اس زمانے میں بھی اس کے دل میں قوم کے غم کی گہرائی اور کیریکٹر کی بلندی کی کیا کیفیت تھی، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ اس نے اس عالمگیر خلفشار کے زمانہ میں محض انسانی ہمدردی کی بنا پر بہت سی انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچائی تھی۔ حکومت نے ان کی ان خدمت کے صلے میں رؤسائے چاند پور کی ضبط شدہ جاگیر اور اس کے ساتھ ایک معقول جائیداد پیش کی۔

کیریکٹر کی بلندی

لیکن اس نے اس پیش کش کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ

”ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھائی مجھے کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی“

اس نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تقریر میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ

”میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ مالاًئن اس دنیا میں کوئی نہ ہو گا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور

میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ چنانچہ میں نے اسے قبول کرنے سے کھانا انکار کر دیا۔

یاد رہے کہ سرسید اس زمانے میں انگریز کی حکومت کا ملازم تھا اور وقت ایسا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے اس قسم کی پیش کش سے انکار، اس شخص کو باغیوں کے زمرے میں شامل کر دینے اور مچانسی کے تختے پر لٹکوا دینے کے لئے کافی تھا۔ اس کے بعد سرسید کھل کر سامنے آگیا اور ایک طرف مسلمانوں کو انگریز کے استبداد اور ہندو کی وسیسہ کاریوں سے بچانے اور دوسری طرف ان بکھرے ہوئے تنکوں کو اکٹھا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ وہ اس زمانے میں کہا کرتا تھا کہ

”میں جب رات کو آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو اس کے اس حصے کی جو نیلا نیلا، سیاہ اور ڈراؤنا

سادکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا، بلکہ ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمکتے

ہیں اور معشوقانہ انداز کی کشش سے ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔“

اور پھر وہ اپنے ساتھیوں سے سوال کیا کرتا تھا کہ

”کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو ستاروں کی طرح چمکتے ہوں اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی

نگاہ میں باعزت بنا سکتے ہیں؟“

وہ قوم کے لئے یہ کچھ کر رہا تھا اور قوم کے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام اس پر کفر کے فتوے لگانے کے جہادِ عظیم

میں مصروف تھے اور سارا زور اسے ملحد، لاندہب، کرسطان، نیچری، دہریہ، دجال، مزد اور کافر ثابت کرنے میں صرف فرما چکے تھے۔ اس میں ہر فرقہ کے مولوی صاحبان شامل تھے۔ حتیٰ کہ جب فتویٰ پر چوٹی کے ساٹھ مولویوں کی مہروں اور دستخطوں سے سرسیدؒ کی تکفیر پر اجماع ہو گیا تو پھر یہ حضرات یہاں سے بھاگے بھاگے مکہ معظمہ پہنچے، تاکہ حرمین شریف کی مہروں سے فتویٰ کی حکمت کو اور زیادہ ثابت کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی فرما دیا کہ

کفر کے فتوے

”یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی طرف مائل ہو گیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا۔ اگر اس نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ دین کی حفاظت کے لئے اس کا قتل واجب ہے۔“

سرسیدؒ، قریہ، گاؤں گاؤں، شہر بہ شہر، کوچہ بکوچہ، قوم کا درد دل میں لٹے، اس کی زندگی اور فلاح و بہبود کے لئے دیوانہ وار پھرتا تھا اور یہ حامیان شرع مبین اور مفتیان دین متین کفر کے فتوؤں کا انبار اٹھائے، اس کے پیچھے لگے رہتے اور لوگوں کو تلقین کرتے پھرتے کہ اگر نجات چاہتے ہو تو اس شخص کی کوئی بات نہ سنا۔ اس کے جواب میں سرسیدؒ کیا کہتا تھا، سنئے۔ ایک مرتبہ وہ اسی تکفیر کے ہنگاموں اور گالی گلوچ کے جلو میں علی گڑھ مدرسہ کی تعمیر کے سلسلے میں لاہور آیا تو ایک اجتماع عظیم میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا:-

اے بزرگان پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر و مرتد آپ

فتویٰ کا جواب

کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اسے اپنا خادم اور خیر خواہ نہیں سمجھیں گے۔ آپ کے لئے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے آرام پاتے ہیں یا آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چارہ قلی، کافر، بت پرست، بد عقیدہ، سب مزدور کام کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھے بھی اس مدرسہ (علی گڑھ) کے قائم کرنے میں ایک قلی اور چارہ کی مانند تصور کر لیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے۔

سرسیدؒ کی یہ ساری کوششیں کس مقصد کے لئے تھیں؟ اس مقصد کے لئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جو بکھرے ہوئے تنکوں کی طرح فضا میں منتشر تھے پھر سے شیرازہ بندی کی جائے تاکہ وہ اس ملک میں قائم بالذات اور مستقل جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مسلمانوں کو یہ حیثیت دینے کے لئے نہ انگریز تیار

قضاۃ ہند و رضا مند۔ انگریز انہیں ایک باغی مذہبی فروت تصور کرتے تھے اور ہندو انہیں اچھوت قرار دینے کے درپے تھے۔ لیکن سرسید نے ان دونوں کے علی الرغم

دو الگ الگ قومیں

اعلانہ کہہ دیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔

”اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہیں ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ

بھی نہیں ہوا۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ مخالفت اور عناد ان ہندوؤں کے سبب سے ابھرے گا،

جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔“

سرسید نے یہ الفاظ (۱۸۵۷ء میں) بنارس کے کمشنر مسٹر شک پٹر کے سوال کے جواب میں کہے تھے۔ پاکستان کی بنیاد اس نظریہ پر استوار ہوئی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اس لئے ان کی حکومتیں بھی الگ الگ ہونی چاہئیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ اعلان، اس بنیاد کی پہلی اینٹ ہے جو آج سے سو سال پہلے سرسید کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ اس اینٹ کو رکھتے ہوئے اس نے دارالعلوم کے

پاکستان کی پہلی اینٹ

طلبا، سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

”یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین رکھنے سے ہماری قوم، ہماری

قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے

ستارے بھی ہو گئے تو کیا؟ مجھے امید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں باتوں کے نور سے نور ہو گے اور جہی

ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہوگی۔“

یہ تھا پاکستان کا معیارِ اول۔ سرسید جس پر یہاں سے لے کر مکہ معظمہ تک کے علمائے کرام نے کفر و الحاد کے فتوے لگائے تھے۔ سوچئے کہ اگر قوم اس وقت ان فتوؤں کا اثر قبول کر لیتی تو ہم گنہگار تو ایک طرف، خود اس مقدس طائفہ کی اولاد کا کیا حشر ہوتا؟ ان میں سے کوئی بھی عید اللہ اور عبد الرحمن نہ ہوتا، سب لالہ گردھاری نعل یا فضل مسیح ہوتے۔

سرسید نے آنکھیں بند کیں تو اس شمع کو سیالکوٹ کے ایک نوجوان کے سپرد کر دیا، جو اس زمانے میں ہنوز

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

اقبال

کا وطنی ترانہ گا یا کرتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ یورپ گیا اور وہاں وطنیت یا قومیت (نیشنلزم)

کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اس پر قرآن کریم میں بیان کردہ یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ قومیت کی بنیاد مشترکہ آئیڈیالوجی (یا ایمان) ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ چنانچہ جب وہ وطن سے واپس آیا تو اُس کی زبان پر ”ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا“ کی جگہ

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تھا۔ اُس زمانے میں یہاں قومیت پرستی کا بڑا چرچا تھا۔ اس لئے کہ یہ تصور، ہندو اور انگریز دونوں کے لئے مفید تھا۔ اقبالؒ کی نگہ دور رس نے مسلمانوں کے لئے اس عظیم خطرے کو مبہم بنایا اور جو بات سرشتیؒ نے پچاس سال پہلے مجملہؒ کہی تھی اسے شرح و بسط کے ساتھ کہنا شروع کر دیا۔ اس نے نظریہ وطنیت کے فریب خوردہ مسلمانوں کو لٹکار کر کہا کہ یاد رکھو!

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا!

ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

مسلم قومیت کا معیار

اور اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے حجم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آؤرنے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے!

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بیک بڑا شیعہ تہذیبِ نبوی ہے! غارت گر کاشانہِ دینِ نبوی ہے!

ہاز و ترا، توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دین ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!

اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

وہ یومِ اول سے اپنے آخری سانس تک اسی پیغام کو دہراتا چلا گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ فضا اس سے متاثر ہو گئی ہے تو اس نے اللہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطبہٴ صدارت میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہے۔ اس لئے اس کی مملکت بھی الگ اور آزاد ہونی چاہیے تاکہ یہ اس میں قرآن کے احکام و قوانین کو ایک زندہ حقیقت کی طرح نافذ کر کے صحیح اسلامی زندگی بسر کر سکے۔ حضراتِ علمائے کرام

پاکستان کا اولین تصور | نے اقبالؒ کے خلاف پہلے ہی کفر کے فتوے صادر کر رکھے تھے، اس اعلان نے گویا پھڑوں کے چھتے میں پھنسا دیا۔ قومیت پرست علماء نے مخالفت کا طوفان برپا کر دیا۔ دطن کے اشتراک پر ہندو اور مسلم کی متحدہ قومیت کے جواز میں بڑے بڑے خویش خدا اور رسول کے ارشادات پیش کئے جانے لگے۔ اس طائفہ کے سرخیل، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے بر ملا کہا کہ

اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں

مولانا حسین احمد مدنیؒ | چونکہ یہ الفاظ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی زبان سے نکلے تھے اس لئے ان سے اقبالؒ کے دل پر چھری چل گئی۔

اس کے سینہ پر سوز سے بے ساختہ ایک چرخ نکلی جس نے ان زندہ جاوید اشعار کی شکل اختیار کر لی کہ

عجم ہنوز نداندر موز دیں، ورنہ زدیو بند حسین احمد ایں چہ بولوا عجیبی است

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر مقام محمد عربی است!

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ ادست

اگر باؤ نہ رسیدی، تمام بولہبی است!

اس کے بعد مولانا مدنیؒ کے جواب پر انہوں نے جو بیان شائع کیا وہ اس موضوع پر گویا حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ

”اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دیں اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں

کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اڈل تو لا دینی ہوگا۔ اور اگر لا دینی نہیں تو اسلام کو محض ایک

ط اقبالؒ کا یہ خدشہ کس قدر صحیح تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں اسرار احمد آزاد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کی جلی سرخی یہ ہے کہ ”یہ الزام غلط ہے کہ علامتے ہند اس ملک میں سلطنت اسلامیہ کے لئے کوشاں رہے“ اور نفس مضمون میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

اخلاقی نظر پر سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروا الٰہی

اور اس کا خاتمہ انہوں نے ان الفاظ پر کیا کہ

”مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔

لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ اَوَّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے

اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس

کی بنیادیں اپنی اصولوں پر ہوں، جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل

کو قائم کرنا چہ معنی دارم؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام

بن جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن

جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر سزاوارتہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا،

روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ کو اس واقعہ سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ پھر بستر سے اٹھ ہی نہ سکے اور اس کے غمگینا ہی عرصہ

بعد ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ لیکن پاکستان کی بنیاد کی جوائنٹ سرسٹید نے رکھی تھی وہ اسے اپنی

عمر بھر کی محنت شاقہ سے اتنا اونچا لے گئے کہ اس پر گویا چھت ڈالنا باقی رہ گیا۔ کتنے عظیم تھے پاکستان کے معمار

اور کتنا بڑا ہے ملت اسلامیہ پر ان کا احسان۔

آسمان ان کی لمحہ پر شبنم افشان کرے سبزہ ندرستہ اس گھر کی نگہبانی کرے



اقبالؒ کے بعد

مرنے وقت یہ شمع کس کے ہاتھ میں دینی ہے، علامہ اقبالؒ کی نگہ حقیقت بین نے اس

کا انتخاب بہت پہلے کر لیا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس ہجوم میں ایک مردِ راہ ہیں

ایسا ہے جس کے سپرد یہ امانت نہایت اطمینان اور وثوق سے کی جاسکتی ہے۔ یہ تھے مسٹر محمد علی جناحؒ ہار ایٹ لا

جنہیں ملت کی منہ آواز نے قائدِ اعظمؒ کہہ کر پکارا اور انہوں نے اپنی بے لوث خدمت، بے پناہ محنت اور بلند

کیرئیر سے ملت کے اس اعزاز کو سچ کر دکھایا۔

سرسٹید نے ۱۹۴۷ء میں بنارس کے مکشڑ سے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور دونوں

دل سے کسی کام میں اشتراک نہیں کر سکتیں۔ اقبالؒ نے ۱۹۰۶ء میں کہہ دیا تھا کہ —

”بنا جائے حصارِ ملت کی اتحادیوں نہیں“ اور جناحؒ نے اب مسلمانوں کے لئے ایک انگ آزاد مملکت کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھی کہ

”ہم دونوں فرقوں میں صرف مذہب کا فرق نہیں، ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا

دین ہمیں ایک ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔“ (ایڈیٹڈ س کالج پشاور کی تقریر، ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء)

اس سے پہلے انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

”میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیاندار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں۔“

اس سے دو ہفتہ پہلے (۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو) انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک اہم تقریر کی۔ اس میں سوال زیرِ نظر یہ تھا کہ پاکستان کے تصور سے مطلب کیا ہے؟ یہ کیا ایک سامنے کیے آگیا۔ ان سوالات کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے دو فقرے کہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان دو فقروں میں پاکستان کے مطالبہ کی ساری تالیخ سمٹا کر رکھ دی۔ آپ نے فرمایا:-

”پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے،

جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔“

آپ نے غور کیا کہ کتنی عظیم حقیقت ہے جسے ان چند الفاظ میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ جس دن پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا اس دن ایک جدا گانہ قوم وجود میں آگئی تھی اور یہی چیز مسلمانوں کی الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہے۔ اور اب کو معلوم ہے کہ یہ الفاظ کس کی زبان سے نکل رہے تھے؟ اس سطر جناحؒ کی زبان سے جو ابھی کل تک بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ

(I AM NATIONALIST FIRST, NATIONALIST SECOND, AND NATIONALIST LAST.)

قائدِ اعظمؒ مسلم قومیت کا اعلان پر اعلان کرتے جا رہے تھے اور اسلام کے علمبردار حضرات علمائے کرام چاروں طرف سے یورش کر کے ان کی مخالفت میں اُمنڈے چلے آ رہے تھے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر محض ایک وطن کے باشندے ہونے کی بنیاد ایک قوم کے افراد ہیں اور یہ تصور باطل ہے کہ اسلام کو ایک زندہ حقیقت

بننے کے لئے آزاد خطہ زمین کی ضرورت ہے جس میں حکومت قوانین

علماء کی طرف سے مخالفت

خداوندی کے مطابق قائم ہو۔ وہ کہتے تھے کہ سیکولر انداز کی جمہوری

حکومت جس میں غیر مسلم (ہندو) اکثریت قانون وضع کرے، عین مطابق اسلام ہے۔ پس انا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا پرنسپل لار (شخصی قانون) یعنی نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق معاملات علمائے کرام کے ہاتھ میں رہیں۔ وہ تھا مسٹر جناح کا دعویٰ اور یہ تھا علمائے کرام کا مسک۔ آسمان کی آنکھ نے اس زبیدہ لتجیب انگیز اور تأسف خیز ناشائیدہ ہی کہیں اور دیکھا ہو کہ ڈاڑھی مونچھ منڈا، سوٹ بوط میں ملبیس، مغرب کا تعلیم یافتہ مسٹر جناح مسلمانوں سے یہ کہہ رہا ہو کہ

”اس حقیقت سے سوائے چہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطہ، اخلاق ہے، جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔“ (۱۹۴۵ء میں عبد کا پیغام)

اور اس کے برعکس، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) مسلمانوں کو اس

مولانا آزاد مرحوم

کانگریس میں شرکت کی دعوت دیتے تھے جس کی قیادت مہاتما گاندھی کے ہاتھ

میں تھی۔ مہاتما گاندھی کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ

”وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو نکلنے نہیں دیتا۔“ (خطبہ صدارت پرتاپ گڑھ کانگریس)

یہ اس شخص کے متعلق کہا جا رہا تھا جو بڑے فخر سے اعلان کرتا تھا کہ

”میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں دبدل اور اپ تشددوں، پرانیوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو ماننا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں، تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گنور کھنسا کو اپنے دھرم کا جڑ سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو

ہے۔ (بحوالہ خطبہ صدارت قائد اعظمؒ، مسلم لیگ سیشن دہلی، اپریل ۱۹۴۳ء)

مسٹر جناح پہلے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ

”وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے“

اور پھر خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیتا ہے کہ

”وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی عظیم کتاب قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک امت۔ (لیگ سیشن کراچی، ۱۹۴۳ء)

اس کے برعکس، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) فرماتے ہیں کہ

”یہ خیال کہ مسلمان بر بنائے مذہب ایک جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو اور دوسری مسلمان، انگریزوں کا وضع کردہ ہے۔“

اور اس کے بعد وہ سینے کے پورے زور سے اعلان کرتے ہیں کہ

”میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔“ (ایضاً)

یہ وہی ابوالکلام آزاد ہیں جو کسی زمانے میں کہا کرتے تھے

دورِ الہلال کے ابوالکلام آزاد

انسان کی اجتماعی حیات اور قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علاقوں نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ انبیائے کرام کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔“

آگے چل کر لکھا تھا۔

”یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا، مجبوراً قرار

کے اس برادری میں شامل ہو گیا، خواہ وہ مصری ہو، خواہ الجیریہ کا وحشی ہو، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک، لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے، جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں لیکن یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام، رنگ و نسل، اور زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔۔۔۔۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصل رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔“

وہ الہ الکلام آزاد جو اپنے دورِ الہلال (۱۲-۱۹۱۲ء) میں یہ کہتا تھا، اب کیا کہہ رہا تھا؟ اسے برادرانِ عزیز ذرا کلیجہ بھرا کر سنیئے۔ مولانا آزاد اپنی کتاب میں جو ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے (اور جو شائع ان کی وفات کے بعد ہوئی ہے) لکھتے ہیں:-

مولانا آزاد کے آخری الفاظ | لوگوں سے یہ کہنا کہ زمین کے ایسے قطعوں میں جو جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اس قدر مختلف ہوں، مذہبی یکسانیت سے وحدت پیدا ہو سکتی ہے، بہت بڑا فریب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی برادری کی تشکیل چاہی تھی جو نسل، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے بلند ہو کر وجود میں آئے۔ لیکن تاریخ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ ایک مختصر عرصے کے بعد جسے زیادہ سے زیادہ سو سال کا عرصہ کہیے، اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ مختلف ملکوں کو دین کی بنیادوں پر ایک وحدت بنا سکے۔“

(INDIA WINS FREEDOM-P.227)

استغفر اللہ! استغفر اللہ۔ مولانا آزاد کا کہنا یہ ہے کہ اسلام نے دین کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کی کوشش کی لیکن وہ تجربہ ناکام رہا اور اب اسے دہرانا حماقت اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینا بہت بڑا فریب ہے۔ یہ وہی آزاد ہیں جو مسلمانوں کو برسوں تک یہ دعوت دیتے رہے کہ

”یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔“

سچ ہے انسانی عروج کی تو ایک انتہا ہوتی ہے لیکن جب وہ پستی کی طرف گرتا ہے تو اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہوتی۔ من غیر مسلموں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت میں جذب ہو جانے پر اب مولانا فخر محسوس کیا کرتے تھے ان کے متعلق وہ

کبھی مسلمانوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ

کفار سے ساز باز مت رکھو کفار کے عہد و بیان کا ہمیں بار بار تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزت نفس و شرف کا انہیں لحاظ تک نہیں قیسمیں کھاتے

ہیں، حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے، اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں مگر ہاتھ سے کام کرتے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔

لہذا ان سے مسلمانوں کو ساز باز نہیں رکھنی چاہیے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔

(المسکال، ۲۸ اگست ۱۹۱۳ء)

بہر حال وہ تھی مسٹر جناح کی دعوت اور یہ تھی ہمارے علمائے کرام کی حالت۔ ہم نے اس باب میں مولانا آزاد (مرحوم) کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا ہے کہ یہ قومیت پرست علما کے امام تھے۔ ورنہ باقی حضرات بھی مسلمانوں کی الگ مملکت کے مطالبہ کی مخالفت میں ان سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن یہ خدا کا بندہ تھا کہ مخالفوں کے اس تمام طوفان میں روشنی کے مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا اور اپنے مبنی بر صداقت مطالبہ کی نور پاشیوں سے باطل کی تاریکیوں کو ہٹاتا اور مٹاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی مسلسل جدوجہد اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا جسے اس نے

(مارچ ۱۹۴۷ء میں) پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ

پاکستان کا پختہ تصور

کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا کہ

”پاکستان کے تصور کو جو اب مسلمانوں کے لئے ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی

طرح سمجھ لیا ہے۔ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ اسی سے یہ آواز اٹھائے

عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمت گزشتہ کو از سر نو زندہ کریگی۔“

پھر انہوں نے (۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو) فرنٹیر مسلم لیگ پشاور کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

”مسلمان، پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطہ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات

اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔“

جون ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فرنٹیر مسلم اسٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں فرمایا کہ

”پاکستان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی

ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل

بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں۔ اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔“

مسٹر جناح اپنی اس پکار کو برابر دہراتے جا رہے تھے اور مولوی حضرات اسلامی حکومت کے اس مطالبہ کی مخالفت میں دن بدن تند و تیز ہوتے جا رہے تھے۔ ہم نے اس سے پہلے ان کی مخالفت کے جس گوشے کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق نیشنلسٹ علماء اور اس مسلک کی داعی دیگر جماعتوں سے تھا، مثلاً جمعیت العلماء ہند، مجلس احرار، آزاد مسلمان، انصار، سرخپوش وغیرہ، لیکن ان کے علاوہ ایک گوشہ اور بھی تھا جس کی طرف سے مخالفت کا اندازہ ہی نرالا تھا۔ یہ تھی جماعت اسلامی اور اس کے امیر سید

جماعت اسلامی

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب! یہ متحدہ قومیت کے بھی مخالف تھے، لیکن اس کے ساتھ مطالبہ پاکستان کے بھی دشمن۔ اس عداوت میں یہ حضرات نیشنلسٹ علماء سے بھی دو قدم آگے تھے۔ آپ نے ان چند اقتباسات سے، جنہیں پہلے پیش کیا گیا ہے، دیکھ لیا ہو گا کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ عظمیٰؒ نے کس طرح صاف، بین اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کو واشگاف کیا — اور تہ تکرار و اصرار، واشگاف کرتے چلے گئے کہ پاکستان سے مراد ایک ایسی اسلامی مملکت کا قیام ہے جس میں قوانین اسلامی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔ لیکن مودودی صاحب یہ کہہ کر مسلمانوں کو اس مطالبہ کی حمایت کرنے سے باز رکھنے کے جہادِ عظیم میں مصروف تھے کہ

”مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی غلط بیانی | تقریریں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔“

(سیاسی کشمکش، حصہ سوم، مطبوعہ ہندوستان، القرآن، محرم ۱۳۶۰ھ، صفحہ ۲۰۷ نوٹ)

آپ نے غور فرمایا کہ ان تمام اعلانات اور بیانات کی موجودگی میں جو مسلم لیگ کے دوسرے درجہ کے لیڈر تو ایک طرف، خود علامہ اقبالؒ اور قائدِ عظمیٰؒ کی طرف سے شائع ہوئے تھے اور ہوتے چلے جا رہے تھے، یہ کہنا کہ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے، کس قدر دیدہ دلیری ہے۔

اور آگے بڑھئے۔ ان کی مخالفت کی آگ اسی سے ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس کی وضاحت

کرتے ہوئے کہا کہ

”جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور

یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت

مسلمانوں کی کافرانہ حکومت

الہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل

اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔“ (ایضاً ص ۲۹)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس وقت ہندو اور انگریزوں سے جنگ اس بات پر ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے

ایک الگ خطہ زمین حاصل کیا جائے جس میں یہ آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ جب یہ خطہ زمین حاصل ہو جائے

گا تو اس میں مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اسلامی حکومت قائم کر لیں۔ اگر آزاد خطہ زمین ہی

نہ ملا تو اسلامی حکومت کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے،

”بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا

ناممکن ہے“

قومی اسٹیٹ تو قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح

کے ذریعہ اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات

کا جو محقّق اہمیت مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں اور اگر یہ کامیاب

ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔“ (ایضاً ص ۷)

واقع رہے کہ اب وہی مودودی صاحب، پاکستان کے خطہ زمین میں اپنے تصور کے مطابق اسلامی اسٹیٹ

قائم کرنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے ہیں اور میں اسلامی اسٹیٹ کی بنیاد، اس جمہوری نظام کو قرار

دے رہے ہیں جس کے متعلق انہوں نے فرمایا تھا کہ اس کے نتیجے میں جو حکومت قائم ہوگی وہ مسلمانوں کی کافرانہ

حکومت ہوگی۔ چنیں دور آساں کم دیدہ باشد۔

یہ تو رہی ان کی مخالفت مطالبہ پاکستان کی۔ اب یہ سنئے کہ

یہ صاحب، اس مطالبہ کو پیش کرنے والوں کے متعلق کیا فرماتے

یہ سب قرآن سے بے بہرہ ہیں

حقے۔ وہ سیاسی کشمکش حصّہ سوم میں لکھتے ہیں:-

”افسوس کہ لیگ کے قائد عظیم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو

اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے پرکھتا ہو“ (مطبوعہ ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۲۴۴)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :-

”ان کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور ذہن کی قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی۔ ان کا یہ حال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطہ، نقطہ نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے۔

(الضياء، ص ۷۷)

آپ کو معلوم ہے کہ یہ کس شخص کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اُسے چھوٹے سے چھوٹے مسائل تک میں بھی قرآن کا نقطہ، نقطہ معلوم نہیں! اس شخص (قائدِ عظمؒ) کے متعلق جس کی قرآنِ کریم کے حقائق پر غائے نگہی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب وہ اگست ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) گئے تو عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے ان سے کچھ سوالات پوچھے۔ سنئے کہ سوالات اور ان کے جوابات کیا تھے؟

(یہ اقتباس، ”قائدِ عظمؒ اور اسلامک ایڈیالوجی“ کے زیرِ عنوان تقریر

قائدِ عظمؒ کی قرآنی بصیرت

میں پیسے دیا جا چکا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔ ص ۵۶ پر)

یہ فقہا، مفتوں کا وہ ہجوم جس میں یہ نجیف و نزار، سامر و مجاہد، قوم سے ایک پیسہ لئے بغیر پاکستان کی چوڑھی ٹرائی تنہا لڑ رہا تھا اور اس کی مخالفت کی یہ کیفیت تھی کہ یہ لوگ سنجیدگی اور متانت کو بالائے طاق رکھ کر، وزارت کی پست ترین سطح پر اُتر آئے تھے۔ اس سطح پر اُن کے طنز و استہزاء کی کیفیت کیا ہوتی تھی، اس کا اندازہ، جماعتِ اسلامی کے ایک رکن، لیکن — نصر اللہ خاں صاحب عزیز (جو آج کل ایشیاء کے مدیر ہیں) کے ایک صحافتی شاہکار سے لگائیے جو ان کے اخبار ”کوثر“ کی ۱۳ جنوری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا

استہزاء

ضرورت ہے ایک مہلر اور مسولینی کی

اور اس عنوان کے نیچے لکھا تھا :-

”اس زمانہ میں مہلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی قوموں کو انہوں نے اپنی زمین پستی سے اٹھا کر آسمانِ رفعت پر بٹھادیا۔ مسلمانوں نے دوسروں کو اس طرح کرتے دیکھا تو

انہوں نے نگل اپنے اشتہار کی عبارت بدل ڈالی۔ اب ان کے اخبار خیال کے صفحات پر یہ مضمون نظر آفرہ تھا۔ "ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی"۔ بالآخر ان کی اشتہار بازی کامیاب ہوئی۔ اشتہار بازی کا اصول یہ ہے کہ اشتہار دیئے جاؤ کسی نہ کسی روز تو گاہک پیدا ہوں گے۔ حمدی علیہ السلام سے لے کر مسولینی تک کی ضرورت کا جو اشتہار مسلسل ان کے جریدہ خیال میں نکل رہا تھا، آخر کار نتیجہ خیز ہوا اور مسٹر جناحؒ نے اپنی درخواست قوم کے حضور میں گزراں دی۔ قوم نے باقی سب امیدوارانِ قیادت کو برخاست کر دیا اور مسٹر جناحؒ کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا اور قائدِ اعظمؒ زندہ باد کے نعروں سے فضائے ہند معمور ہو گئی۔ (بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص ۳۷)

یہ جنوری ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ قائدِ اعظمؒ طنز و استہزا اور تحقیر و تذلیل کے ان تیروں کو بھی اپنے سینے پر لیتے اور انتہائی ضبط و استقلال سے اپنے دل میں سمو لیتے تھے۔ انہیں اس کی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ ان خاردار... جھاڑیوں میں اپنا دامن الجھائیں۔ وہ جس کے دامن پر اسلامیت کی کوئی چھینٹ بھی نظر نہیں آتی تھی، ان سرتاب قدم "اسلامی پیکروں" سے بہت اونچا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مستانہ وار آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ جوں جوں اسے منزل قریب نظر آ رہی تھی اس کے ذوقِ سفر میں اور تیزی اور تازگی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسی جذب و انہماک سے اپنے بے سرو سامان قافلہ کو لئے آگے بڑھتا گیا۔ تا آنکہ اگست ۱۹۴۷ء میں منزل نے خود آگے بڑھ کر اس کے قدم چومے اور اس نے انگریز، ہندو اور خود مسلمانوں کے مزعومہ علمبردارانِ اسلام و شریعت کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، اپنے کارواں کو سرزمینِ پاکستان میں آن اتارا۔ اور اس طرح جس عمارت کی پہلی اینٹ، سرسید کی نگہ و دور رس نے رکھی تھی اور جس کی دیواریں اقیال کی قرآنی فکر نے اوپر اٹھائی تھیں، وہ قائدِ اعظمؒ پاکستان بن گیا۔

کی بصیرت و کردار کے صدقے تکمیل تک پہنچ گئی۔ فالحمہ للہ علی ذالک۔

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!

قائدِ اعظمؒ نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ ایک خطہ زمین کا حصول، ہمارے لئے مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے اس خطہ زمین میں صحیح اسلامی حکمت کا قیام۔ چنانچہ انہوں نے اس خطہ زمین پر قدم رکھنے کے بعد اپنے رفقاء کو وضاحت سے سمجھا دیا کہ وہ کہیں اسی کو مقصود و منتہا سمجھ کر آرام سے نہ بیٹھ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں (خالق دینا لال - کراچی میں) عامل

حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

”پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے
یہ خطہ زمین مقصود بالذات نہیں | مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل

سے ایک حقیقت ثابت ہو کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں
تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے
جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما
پاسکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رُو بہ عمل لائے جا سکیں۔“

اسلام کا عدلِ عمرانی | قائدِ اعظم کے الفاظ میں اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا، اس کا جواب صاف

اور واضح ہے۔ اسلامی نظام کا منتہی یہ ہے کہ ہر فرد کی تمام مضر صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح ہو جائے کہ وہ
اس دنیا میں اور اس کے بعد کی زندگی میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس مقصد
کے لئے وہ سب سے پہلے افرادِ مملکت کو ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے فکر کر دیتا ہے تاکہ
وہ اطمینان سے بلند مقاصدِ زندگی کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ وہ تمام افراد کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ ”ہم
خدا کی طرف سے تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری لیتے ہیں۔“ اس کا نام اسلام کا
عدلِ عمرانی ہے۔ اس کی وضاحت علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے جن الفاظ میں کی تھی، ان کا تفصیلی تذکرہ
سابقہ تقریر میں کیا چکا ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں اسلامی نظامِ زندگی منسقل کرنے
کی تدابیر پر غور و فکر میں مصروف اور شہک تھے کہ دیکھنے والے کیا دیکھتے ہیں کہ وہی لوگ جو مسلسل دس برس تک،
مطالبہ پاکستان کی اس شدت سے مخالفت کرتے رہے تھے، فوج در فوج پاکستان کی طرف امنڈے چلے آ رہے
ہیں چشمِ عبرت جبران تھی کہ یہ حضرات اب کس منہ سے ادھر آ رہے ہیں۔ خود قائدِ اعظمؒ بھی تعجب انگیز نگاہوں
سے اس ریلے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ رہے

مخالفینِ پاکستان، پاکستان کی طرف | تھے اور ان کے ساتھ ہی ان کی مخالفت کی آگ ان

کی دشنام طرازیوں کی بوچھاڑ، ان کے طنز اور استہزاء کے تیروں کی بارش، ایک ایک کر کے پردہ سیمین کی
طرح ان کی نگاہوں کے سامنے آرہی تھی۔ دنیا منظرِ حق کی اب دیکھیں قائدِ اعظمؒ کی طرف سے ان کے تیر و سنان

کا کیا جواب ملتا ہے۔ وہ پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ وہ جس پر چاہتے یہاں کا دروازہ بند کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایک بلند سیرت انسان کی طرح دل کی پوری کشادگی سے کام لیا اور جس طرح نبی اکرمؐ نے مخالفین کے سے، جو فتح مکہ کے بعد پابجولاں سامنے کھڑے تھے، فرمایا تھا، ہمت کی پوری جنبش سے کہہ دیا کہ

لَا تَثْرِيْبٌ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ ۖ (۱۳/۹۲)

آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں مَن دَخَلَهُ كَانَ اِمِنًا۔ (۳/۹۴) جو یہاں

وُسْعَتِ ظَرْف | آئے گا، اسے امن حاصل ہوگا۔

انہوں نے اس وسعتِ ظرف کا ثبوت دیا، اگرچہ بعض کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی یہ کشادگی پاکستان کے حق میں اچھی ثابت نہیں ہوگی۔ جو لوگ ابھی دابگہ سے اُس پار تک، پاکستان اور بانی پاکستان کو مسلسل گالیاں دے رہے تھے، وہ اس حد کو پار کرنے کے ساتھ کس طرح پاکستان کے ہی خواہ ہو سکتے ہیں۔ ایسا کہنے والوں کے سامنے قرآن کریم کا وہ فیصلہ بھی تھا جو اس نے ان اعراب (قبائلی بدوؤں) کے سلسلے میں دیا تھا، جو عمر بھر اسلامی نظام کی مخالفت کرتے رہے تھے، لیکن جب اسلام کا غلبہ ہو گیا تو وہ اس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئے اور اپنا شمار مومنین کی صف میں کرنے لگے۔ اس پر قرآن نے کہا تھا کہ

قَالَتِ الْأَعْرَابُ اِبْ اِمْتًا ۖ قُلْ لَّكُمْ تَوْفِيقُوْهُ ۚ وَلَٰكِنْ قُلُوْا اَسْمٰكُمۡنَا ۚ
وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۖ (۲۹/۱۱۴)

یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ تم صرف غلبہ اسلام کے سامنے جھک گئے ہو۔ ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔

بعد کے واقعات نے بتا دیا۔ اور اب تک بتاتے چلے آ رہے ہیں کہ جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی ان کے دل میں فی الواقعہ پاکستان کی محبت جاگزیں نہیں ہوئی۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو

یہاں رہنے میں انہیں اپنے مفاد نظر آتے ہیں، اس لئے وہ پاکستانی ہیں۔ اس کے خلاف انتقام کی چنگاریاں اب بھی ان کے سینوں میں سلگ رہی ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ قَدْ بَدَلَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَوْاْهِمۡ ۚ وَ مَا تُخَفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۖ (۳۱/۱۱۴) اس بغض و عداوت کے مظاہرے کبھی کبھی ان کی زبان سے ہو جاتے ہیں لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قائدِ اعظم کو مقتدرین کے اس طائفہ کے عزائم کا علم و احساس تھا، اس لئے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مستقبل میں ان کی آئینی پوزیشن کیا ہونی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام ایک پیغام برائڈ کا سٹ کیا جس میں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ پاکستان میں تقابلاً کیسی کمیٹی قائم نہیں ہوگی۔ (اصل اقتباس سابقہ تقریر میں دیا جا چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔ ص ۷۰ پر)

لیکن قوم کی بدقسمتی (اور ان حضرات کی خوش بختی) کہ قائدِ اعظم، آئین پاکستان کے مرتب کرنے سے پہلے ہی دنیا سے چلے گئے اور ان کے بعد کوئی ایسا نہ رہا جو انہیں ان کی حدود کے اندر رکھنا۔ چنانچہ یہ کھل کر میدان میں آگئے۔ آپ کو یاد ہے کہ مودودی صاحب نے تحریک پاکستان کے دوران میں کہا تھا کہ ”مسلم لیگ کے کسی ریزولوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں یہ بات آج تک واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے“ اب انہی مودودی صاحب نے پاکستان کے عوام سے کہنا شروع کر دیا کہ

”میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ قیام پاکستان کی جدوجہد میں جو کچھ آپ کو سمجھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت

جھٹ بدل گئے

کا قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی پاک کتاب اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہو۔ اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ لیڈروں کے ذہن میں خواہ کچھ بھی ہو کم از کم زبانوں سے انہوں نے ہر اس طرح اور ہر منبر پر کھڑے ہو کر یہی کہا تھا اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی وعدوں اور ان کے ظاہر کردہ انہی ارادوں پر یقین کر کے پاکستان کی تحریک میں ان کا ساتھ دیا تھا۔“ (دستوری سفارشات پر تنقید ص ۷۰)

یہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہ حضرات اہم تشکیل پاکستان تک، پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت میں کس طرح ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے۔ لیکن اب بلا جھجک یہ کہنا شروع کر دیا کہ

”ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کو شش کی تو اس لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا“

نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود

قائم رہے، بلکہ صرف اس لئے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لئے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تو اس عرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا

ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے، بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظام کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔“

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۵۰ء)

مسلمان باقی رہیں یا نہ رہیں | آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے یہ مرتبی و محسن، جو یہ کہہ رہے ہیں کہ ”ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے اس قدر کوشش

کی تھی، کون بزرگوار ہیں! یہ وہی حضرت ہیں جو تحریک پاکستان کے دوران میں اعلانیہ کہہ رہے تھے کہ ”اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہوجانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟“

(سیاسی کشمکش بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ، ۲۱ مئی ۱۹۴۰ء، مطبوعہ ترجمان القرآن)

یہ ہیں وہ جو آج دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کے قومی وجود کا تحفظ کیا تھا! باقی رہا ان کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تو اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

چہ دلاور است و زوے کہ بجھ چراغ وار

ان احسانات کا صلہ | اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ حضرات اپنے احسانات کا بدلہ قوم سے کیا مانگتے ہیں؟ یہ کہ پاکستان کا اقتدار ان کے سپرد کر دو، تاکہ یہ اس میں اپنی مرضی

کے مطابق ”اسلامی نظام“ قائم کر سکیں۔ اس ”اسلامی نظام“ میں قوم کا حشر کیا ہوگا، یہ بھی سنتے چاہیے۔ مودودی صاحب اپنے رسالہ ”مرتد کی سزا“ ص ۸ میں لکھتے ہیں:-

چنگیزی اسلام | جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً

و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام میں انہیں مجبور کیا جائے گا۔

اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔“
اور ظاہر ہے کہ اس بات کا فیصلہ کہ فلاں شخص نے دائرہ اسلام سے قدم باہر رکھ دیا ہے، یہی حضرت
کریں گے!



یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ پاکستان جو سرسیدؒ کے اخلاص و جہاد، اقبالؒ کی آہِ سحر کا ہی و نالہِ نیم شبی
اور جناحؒ کی بصیرت و کردار سے قریب اسی سال کی محنتِ شاقہ سے تعمیر ہوا اور یہ ہیں وہ لوگ جو
آج اس کے دعویدار ہیں۔۔۔۔۔ وہ لوگ جو قوم کے اُن غم گساروں اور محسنوں کو کا فر بناتے اور
گالیاں دیتے رہے اور جنہوں نے پاکستان کی مخالفت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ کس قدر دُور رس تھی
نگاہ اس مردِ قلندر کی جب اس نے کہا تھا کہ

زراغوں کے تصرف میں ہے شاہینِ کاشمین

لیکن اس میں عزیزانِ من! گھبرانے کی کوئی بات نہیں یسیت کے جس
پروگرام نے سرسیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ جیسی شخصیتوں کو ایک
دوسرے کے تسلسل میں پیدا کر دیا تاکہ وہ اس قوم کو جسے اختیار کی ریشہ دہانیاں اور اپنوں کی غداریاں
مٹا دینے یا شور و بنا دینے کا تہیہ کر چکی تھیں ایک عظیم مملکت کا وارث بنا دے۔ وہی پروگرام اب یہ
انتظام بھی کرے گا کہ یہ ستارے مٹی ہر ہرن کی دستبرد سے محفوظ رہے۔ اب پھر ایک سمرخ پیدا ہو گا جو
اپنی شعلہ لوائی سے، اس نشیدِ جانفرا کو فضائے کائنات میں عام کر دے گا کہ باطل کی قوتیں سرنگوں
ہوں گی اور اس خطہ پاک میں ایک بار پھر وہی قرآنی نظامِ جلوہ بار ہو گا جو چودہ سو سال پہلے،
سرزمینِ حجاز میں وجہِ بالیدگیِ مشرفِ انسانیت ہوا تھا اور جس نے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور
سربایہ داری کی ہر اس زنجیر کو توڑ کر دکھایا تھا جس میں نودخ انسان صدیوں سے جکڑی چلی آرہی تھی۔
سرسیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ کی بے صوت صدائیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمتِ رات کی سیما پا ہو جائیگی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغمبرِ سجود

پھر جبینِ خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی!

شب گریزاں ہوگی، آخر جلوہ خورشید سے
یہ چین معمور ہوگا نغمہ نوحید سے!

ولو کرہ المشرکون۔

اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ اس خطہ زمین کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس لئے کہ اگر (خدا نہ کردہ) یہ خطہ زمین ہی نہ رہا تو اسلامی مملکت قائم کہاں ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ اس مقصد کو عام کیا جائے جس کے لئے یہ خطہ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ جس قدر یہ خیال عام ہوگا اسی قدر اس مقصد کے حصول کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔

والسلام

۱۹۶۳ء



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جنگ اور انسان

(طلوع اسلام کنونشن ۱۹۶۳ء)

جیسا کہ میں نے ایک دفعہ اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

انسان بھی ایک طرفہ تماشا ہے

اسے عبادت گاہوں میں محو نیاز دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کے ذوقِ عبودیت پر نثار اور جنت کی حویلیں اس کی جھکی ہوئی پیشانی پر تصدق ہوتی ہیں۔ اس کا ایک ایک سجدہ، زمین اور آسمان کو وجد میں لاتا اور فضائے کائنات میں تھر تھری پیدا کر دیتا ہے۔

اور اگر اسے محبت کے حریمِ ناز میں سر بہ زانو دیکھو تو کسی کی یاد میں اس کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ شب کی تاریکیوں میں شمعِ کافوری کا کام دیں، آفتاب، اس کے دل کی نپشِ دخلش سے حرارت مستعار لیتا ہے کہ وہ اس سے نبضِ ہستی میں توجہ پیدا کر دے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے سوز و گداز سے، اپنے اندر نئی زندگی محسوس کرتا ہے۔

اور اگر اسے حیرت خانہِ علوم و فنون میں سرگرم تحقیق دیکھو تو اس کا فکر فلکِ پیا، زمین کی پستیوں سے لیکر

طی مضمون فردوسِ گم گشتہ میں شائع ہو چکا ہے۔

آسمان کی بلندیوں تک کے راز فاش کرتا اور ہر ماہ دستاروں پر کندیں ڈالتا ہے۔ وہ نہر سے تریاق بناتا اور پتھر کو آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی اختراعات جمیلہ، تہذیب و تمدن کے قصرِ رنگیں میں، نور و نگہت کی ندیاں رواں کر دیتی ہیں۔

لیکن ————— یہی انسان جب نشہِ قوت سے بدمست اور ہوسِ خوں آشامی سے مدھوش ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف پھرے ہوئے سیداب کی طرح اُمنڈتا ہے تو عہودِ تیت کا حجر و نیازِ محبت کا سونہر گداز اور علم و حکمت کا ساز و براق، سب اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جاتے ہیں۔ یہ خود اپنے ہاتھوں کے تعمیر کردہ قصرِ تہذیب و تمدن کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور انسان کا خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو جاتا ہے۔

اس کی ساری تاریخ، اسی خوں ریزی اور آتش باری کی ہولناک داستان ہے۔ یہ جوں جوں علم و عقل میں آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کی تباہ کاریوں کی وسعت حدودِ فراغ و فراموش ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب دارا نے یونان کی طرف لشکر کشائی کی تو اس کے ساتھ صرف دس ہزار فوج تھی۔ جب اسکندر نے ایشیا کی طرف رخ کیا تو اس کے جلو میں تیس ہزار کا لشکر تھا۔ جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تو پانچ لاکھ فوج اس کے زیرِ کمان تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں، صرف مقتولین اور زخمیوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد تھی اور کہا جا رہا ہے کہ اگر اب کے جنگ چھڑی تو ایک بم پورے کے پورے کرۂ ارض کو بھک سے اڑا دے گا۔ دُیُجُی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ (ہے) صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔

یہ تو انسان کی سیاسی دنیا کی داستانِ خونریز تھی۔ اس کی فکری دنیا کی طرف آئیے تو وہیں بھی یہ عجیب مجموعہٗ تضاد دکھائی دے گا۔ اگر ایک طرف اس نے یہ فلسفہ وضع کیا کہ ایک چیونٹی کا مارنا بھی جہا پاپ (گناہِ عظیم) ہے اور انسان کو منہ پر کپڑا باندھے رکھنا چاہیے تاکہ جراثیم، سانس کے ذریعہ اندر جا کر ہلاک نہ ہو جائیں اور اس طرح انسان، جیوتھیا کے جسم کا مرکب نہ ہو جائے، تو دوسری طرف ہم نیٹشے کے الفاظ میں یہ سنتے ہیں کہ

(MEN SHOULD BE EDUCATED FOR WAR AND WOMEN FOR THE REACTION OF THE

WARRIORS: EVERYTHING ELSE IS FOLLY)

مردوں کو سپہ گری کی تعلیم دینی چاہیے اور عورتوں کا مقصدِ زندگی، ان سپاہیوں کی تفریح کا سامان بننا۔ اس

کے سوا جو کچھ ہے سب بکواس ہے۔ مسولینی کا قول تھا کہ جنگ بالکل اخلاقی چیز ہے۔ ہٹلر کہا کرتا تھا کہ اب ایک نئی دنیا وجود میں آ چکی ہے جس میں جنگ ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنگ ہر شے کے مابین کا معیار ہے اور قانون دہی ہے جسے ایک سپاہی وضع کرے۔ فرد اور معاشرے کے صرف وہی کام قابل ستائش قرار پاسکتے ہیں جو جنگ کی تیاری میں مدد دیں۔

کا قول ہے کہ

(HEINRICH HAUSER)

”ہمیں چاہیے کہ ان تمام اداروں کو توڑ ڈالیں جو انسانی کو امن اور حفاظت کی ضمانت دیتے ہیں۔ زندگی

اسی وقت محکم اور سادہ ہو سکے گی جسے بربریت کا عہد کہا جاتا ہے۔“

سوال ہے کہ اس افراط و تفریط میں، قرآن، کیا فلسفہ اور مسلک پیش کرتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بالعموم ہر شخص امن اور سلامتی چاہتا ہے۔ جو لوگ اس سلسلہ میں کوئی نمایاں

کام کرتے ہیں، دنیا کی ہر قوم انہیں واجب العزت سمجھتی اور ان کے

محبت سے کھڑے کرتی ہے۔ ہر سال کسی نہ کسی کو امن (PEACE) کا

امن و سلامتی کا دین

نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے خدا کی ایک صفت آسَلَامٌ اور دوسری الْمُؤْمِنُ بتائی ہے۔

آسَلَامٌ کے معنی ہیں وہ ذات جس سے ہر شے سلامتی حاصل کرے۔ اور الْمُؤْمِنُ کے معنی ہیں

امن کی ضمانت دینے والا جس پر بھروسہ کر کے امن اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ خود اس نظام زندگی

کا نام.... جسے قرآن پیش کرتا ہے، اسلام ہے اور جن لوگوں کے ہاتھوں سلامتی کا یہ نظام منسکھ ہوتا

ہے، انہیں مؤمن کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اُس ضابطہ حیات (قرآن) کے متعلق، جو اس نظام کا آئین و

دستور ہے، کہتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰتٰىكَ مِنَ اللّٰهِ مَتٰبِعِ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (۱۶۴) اس

کے ذریعے خدا، سلامتی کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ وہ اس کی دعوت کے متعلق کہتا ہے کہ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا

اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (۱۶۵) خدا سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ مومنین کے مال زندگی

کے متعلق کہتا ہے کہ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ (۱۶۸)۔ ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے۔ وہ جس معاشرہ

میں رہتے ہیں، وہ معاشرہ امن اور سلامتی کا گہوارہ ہے اور اس دنیا سے چلے جانے کے بعد، قرشتہ

ان کا یہ کہہ کر استقبال کرتے ہیں۔ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ يٰۤاَيُّهَا صَبَرْتُمْ (۱۶۳) تم نے دنیا میں امن و

سلامتی قائم رکھنے کے لئے جس استقامت کا ثبوت دیا تھا، اس کے بدلے میں یہاں تمہارے لئے امن و سلامتی

کے تحائف ہیں۔ یہی امن و سلامتی کی حسین آرزو ہے جو صبح سے شام تک، ہر مسلمان کے در و دربان رہتی ہے جب وہ آنے والے کا استقبال ”السلام علیکم“ کی صدائے نشاط افزا سے کرتا ہے اور اس کے جواب میں وہ علیکم السلام کی نشیدِ جانفزا سنتا ہے۔

جب معاشرہ کے امن اور سلامتی کی فضا میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو اسے ”فساد“ کہا جاتا ہے جو خدا کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفٰسَادَ ﴿۲۸﴾

فساد ناپسندیدہ ہے

وہ انسانوں کو تائبِ احکم دیتا ہے کہ لَا تُفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ

(۲۸) زمین میں فساد مت برپا کرو۔ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ لَا یُزِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا خَسَادًا (۲۸) ان کا مسلک دنیا میں سرکشی اور فساد برپا کرنا نہیں ہوتا۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام، امن و سلامتی کا پیامبر ہے اور دنیا میں فساد اور خلفشار کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس کا منتہائے نگاہ، دنیا سے فساد ختم کر کے، عالمگیر امن اور سلامتی کی فضا پیدا کرنا ہے۔

یہاں تک بات صاف ہے کہ ہر شخص امن اور سلامتی میں رہنا چاہتا ہے اور اسلام امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں کو امن کے ساتھ نہ رہنے دے اور معاشرہ کی سلامتی کو بگاڑنے کی کوشش کرے تو اس وقت کیا کیا جائے؟ اس کا جواب ہمارا ہر روز کا تجربہ اور طرزِ عمل دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی حرکات پر اتر آتا ہے تو سب سے پہلے اسے سمجھایا بجھایا جاتا ہے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہیں آتا تو اسے حوالہ پولیس کر دیا جاتا ہے اور جب عدالت اسے مجرم پاتی ہے، تو اسے قید کر دیا جاتا ہے تاکہ امن پسند لوگ اس کی شرانگیزی سے محفوظ رہیں۔

لیکن سرکشی کا کیا علاج؟

یہ تو ہر کسی کا انفرادی فعل۔ لیکن اگر کوئی قوم اس قسم کی حرکات کرنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج؟ عیسائیت کی مروجہ تعلیم یہ کہتی ہے کہ ایسی صورت میں چاہئے کہ اس قوم کی زیادتی کو برداشت کیا جائے۔ اس کے سامنے ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس طرح وہ خود ہی نادام اور پشیمان ہو کر اپنی زیادتی سے باز آ جائے گی۔ ایک گال پر پٹمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینا۔ جو شخص تمہارا کوٹ اتارے، اُسے واسکٹ خود اتار کر دے دینا۔ اس طرزِ عمل کو ظالم کی درازدستیوں کا علاج بتایا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے

ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جائے۔ اور عورتوں میں خنجر اور ریوا اور رکھنے کا رواج ترقی پذیر ہو۔

(ہری جی، بابت ۲۷، ۲۸)

یعنی اہمسا کے پجاری کو یہاں تک کہنا پڑا کہ مرد تو ایک طرف، عورتوں کو بھی تشدد کا استعمال کرنا چاہیے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے اسی زمانے میں کہا تھا کہ

ریشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم

عصا نہ ہو تو کیلہمی ہے کارِ بے بنیاد!

اور اُسی ریشی کے چیلے، آجکل بھارت میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ اس کے پیش کردہ فلسفہ کے بطلان کی زندہ شہادت ہے۔

قرآنِ سطحی جذبات کو اپیل کر کے دوسروں کو وقتی طور پر خوش اور مطمئن نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے حقائق کا سامنا کرتا اور ان کا عمل حل پیش کرتا ہے۔

برائی کی روک تھام بھلائی سے

اس نے سب سے پہلے تلقین کی کہ جہاں تک ہو سکے، برائی کو بھلائی سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

إِذْ نَفَخَ بِالْسَّيْتِ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا السَّيْنُ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ
وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ (۲۱)

برائی کی مداخلت نہایت حسن کارانہ انداز سے کرو۔ اس سے یہ ممکن ہے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہے وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے۔

دوسرے مقام پر اس نے مؤمنین کی صفت یہ بتائی کہ بیدِ رعونت بِالْحَسَنَةِ السَّيْنَةِ (۲۸) وہ برائی کو بھلائی سے روکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ برتاؤ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن سے ناوانستہ برائی سرزد ہو جائے اور شریفانہ طرزِ عمل ان پر اصلاحی اثر کرے۔

لیکن اگر اس سے کام نہ چلے اور جس سے شرافت کا سلوک کیا جاتا ہے وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے تو قرآن اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس کی زیادتی کی روک تھام قوت سے کی جائے لیکن اس کا خیال رکھا جائے کہ منہ جرم سے بڑھنے نہ پائے۔ اس کا ارشاد ہے۔ وَجَزَاؤُهُ

جرم کی سزا

سَبِيلَةٍ سَبِيلَةٍ مِّثْلُهَا؟ جرم کی سزا جرم کے مطابق ہونی چاہیے۔ لیکن یہاں بھی قرآن ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس موقع پر بھی دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور اگر اسے معاف کر دیا جائے تو اس کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو ایسا کرنا بہتر ہے۔ فَهَمِّنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ (۲۲) غور کیجئے! قرآن اس شخص کو بھی ظالم قرار دیتا ہے جو ایسے مجرم کو معاف نہ کرے جو اپنے کئے پر نادم ہو اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہو۔ اس سے اگلی آیت میں، اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی گئی جہاں فرمایا کہ وَلَسَمِئْنَا نَتَضَرَّعُ بِذُنُوبِهِمْ فَأَنْزَلْنَاهُ فَاؤْلَئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مَسٌّ مِنْ سَبِيلٍ ۝ جو شخص اس ظلم کا بدلہ لیتا ہے جو اس پر کیا گیا ہو، اس پر کوئی الزام نہیں۔ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔ یہ لوگ الم انگیز سزا کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد ہے۔ وَلَسَمِئْنَا صَبْرًا وَتُخَفَّرَاتٍ ذَالِكَ لِمَنْ عَزَمَ الْأُمُورَ ۝ (۲۳-۲۴) لیکن جو شخص دیکھے کہ عفو اور درگزر کر دینے سے مجرم کی اصلاح ہو سکتی ہے تو وہ اگر ہمت سے کام لے اور مجرم کو سزا سے بچالے تو یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ معاشرہ میں امن قائم رکھنے کے لئے قرآن کیا کیا اقدامات تجویز کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ

قرآنی اقدامات

- (i) دوسروں کے امن میں خلل ڈالنے والوں کو سب سے پہلے حسن سلوک سے رام کرنے کی کوشش کرو۔ ان میں اگر شرافت کا مادہ ہے تو یہ حسن سلوک ان کی اصلاح کر دے گا۔
- (ii) اگر یہ تدبیر مؤثر ثابت نہ ہو تو انہیں ان کے جرم کی سزا دی جائے، لیکن سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے۔
- (iii) اگر دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح کا امکان ہے تو اسے معاف کر دیا جائے۔
- (iv) لیکن جو لوگ ناحق ظلم اور زیادتی کریں۔ اور معاشرہ کے امن کو بگاڑیں اور ان میں اصلاح کے امکانات بھی نہ ہوں تو انہیں سزا دی جائے، یعنی ان کی زیادتی کی روک تھام کے لئے قوت کا استعمال کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں، السلام اور المؤمنین، خدا کی صفات بتائی ہیں ان کیساتھ اَلْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (۵۹/۲۳) کا بھی اضافہ کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ قیام امن و سلامتی کے لئے بعض اوقات قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

قانون کے ساتھ شمشیر کا نزول | اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تنہا قانون، امن قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے ساتھ قوت کی بھی

ضرورت ہے۔ سورہ حدید میں ہے۔ لَقَدْ اَمْرُ سَلَّمْنَا مَّا سَلَّمْنَا بِالْبَيِّنَاتِ — ہم نے اپنے رسول کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ۔ اور ان کے ساتھ ضابطہ قوانین بھی نازل کیا اور میزانِ عدل بھی لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۶/۲۵) اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فولاد بھی پیدا کیا جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور یہ لوگوں کے لئے بڑی منفعت بخش چیز ہے کیونکہ اس کی سختی سے دنیا کا امن قائم رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسالماں کبھی تو نے کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار!

اس بیت کا یہ مصرعہ اول ہے کہ جس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

جس قانون کی پشت پناہ قوت نہیں، وہ قانون وعظ و نصیحت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ قانون مؤثر ہی اس صورت میں ہوتا ہے جب اس کے ساتھ قوت نافذ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام، جو ایک نظامِ زندگی کا نام ہے، عملی شکل اختیار کرنے کے لئے ایک آزاد مملکت کا وجود ضروری سمجھتا ہے۔ اگر اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو وہ مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ اور اس مملکت کی حفاظت، وہ اپنا اولین فریضہ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے جماعتِ مؤمنین سے تاکید کیا ہے۔ وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ (۲۴/۶۰) جہاں تک بھی تمہارے بس ہیں ہو، قوت پیدا کر کے اور گھوڑوں کے رسالے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلے کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے سو اور اپنی سرحدوں کی پوری پوری حفاظت کرو تاکہ اس طرح مستعد رہ کر تم، اپنے اور نظامِ خداوندی کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو اور وہ تمہاری طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔

لیکن یہ قوت، اس مملکت کی حفاظت کے لئے ہوگی جس میں نظامِ خداوندی نے ایک عملی شکل اختیار کر کے

جان تک دے کر لوگوں کی مذہبی آزادی برقرار رہنے کا انتظام کریں۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ (۲۲/۳۹) جو جماعت، اس مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے خدا کی مددگار بنے گی، خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعت، جسے سرکش قوتوں کی روک تھام کے لئے جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے، اگر اسے غلبہ حاصل ہو گیا تو اس کا طرزِ عمل کیا ہوگا۔ کیا اس کا غلبہ بھی اس طرح کمزوروں اور ناتواؤں کو کچلنے کے لئے ہوگا۔ قطعاً نہیں۔ الَّذِينَ إِذَا مَكَتُّهُمْ فِي الْآثَرِ مِنْ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوْا

اسلامی مملکت کی غرض و غایت

الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَاللَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ممکن حاصل ہو گیا تو یہ ایسا نظام قائم کریں گے جس میں لوگ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں اور ہر شخص کو سامانِ نشوونما حاصل ہو۔ یہ ان باتوں کا حکم دیں گے جنہیں خدا کا قانون صریح قرار دے گا اور ان سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ کہے گا۔ ان کی حکومت میں ہر معاملہ کا آخری فیصلہ، قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ لہذا اس میں کسی قسم کی سرکشی اور دھاندلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسرے مقام پر کہا گیا کہ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ ۚ اَللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ۝ (۲/۲۵۱) لیکن خدا اس طرح اقوامِ عالم کو تباہ نہیں کرانا چاہتا۔ اس لئے اس نے ایسی جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اپنی جان دے کر، امنِ عالم قائم رکھیں۔

لہذا قرآنِ کریم کی رو سے، جنگ کی اجازت ان لوگوں کو دی گئی ہے جنہیں سرکش قوتیں کہیں جینے نہ دیں۔ وہ ان قوتوں سے مدافعت کے لئے جنگ کر سکتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان بچاروں میں اتنی سکت نہ ہو کہ یہ اپنی مدافعت کر سکیں تو پھر کیا ہو؟ کیا اس صورت میں انہیں ان جفا جو درندوں کے

رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ ان مظلوموں اور لاوارثوں کی مدد کی جائے، اور ان کی حفاظت

مظلوموں کی مدد کے لئے

کے لئے عند الضرورت میدانِ جنگ میں اترا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جماعتِ مومنین سے کہا جاتا ہے کہ، وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔

وَالْمُسْتَضْعِفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا۔ تم سنتے نہیں کہ کمزور اور ناتواں مرد، عورتیں، بچے، کس طرح چلا کر پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندوں نے اس قدر ظلم برپا کر رکھا ہے۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۖ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝ (۲۵) وہ فریاد کر رہے ہیں کہ ہمارے لئے کہیں سے کوئی سرپرست پیدا کر دے، کوئی مددگار بھیج دے جو ہمیں ان کے مظالم سے نجات دلائے۔ کیا ان کی فریاد تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی۔ یا تم نے سمجھ لیا ہے کہ چونکہ اب ہم محفوظ ہو گئے ہیں اس لئے ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ تمہارا مقصد زندگی، اپنی جان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ دنیا میں ہر مظلوم کی حفاظت ہے۔ ظلم کی روک تھام، تمہارا فریضہ زندگی ہے۔ اس لئے جہاں سے مظلوم کی آواز اٹھے گی، تمہیں اس کی مدد کے لئے پہنچنا ہوگا۔ یہی جنگ ”قتال فی سبیل اللہ“ اللہ کی راہ میں جنگ ہے۔ الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الظَّالِمِينَ (۲۶) جماعتِ مؤمنین، ظلم کی روک تھام کے لئے، خدا کی راہ میں جنگ کرتی ہے اور جو لوگ حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں، وہ ظلم اور سرکشی کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے یہاں جنگ کے مقاصد میں اصولی اور بنیادی فرق بتا کر یہ واضح کر دیا کہ کس مقصد کے لئے جنگ، جائز بلکہ ضروری ہو جاتی ہے اور کن مقاصد کے لئے ناجائز اور باطل۔ اگر جنگ ظلم مٹانے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لئے ہو تو جائز۔ اگر ظلم برپا کرنے کے لئے ہو تو ناجائز۔ ظلم کسے کہتے ہیں، اسے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر نہایت وضاحت سے خود ہی بیان کر دیا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی گمراہ کسی بات کو یوں ہی ظلم قرار دے کر آمادہٴ پے کار ہو جائے۔ اور اپنے آپ کو برسرِ حق قرار دے لے۔ قرآن اپنی کسی بات کو مبہم اور وضاحت طلب چھوڑتا ہی نہیں۔ لیکن یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں مختلف مواقع پر بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ اس مقام پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ جن امور کو قرآن ”بنیادی حقوقِ انسانیّت“ قرار دیتا ہے، کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو ان سے محروم کر دینا، ظلم قرار پائے گا۔ اور اس کی روک تھام جماعتِ مؤمنین کا فریضہ ہوگا، خواہ یہ ظلم کسی پر بھی کیوں نہ ہو۔ یہاں اس میں مسلم اور

غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں ہوگی۔



یہاں تک سوال، جنگ کی ضرورت، مقاصدِ جواز یا عدمِ جواز کا تھا۔ اب یہ دیکھئے کہ جنگ کی صورت میں قرآنِ جماعتِ مؤمنین پر کن شرائط کی پابندی ضروری قرار دیتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ عدل کا دامن جنگ میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جائے گا۔ دشمن سے بھی عدل

دشمن سے عدل

کیا جائے گا۔ اس کا تاکیدِ حکم ہے کہ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَلَّا تَعْدِلُوْا اَعْدِيْكُمْ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ذَاتَقُوْا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (۵) دیکھنا! کسی قوم کی تمہارے خلاف دشمنی نہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ دشمن سے بھی عدل کرو۔ یہی طرزِ عمل تقویٰ سے قریب تر ہے۔ عدل ظلم کی ضد ہے۔ لہذا جب ظلم کے معنی ہیں کسی کو انسانیّت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دینا تو عدل سے مراد ہوگی ان حقوق کی حفاظت کرنا۔ بنا بریں قرآنِ کریم کی رو سے، جنگ کی حالت میں بھی دشمن کو حقوقِ انسانیّت سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کا عام چلن یہ ہے کہ جنگ اور معاشرے میں ہر حربہ جائز ہے۔

(EVERYTHING IS FAIR IN LOVE AND WAR)

لیکن

قرآن اسے حدیثِ بے خبراں قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دینا، جنگ میں بھی جائز نہیں۔

اب آگے بڑھئے۔ جنگ ہو یا صلح، ان میں معاہدات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا امن معاہدات کے بھروسے پر قائم رہتا ہے۔ معاہدہ باہمی اعتماد کی ضمانت ہوتا ہے۔

لیکن جب اصول یہ قرار دے لیا جائے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے تو پھر معاہدات کا احترام کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے

معاہدات کی اہمیت

کہ یونان کے مشہور مفسرین، سولن نے کہا تھا کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو تو پھانس لیتا ہے، لیکن قوت والے کے سامنے پرکاش کی سی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور مغربی سیاست کا امام میکیاؤلی یہ تعلیم دیتا ہے کہ

”عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا پیمان اس کے خلاف جاتا ہے یا جن مصلحتوں

کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہیں تو اُسے بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نظر فریب دلائل بھی بہم پہنچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ فریب جس سے مقصد حاصل ہو قابلِ تعریف ہوتا ہے۔“

اور اس امام کے مقتدی، فریڈرک دوم کا قول ہے کہ

”حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسبِ موقعہ جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے اُسے اختیار کر لیا جائے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ، دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔ اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہیئے۔ اگر کبھی کسی سے معاہدہ کر بھی لیا جائے تو اُسے حسبِ مصلحت توڑ ڈالنا چاہیئے۔“

اٹلی کے میکیاؤلی سے بہت پہلے، بھارت (ہندوستان) میں ایک میکیاؤلی گزرا ہے جس کا لقب ہی کوٹلیہ (KAUTILYA) — یعنی فریب کار — ہے۔ وہ اپنی کتاب، ارتھ شاستر میں لکھتا ہے کہ

”معاہدات کو وقتی مصلحتوں کے تابع رہنا چاہیئے اور عند الضرورت ان سے بلا توقف پھر جانا چاہیئے۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے کرنا چاہیئے کہ اپنوں اور بے گانوں میں سے کسی کو تمہاری خیال کا علم نہ ہونے پائے۔“

ان سب کے برعکس، قرآنِ کریم نے معاہدات کی پابندی پر جس قدر زور دیا ہے، اس پر اس کا ایک ایک متعلقہ مقام شاہد ہے۔ اس نے اصولی تاکید کی کہ **اَوْفُوا بِالْحُقُودِ** (۱۱۷) عہد و پیمان کی پوری پوری پابندی کرو۔ دوسرے مقام پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ معاہدہ کرنے کے بعد تم ایفائے عہد کے لئے صرف اس پارٹی کے سامنے جواب دہ ہو جس کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہے۔ تم اس کے لئے اپنے خدا کے سامنے بھی جواب دہ ہو۔ **اَوْفُوا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا۔** (۱۱۷) عہد کی پابندی کرو۔ یاد رکھو! تم سے عہد و پیمان کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قرآن کے ان تاکیدِ احکام کی روشنی میں، جماعتِ مؤمنین کی طرف سے، معاہدات میں خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر

فریقِ مخالف خیانت پر اتر آئے تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب عام طور پر یہی دیا جائے گا کہ پھر تم بھی اسی قسم کا طرزِ عمل اختیار کرو۔ لیکن قرآن کی یہ تعلیم نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ **وَمَا تَخَافَتُمْ** قَوْمِ خِيَانَةٍ۔ اگر تمہیں کسی پارٹی کی طرف سے عہد شکنی کا خطرہ ہو تو تم انہیں اطلاع دے بغیر، بونہی معاہدہ کا عدم نہ کر ڈالو۔ **فَاَتَكِيدُ اِلَيْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ**۔ تم انہیں اس کی اطلاع دے کر معاہدہ ختم کرو اور اس طرح دونوں فریق برابر کی سطح پر آجاؤ۔ **عَلٰی سَوَآءٍ** کے یہ معنی بھی ہیں کہ اگر اس طرح یک لخت معاہدہ توڑنے سے انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہو تو اس کی تلافی کر کے ان سے مساوات کا سلوک کرو۔ اس لئے کہ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ** (۵۸) اللہ معاہدات میں خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ہماری تاریخ کے اس عہدِ ہمایوں میں جب قرآن نظامِ قائم تھا، کسی بین الاقوامی معاہدہ میں خیانت کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اُس زمانے میں، انفرادی عہد و پیمان کا بھی کس حد تک احترام کیا جاتا تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ بدر کے میدان میں حالت یہ تھی کہ ادھر تین سو تیرہ قریب قریب نہتے اور بے سازد براق مجاہدین کی صفِ مقابل میں قریش کا جٹ غفیر۔ اتنے میں دیکھا کہ دو صحابیؓ کہیں سے دوڑے دوڑے آئے اور مجاہدین کی صفوں میں شریک ہو گئے۔ اس وقت حالات ایسے نازک تھے کہ اسلامی لشکر میں ایک سپاہی کا اضافہ بھی موجب تقویت تھا۔ مجاہدین کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آئے تھے۔ راستے میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کے لئے جا رہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ میدانِ جنگ تک پہنچ سکے ہیں۔ حضورؐ نے سنا تو فرمایا جب تم نے ان سے جنگ میں عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ فکر نہ کرو۔ ہماری اللہ مدد کرے گا۔

یہ تو پھر بھی ایسے عہد کی پابندی ہے جو بہ حالاتِ مجبوری ہی سہی، مخالفین سے کر لیا گیا تھا۔ قرآنِ کریم اس باب میں اس سے بھی دو قدم آگے جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ بعض عورتیں مسلمان ہو گئیں، لیکن ان کے خاوند ہنوز غیر مسلم تھے۔ ان کفار کی طرف سے ان مسلمان بیویوں پر

جو مظالم ہوتے ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ یہ عورتیں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینے میں آجاتی تھیں۔ اور اس طرح ان کے مظالم سے چھٹکارا حاصل کر لیتی تھیں۔ ان عورتوں کے متعلق قرآن نے کہا کہ انہیں واپس نہ بھیجیے کیونکہ ان حالات میں، ان مسلم عورتوں کا ان کفار کے نکاح میں رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اَلَّذُوْهُمْ مَّا اَنْفَقُوْا۔ (نہ) انہوں نے ان کے نکاح پر جو کچھ خرچ کیا تھا وہ انہیں ادا کر دو۔ غور کیجئے کہ آپ کو ایفاءئے عہد اور عدل و انصاف کی آل قسم کی مثالیں کہیں اور بھی ملتی ہیں؟

صلح اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے، جس قوم سے جنگ چھڑ جائے، اس جنگ کو کب تک جاری رکھا جائے؟ قرآن نے کہا ہے کہ وَ اِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ فَاَجْبَحْ لَهُمْ (۴)۔ فریقِ مخالف جس وقت بھی صلح کی طرف جھکے، تم اس کی طرف جھک جاؤ۔ اس وقت یہ نہ کہو کہ ہماری فتح ہونے لگی تھی تو دشمن نے صلح کی درخواست پیش کر دی۔ اب ہم صلح کیوں کریں۔ ہم انہیں مفتوح و مغلوب بنائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اندازِ نگاہ غلط ہے۔ جنگ سے تمہارا مقصد نہ مالِ غنیمت تھا نہ کشور کشائی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ سرکش قوتیں اپنی سرکشی سے باز آجائیں۔ سودہ جس وقت بھی سرکشی چھوڑ کر قانون کے سامنے جھک جائیں، تمہارا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد جنگ جاری رکھنے کے معنی کیا ہیں؟ وَ اِنْ يُّرِيدُوْا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (۵) اگر بفرضِ محال، وہ صلح کی درخواست کی آڑ میں تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہوں تو تمہیں پھر بھی گھبرانا نہیں چاہیئے۔ قانونِ خداوندی تمہاری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ تم اپنی طرف سے پوری پوری احتیاطی تدابیر اختیار کر دو، لیکن ان کی صلح کی درخواست کو اس بدگمانی کے ماتحت مسترد نہ کر دو کہ وہ اس باب میں نیک نیتی سے کام نہیں لے رہے۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کے لئے آمادہ نہ ہوں تو جنگ کب تک جاری رکھی جائے۔ اس کے لئے کہہ دیا کہ وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنُوْا فِئْسَةً (۶) جب تمہیں یقین ہو

جائے کہ وہ فتنہ فروز ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ جنگ کی گئی تھی تو جنگ ختم کر دو۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، جنگ سے مقصد فتنہ ختم کرنا تھا۔ لفظ فتنہ کے اندر ہر قسم کی سرکشی، استبداد، جور و ستم، مذہب

کے معاملہ میں سختی اور زبردستی سب آجاتے ہیں۔

یہ تو رہا صلح کی صورت میں، یا فتنہ فرو ہو جانے کی شکل میں جنگ کا اختتام۔ لیکن قرآن کریم، جنگ کے دوران امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ جب نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو وجد میں آجاتی ہے۔ جنگ اسی صورت میں جاری رکھی جاسکتی ہے کہ فریقین اپنی

جنگ کا التوا

اپنی قوم اور سپاہیوں کے دل میں، فریقِ مخالف کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات برابر مشتعل کرتے رہیں۔ اگر کسی جنگ میں وقفہ پیدا کر دیا جائے تو جذبات کا یہ اشتعال مدھم پڑ جاتا اور پھر ختم ہی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اس آگ کو بھڑکانا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے ہمارے زمانہ میں متارکہ (یا (CEASE FIRE) کا طریق وضع کیا گیا ہے لیکن قرآن کریم نے، آج سے بہت پہلے، متارکہ کے اصول کو قوانینِ جنگ کے ضابطہ میں داخل کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ بین الاقوامی معاہدہ کی رو سے یہ طے کر لینا چاہیے کہ، سال میں کچھ مہینے ایسے رکھے جائیں گے جن میں جنگ بھر حالِ ملتوی کر دینی ہوگی، خواہ وہ کہیں بھی ہو رہی ہو۔ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (۹۴) سال کے بارہ مہینوں میں چار ایسے ہیں جن میں لڑائی یکسر بند رہے گی۔ ظاہر ہے کہ جب سال میں کچھ وقت کے لئے لڑائی بھر حالِ بند ہوگی تو جذباتِ منافرت و عداوت کی آگ کی شعلہ زنی خود بخود ماند پڑ جائے گی اور یہ فضا قیامِ امن و صلح کے لئے بڑی سازگار ہوگی۔

جنگ کے قیدی

جنگ کے سلسلے میں ایک اہم سوال جنگ کے قیدیوں کا ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ روش، زمانہِ قدیم سے چلی آرہی تھی کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت عربوں میں یہی رواج تھا۔ چنانچہ ان کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیاں عام ملتی تھیں اور اسے ذرا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے آکر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ کسی انسان کو غلام بنا لینا اسے حقِ انسانیت سے محروم کر دینا ہے جو بہت بڑا جرم ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ قَدْ اَلْقَيْتُمْ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِىْ صُرُوْبِ الرِّقَابِ۔ جب مخالفین سے تمہارا مقابلہ ہو، تو جیسا کہ جنگ میں ہوتا ہے ان کی سرکوبی کرو۔ حَتّٰى اِذَا اَخَذْتُمُوْهُمْ فَتَشْدُوْا اَلْوَشَاقِ۔ پھر جب وہ مغلوب ہو جائیں تو انہیں قید کرو۔ قِيَامًا مِّنْ اَبْعَدُ وَاِمَّا فِدَاءً۔ (۹۵) اس کے بعد یا تو انہیں بطور احسان چھوڑ دو اور یا فدیہ لے کر۔ آپ دیکھئے کہ بات کس قدر صاف ہے۔

جنگ کے قیدیوں کو آزاد کرنا ہوگا۔ اگر تمہارے قیدی دشمن کے ہاں ہیں تو ان کے مبادلہ میں انہیں رہا کر دو۔
 بہر حال انہیں آزاد کرنا ہے۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اس میں آپ
 دیکھئے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنالینے کا اشارہ تک نہیں اور ایسا ہو بھی کس طرح سکتا تھا۔ وہ قرآن جو قُلُّ
 رَقَبَةٍ (۹۱۱) یعنی غلاموں کو آزاد کرانے کو، جماعتِ مومنین کا فریضہ قرار دیتا ہے، جو جنگ کی ضرورت ہی
 اس لئے قرار دیتا ہے کہ جن لوگوں کو حقوقِ انسانیت سے محروم کر دیا گیا ہے انہیں وہ حقوق واپس دلانے
 جائیں، جو واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا غلام
 اور محکوم بنائے۔ کیا وہ قرآن اس کا حکم دے گا کہ جنگ میں قید ہونے والے انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنا
 کر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح بیچا جائے! سُبْحَانَ اللَّهِ تَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ (۲۸۵)۔ جب تک جنگ
 کے قیدی نظامِ اسلامی کی تحویل میں رہیں گے ان کی حیثیت سرکاری مہانوں کی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ قیدی
 ہو کر بھی انسان تو رہتے ہیں۔ اس لئے انہیں حقوقِ انسانیت سے کسی صورت میں بھی محروم نہیں کیا
 جاسکتا۔ اس دوران میں ان سے کس قسم کا سلوک ہوگا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنگ بدر
 کے قیدیوں میں ایک شخص ابو عزیٰز تھا۔ اس کا بیان ہے کہ میں جس انصاری کے گھر میں بطور مہمان رکھا گیا
 تھا ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح شام کھانا لاتے تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گزارہ
 کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا۔ لیکن وہ اسے ہاتھ نہ لگاتے اور زبردستی
 مجھے کھلا دیتے۔

انہی قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے، عام مجمعوں میں، نبی اکرم
 کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ اس شخص کے سامنے کے دو دانت اکھڑا دیئے جائیں تاکہ
 یہ آئندہ تقریر کرنے کے قابل نہ رہے۔ لیکن حضور نے اس کی اجازت نہ دی۔

جنگ بدر کے قیدیوں کو زبردیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جو ناداری کی وجہ سے زبردیہ دے نہ سکے،
 ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں۔ یہی ان کا فدیہ ہو جائے گا۔ جو ایسا بھی نہیں کر
 سکتے تھے انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔ جن سے زبردیہ لیا گیا تھا ان سے بھی جاتے وقت کہہ دیا گیا کہ اِنَّ يَّعْلَمُ
 اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا اَوْ يُّؤْتِيْكُمْ خَيْرًا مِّمَّا اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (۱) اگر اس
 کے بعد اس مملکت کے متعلق تمہارے دل میں خیر سگالی کے جذبات پائے گئے، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے تمہیں اس

یاد رکھو کہ یہ قرآن ہی ہے جو انہیں آزاد کرے گا

سے بہتر واپس دیا جائے گا اور تمہاری حفاظت کا سامان بھی کر دیا جائے گا۔

”غلامی اور اسلام“ ایک متنقل موضوع ہے جس پر تفصیل سے گفتگو کسی دوسرے وقت کی جا سکے گی۔ اس مقام پر ضمناً اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں (مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ) کے ضمن میں جس قدر احکام اور ہدایات ہیں، وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام احکام ماضی کے صیغے (PAST

TENSE) میں ہیں۔ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ۔ یعنی جو اس سے پہلے غلام بنائے جا چکے ہیں۔

یہ نہیں کہا گیا کہ جنہیں تم اس کے بعد غلام بناؤ ان کے متعلق یہ احکام ہیں۔ قرآن نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو جو اس وقت اس معاشرہ میں موجود تھے، آہستہ آہستہ آزاد کر دیا۔ یا انہیں مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا۔ اور اس کے بعد غلامی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ لیکن اس بدقسمتی کا کیا علاج کہ ہمارے اربابِ مذہب، اب بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں اسلام میں دشمن کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کی اجازت ہے اور اگر اب بھی پاکستان کی جنگ کسی اور ملک سے ہوئی تو ہم ان کے مردوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ

”حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہ کر دے، چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں“

(تفہیم القرآن، اذوالاعلیٰ سہود دی صاحب، جلد اول صفحہ ۳۴)

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمنع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو، بہر حال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصے میں جو آئیں وہ ان سے تمنع کر سکتے ہیں“ (ایضاً۔ صفحہ ۳۴)

یعنی نکاح تو صرف مسلمان عورتوں سے یا اہل کتاب کی عورتوں سے ہو سکتا ہے، کفار اور مشرکین کی عورتوں سے نکاح نہیں ہو سکتا لیکن جنگ میں گرفتار شدہ لونڈیوں کے لئے یہ بھی شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب سے ہوں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں :-

”جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔“

حتیٰ کہ جن لوگوں کے حصے میں یہ لونڈیاں آئیں گی؟ انہیں اس کا بھی اختیار ہوگا کہ استعمال کرنے کے بعد انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ چنانچہ اس باب میں تحریر ہے کہ اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ (تفہیمات، حصہ دوم، ص ۲۲۳)

یہ ہے جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں اور ان کی خورتوں کے ساتھ وہ سلوک جسے یہ حضرات، اسلام کا منشاء اور حکم قرار دے کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ بات ضمناً سامنے آگئی تھی۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن نے حکم یہ دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا توفدیہ لے کر رہا کر دو اور یا بطور احسان۔

یہ قرآن لوگوں کے متعلق ہے جو مغلوب و مفتوح ہو کر گرفتار ہو جائیں۔ لیکن جو لوگ مسلمانوں کی پناہ میں آنا چاہیں، ان کے متعلق قرآن کا فیصلہ اُن کی کشادہ نگہی کی زندہ شہادت ہے۔ آج کل ایک نئی ٹیکنیک رائج ہوئی ہے جسے (BRAIN WASHING)

پناہ میں آنے والے

کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو شخص تمہارے قابو آ جائے۔ خواہ وہ تمہارے اپنے لوگوں میں سے ہو اور اس کے خلاف کوئی بدگمانی ہو، یا دشمن کا کوئی آدمی۔ اُسے دردناک عذاب کی بھٹیوں میں سے اس طرح گزارو کہ اس کے تمام سابقہ خیالات اس کے دماغ سے محو ہو جائیں اور وہ اس طرح سوچنے لگ جائے جس طرح تم چاہو۔ اسی کے برعکس دیکھئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ۔

وا تفصیل ان امور کی ادارہ مطبوعہ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ”قتلِ زندہ اور غلام اور بوڑھیاں“ میں ملے گی۔

اور اگر مخالفین (مشرکین) میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اسے اپنے ہاں پناہ دو۔ پھر اسے قرآن سناؤ۔ اگر قرآن کی تعلیم اسے اپیل کرے اور وہ دل کے کامل اطمینان اور سکون کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہے تو خیر۔ لیکن اگر وہ اس کے بعد چلے جانا چاہے تو اسے روکو نہیں بلکہ اَبْلِغْهُ مَا مَنَّا۔ اسے اپنی حفاظت میں، اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ ذَالِكَ بِأَنَّهُمْ حَتَمُوا رَأْسَهُمْ عَلٰٓی غُلُوٍّ (۹) اس لئے کہ یہ لوگ جاہل ہیں جانتے نہیں کہ قرآن انہیں کیا مقام دینا چاہتا ہے۔ لیکن قرآن کسی سے زبردستی نہیں منوایا جاتا۔ اس لئے اگر بطیب خاطر قرآن کو ماننا نہیں چاہتے تو انہیں اپنی حفاظت میں اسکے مامن تک پہنچا دو۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن کریم کی تعلیم کس قدر بلند اور انسانیت ساز ہے۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا قرآن کریم جنگ کو انسان کی تمدنی زندگی کے لئے لاینفک قرار دیتا ہے یا ایسے معاشرہ کا بھی تصور دیتا ہے جس میں جنگ کا امکان نہ رہے۔ وہ ایسے معاشرہ کا تصور دیتا ہے۔ جو آیت اوپر درج کی گئی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ جب تمہیں خن کی مدافعت کے لئے میدانِ جنگ میں نکلنا پڑے تو دشمن کی سرکوبی کرو۔ اور جب ان کی طاقت ٹوٹ جائے تو بَقِیَّةَ السَّیْفِ کو قید کر لو اور قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہے۔ حَتّٰی تَصْنَعَ الْحَرْبَ اَدْنٰی اَرْهَآ۔ (۴۷) تا آنکہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے، دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ قرآن جس جتنی معاشرہ کا تصور پیش کرتا ہے اس میں ہر طرف سے سلاماً سلاماً کی زندگی بخش اور امن افروز صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس میں ہر انسان، دوسرے انسان کی سلامتی کا آرزو مند ہوتا ہے۔ وہ ایسی انسانیت ساز فضا کس طرح پیدا کرتا ہے جس میں بد امنی کا خدشہ تک نہ ہو یہ ایک الگ موضوع ہے جو تفصیل چاہتا

جنگ کا خاتمہ

طہ قرآن تو پناہ گزینِ مشرک کے متعلق یہ حکم دیتا ہے کہ اگر وہ قرآن سننے کے بعد اسے برضا و رغبت تسلیم نہ کرنا چاہے تو اسے کچھ نہ کہو۔ اسے اپنی حفاظت میں اس کے ہاں پہنچا دو۔ اس کے برعکس ہمارے اربابِ شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان ان باتوں سے مطمئن نہ ہو جنہیں وہ اسلام کہہ کر منوانا چاہتے ہیں اور اس لئے وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

ہے۔ اسے ہم کسی دوسرے وقت پراٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ وہ ان غیر فطری حدود و خطوط کو مٹا کر جن کی بنا پر انسان مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ رہا ہے تمام انسانوں کی ایک عالمگیر برادری متشکل کر دینا چاہتا ہے۔ اور اس کی بنیاد ایک مشترکہ آئیڈیالوجی قرار دیتا ہے جسے دنیا کا ہر انسان علی وجہ البصیرت اختیار کرے۔ جب تک ایسی فضا پیدا نہ ہو وہ ان سرکش قوتوں کے مقابلے کے لئے جو دوسروں پر ظلم کریں، جنگ کو ناگزیر قرار دیتا ہے۔ — خواہ یہ ظلم بجا عت مومنین کے خلاف ہو یا دنیا کے کسی اور انسان یا انسانوں کے گروہ کے خلاف — قرآنی نقطہ نگاہ سے جنگ کا مقصود، دنیا سے ظلم مٹا کر اس کی جگہ نظامِ عدل و احسان قائم کرنا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ترمذی کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے حق کے سامنے جھکا دیا جائے۔ اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص بہادری کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص ذاتی انتقام کے لئے لڑتا ہے، ان میں سے کس کا جہاد صحیح ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ

مَنْ قَاتَلَ لِيَتَكُونَ كَلِمَةً لِلَّهِ هِيَ الْعُلْيَا قَهْوًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

جو اس لئے لڑتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون غالب رہے، اس کی جنگ، اللہ کی راہ میں ہے۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین صرف اپنے گروہ کے مفاد کا تحفظ کرتے ہیں اور چونکہ انسان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے باہمی مفاد میں تصادم ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ خدا، رب العالمین — تمام انسانوں کا یکساں نشوونما دینے والا ہے۔ اس لئے اس کے عطا کردہ قوانین کی رو سے تمام انسانوں کے مفاد کا تحفظ ہو جاتا ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر امنِ عالم کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اس بنیاد کو توحید کہا جاتا ہے۔ — یعنی تمام انسانوں پر ایک خدا کے قوانین کا اقتدار — جو نظام اس بنیاد پر متشکل ہوتا ہے اسے قرآنِ کریم دین کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی تمام انسانوں کے لئے ایک نظامِ زندگی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احسان اب زمرہ رفتہ خود مغرب کے مفکرین کو بھی ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً پروفیسر الفریڈ کوہن اپنی کتاب

میں، عمر حاضر کے ہم گیر اضطراب پر تفصیل

(THE CRISES OF CIVILIZATION)

بحث کرنے کے بعد، آخر میں لکھتا ہے کہ

”دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آرہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔“

مسٹر ایمری ریوز (EMREY REVES) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

”کھلے کھلے الفاظ میں بیسویں صدی کی قیامت خیز لوگوں کے بعد انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح

جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے، ان بنیادی اصولوں کا اعلان

کرنا چاہیے جن پر یہ اقتدار قائم ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیے

(ANATOMY OF PEACE)

تاکہ یہ مقصود خوں ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔“

یہ خیال اب دنیا کے چیدہ چیدہ مفکرین تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ

مسٹر (W.A. GAULD) اپنی کتاب (MAN, NATURE AND TIME) میں

لکھتا ہے :-

”مجھے تسلیم ہے کہ ”گھر اور وطن“ کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے، لیکن ایک عالمگیر

انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی تک اس

قسم کے عالمگیر نظام کا احساس کچھ زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ اس لئے اس کے

متعلق زیادہ حسِ وطن قبل از وقت ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت کہ کم و بیش ہر ملک میں ایسے افراد موجود

ہیں جن کے دل میں یہ خیال کر دہیں لے رہا ہے، اس امر کی ضمانت ہے کہ کچھ وقت کے بعد یہ

خیال عملی شکل اختیار کرے گا۔“

اگر اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا تو اس کی فتمہ دار (فلہذا)

انسانیت کی بارگاہ میں مجرم (وہ قوم ہے جسے اس عالم گیر نظام کا تصور، آج سے چودہ سو سال پہلے دیا

گیا تھا قرآن نے اس زمانے میں کہا تھا کہ کات الناس اُمَّةٌ وَاحِدَةٌ (۲/۲۱۳) انسانی معاشرہ کی

آخری شکل یہی ہونی ہے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری بن جائیں۔ اس کے علاوہ دنیا میں امن و سلامتی

کی کوئی صورت نہیں۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے تمام نوعِ انسان کے لئے دین — یعنی نظامِ زندگی —

بھی ایک تجویز کیا گیا۔ قرآن سے پہلے مختلف انبیاء کرامؑ..... خاص قوموں کی طرف آتے تھے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہوا کہ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ تَرٰ سُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ (۱۵۸) ان سے کہہ دو کہ میں تمام نوع انسان کی طرف رسول ہوں۔ یہی وہ بنیاد ہے، جس پر انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ خود قرآن کریم کے متعلق بھی کہا گیا کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۤءَ تَكْمُمُ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَبِّكَ تَرٰ بِكُمْ وَشِفَاءً لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ (۱۵۹) اے ساری دنیا کے انسانوں! تمہارے پاس خدا کی طرف سے ایک مضابطہ و حیات آگیا ہے جس میں تمہاری تمام الجھنوں کا علاج ہے۔ انسانی مشکلات کا علاج ہی یہ ہے کہ تمام انسان ایک برادری کی شکل میں زندگی بسر کریں۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان سب کا مضابطہ قوانین ایک ہو۔ یہ تقاضہ تصورِ حیات جو امت مسلمہ کو چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا، لیکن اس نے اس تصور کو اس طرح پس پشت ڈال رکھا ہے کہ آج جبکہ دنیا کی دیگر اقوام کے دل میں یہ خیال، کسی نہ کسی انداز سے، کروٹیں لے رہا ہے، یہ اس سے اس طرح بے بہرہ ہے گویا اس کی آواز تک کبھی اس کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔ لیکن قرآن کے ان تصورات پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری نظروں سے اٹھائی جائے کہ کوئی دوسرا ان میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ تو سورج کی روشنی کی طرح، فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس کا جی چاہے ان سے بہرہ یاب ہو جائے۔

ہست این میکده و دعوتِ عام است این جا

قسمتِ بادہ باندازہ جام است این جا!

پاکستان کا خطہ زمین اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہ اس عالمگیر نظام انسانیت کا اولین گہوارہ بنے اور یہاں سے اس شجرِ طیب کی شاخیں پھوٹیں جو دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں پر امن و سلامتی کا سایہ کریں۔ یہی وہ نظام تھا جس کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ مَنْ دَخَلَهُ كَانَ

اِمْنًا (۱۶۰) جو اس میں داخل ہو گیا اُسے امن نصیب ہو جائے گا۔

اور جس کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (۱۶۱) یہ انسانیت کے قیام کا باعث ہے۔ یہی وہ امنِ عالم کی ضمانت دینے والا نظام ہے کہ اگر سرکش قوتیں، عالمگیر مفادِ انسانیت کے خلاف، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر، اس کے قیام کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جائیں تو انہیں راستے سے ہٹایا جائے اور اس کے لئے اگر جنگ ناگزیر ہو تو اُسے اسی طرح روا رکھا جائے جس طرح ڈاکٹر ایسی انگلی کو مجبوراً کاٹ ڈالتا ہے جس کا

ناسور لا علاج ہو چکا ہو اور جس کا زہر سارے جسم میں سرایت کئے جا رہا ہو۔ قرآن، قوت کے استعمال کی اسی مقصد کے لئے اجازت دیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

تاریخِ احم کا یہ پیامِ ازلی ہے صاحبِ نظر! نشہٴ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمین گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لا دیں ہو تو ہے زہرِ ملاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو زہرِ کاتریاک

”دین کی حفاظت“ سے مراد ہی عالمگیر انسانیت کے نظامِ امن و سلامتی کی حفاظت ہے۔ اسلام میں اسی مقصد کے لئے جنگ کی اجازت ہے۔ جو جنگ، استبداد اور جورِ الارض کی تسکین کے لئے کی جائے، وہ جنگ حرام ہے۔

صلح شر گرد و چو مقصود است غیر گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر

گر نہ گرد و حق ز تیغِ مابلند!!

جنگ باشد قومِ رانا ارجمند (اقبالؒ)

(۱۹۶۳ء)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بنیادی حقوقِ انسانیت

اور

قرآن

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۳ء)

علمائے حیاتیات اور علم النفس، اس پر متفق ہیں کہ تحفظِ خویش (SELF-PRESERVATION) کا جذبہ، ہر ذی حیات میں جبلی طور پر پایا جاتا ہے۔ بیکہ یوں کہئے کہ جبلّی جذبات میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی جذبہ کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی ہر متاعِ عزیز کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ جب انسانوں نے مل جل کر قدرتی زندگی بسر کرنی شروع کی تو ان کے مفاد میں تصادم ہونے لگا۔ اس سے افراد نے محسوس کیا کہ انفرادی زندگی بسر کرتے ان کی وہ چیزیں محفوظ نہیں رہ سکتیں، جنہیں وہ اپنی متاعِ عزیز اور سرمایہ گراں بہا سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے اجتماعی نظم و نسق کا تصور وضع کیا، جسے اب حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظمِ اجتماعی کا مقصد اولیں یہ تھا کہ افراد کی وہ چیزیں محفوظ رہیں جنہیں وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔

حکومت کی بنیاد تو اس مقصد کے ماتحت رکھی گئی تھی، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ حکمران طبقہ کے ہاتھوں لوگوں کا کوئی حق بھی محفوظ نہیں رہا۔ اس طبقہ نے تقسیم یوں کی کہ حقوق

سب کے سب اربابِ حکومت کے ہیں اور ذمہ داریاں تمام کی تمام رعایا کی۔ لوگ اس تقسیم کو گوارا نہ کرتے۔
 لیکن مذہبی پیشوائیت آگے بڑھی اور یہ کہہ کر عوام کو اس تقسیم
 کے سامنے جھکا دیا کہ راجہ ایشور کا اوتار ہوتا ہے۔ بادشاہِ خدائی

حقوقِ طبقہ حکمران کے

حقوق (DIVINE RIGHTS) کا حامل ہوتا ہے۔ سلطان، زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ اس
 لئے فرمانروائی اس کا حق اور اطاعت گزاری تمہارا فریضہ ہے۔ وہ جو کچھ تمہیں دے اس کی عنایت اور احسان
 ہے۔ تم اس سے بطورِ حق کچھ نہیں مانگ سکتے۔ تم اس کے حضور جھکو۔ اسے سجدے کرو۔ اس کی خیریت کی
 دعائیں مانگو۔ اس کے ہر حکم کی اطاعت کرو اور اس اطاعت کو اپنے لئے سرمایہٴ ہزار سعادت سمجھو۔ تم اور جو کچھ
 تمہارا ہے وہ اُس سب کا مالک ہے۔ اسے ان تمام چیزوں پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ وہ تمہارا آن دانا (رزاق) اور
 پالنہار (پروردگار) ہے۔ تم اس سے خیرات مانگ سکتے ہو، کوئی شے بطورِ حق کے طلب نہیں کر سکتے۔

حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کا یہ تصور اسی طرح چلا آ رہا تھا کہ ستر سوئیں صدی عیسوی میں یورپ کے
 سیاسی نظریات میں ایک انقلاب آ گیا جس کی رُو سے اس نطق کو از سر نو متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہا یہ گیا
 کہ ان دونوں (فریقوں) کا تعلق، ایک معاہدہ کی رُو سے متعین ہونا چاہیے۔ اسے نظریہٴ میثاق
 (CONTRACT THEORY) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ

- (۱) تمدنی زندگی بسر کرنے سے پہلے انسان فطری حالت پر تھا۔
- (۲) اس فطری حالت میں انسان کے کچھ حقوق تھے، جنہیں ہنوز کسی نے غصب نہیں کیا تھا۔
- (۳) جب انسان کو اپنے فطری حقوق کے تحفظ کے متعلق خطرہ لاحق ہوا تو اس نے معاشرتی زندگی اختیار
 کی۔ لہذا، معاشرہ (سوسائٹی) کا وجود انسان کے فطری حقوق کے تحفظ کے جذبہ کار میں منت ہے۔
- (۴) تاہم، معاشرہ کا فریضہ ہے کہ انسان کے فطری حقوق کا تحفظ کرے۔

(۵) ان فطری حقوق کا نام ہے ”بنیادی حقوقِ انسانیت“

اس نظریہ کا اولین داعی، یورپ کا مشہور مفکر ہابز

تھا۔ وہ کہتا

(HOBBS-1588-1679)

مغربی مفکرین کے نظریات

ہے کہ اپنے حکم کو دوسروں سے منوانا، انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ”قیامِ امن“
 بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں یک جا نہیں رہ سکتیں۔ جب ہر فرد اپنا حکم،

دوسروں سے متوازن پرتل جائے تو امن کہاں باقی رہ سکتا ہے؟ لہذا انسان کو اس دوسرے مقصد کے حصول کے لئے اپنے پہلے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ بنا بریں، ہائز کے نزدیک، قیام امن انسان کا واحد بنیادی حق ہے جس کے لئے وہ اپنے دیگر حقوق سے دستکش ہو جاتا ہے۔

نظریۂ میثاق کا دوسرا علمبردار لاک (LOCKE-1632-1704) ہے۔ اس کے نزدیک،

انسان کے بنیادی حقوق، ”زندگی، صحت، آزادی اور املاک ہیں۔“ ان کے تحفظ کے لئے انسان صرف اپنا ایک حق چھوڑتا ہے اور وہ ہے تننازعہ فیہ معاملات میں خود فیصلہ کرنے کا حق۔ لاک کہتا ہے کہ افراد کو چاہئے کہ اپنے اس حق کو معاشرہ کے سپرد کر دیں۔ اور اس کے بعد معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ افراد کے دیگر حقوق کا تحفظ کرے۔

چونکہ ہائز اور لاک کے ہاں، بنیادی حقوق کا تصور، ان کے نظریۂ میثاق کی ایک ذیلی شق کے طور پر آتا ہے اس لئے یہ چنداں واضح اور متعین نہیں۔ اسے ایک جداگانہ اور مستقل نظریۂ کی حیثیت سے

(RIGHTS OF MAN)

نے پیش کیا جس کی کتاب

(TOM PAINE-1737-1809)

آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس نے زندگی، آزادی، املاک، حفاظت اور استبداد کی روک تھام کو بنیادی حقوق انسانیت قرار دیا ہے۔ یہی تھے وہ حقوق جنہیں انقلابِ فرانس کے بعد، فرانس کی نیشنل اسمبلی نے اپنے چارٹر میں درج کیا تھا۔ امریکہ کا منشور آزادی (۱۷۷۶ء) بھی پہن ہی کے فطری حقوق کے نظریۂ پر مبنی تھا۔ اس میں زندگی اور آزادی کے ساتھ حصولِ مسرت کو بھی بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں روس کی کانگریس نے مزدوروں اور کسانوں کے سلسلہ میں بنیادی حقوق کا ایک منشور مرتب کیا جس میں کہا گیا کہ اس منشور سے مقصود یہ ہے کہ ایک انسان، کسی دوسرے انسان کو نہ لوٹ سکے، معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے اور تمام ممالکِ عالم میں معاشرہ کی تشکیل اشتراکِ خطوط پر کی جائے۔“

(HUMAN RIGHTS COMMISSION)

کچھ عرصہ پہلے اقوامِ متحدہ (U.N.O.) نے

مجلسِ اقوامِ متحدہ کے نام سے ایک تحقیقاتی بورڈ قائم کیا تھا کہ وہ تحقیق کے بعد سفارشات کرے کہ انسانیت کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ ان سفارشات کو اقوامِ عالم کی نمائندہ جماعت نے خود جانچا اور پرکھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں وہ چارٹر شائع کیا۔ جسے ”منشورِ حقوقِ

(U.N.O.)

انسانیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی اس کوشش کو، اس وقت تک، اس باب میں حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ جو حقوق اس چارٹر میں درج ہیں وہ مختصر الفاظ میں حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور بنیادی حقوق کے یکساں حق دار ہیں۔

۲۔ زندگی، آزادی اور حفاظتِ جان کا حق۔

۳۔ غلامی کی ممانعت۔

۴۔ بے رحمی کے سلوک سے حفاظت کا حق۔

۵۔ قانون کے معاملہ میں یکساں سلوک کا حق۔

۶۔ کسی شخص کو بلا قصور گرفتار نہیں کیا جائے گا، نہ نظر بند یا جلا وطن کیا جائے گا۔

۷۔ جب تک الزام ثابت نہ ہو، ملزم کو بے قصور تصور کئے جانے کا حق۔

۸۔ مسائلِ زندگی اور خط و کتابت میں عدم مداخلت کا حق۔

۹۔ نقل و حرکت کی آزادی۔

۱۰۔ ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں بسنے کی آزادی۔

۱۱۔ حقِ قومیت۔

۱۲۔ شادی کا حق۔

۱۳۔ حقوقِ جائیداد۔

۱۴۔ خیالات، ضمیر اور مذہب کی آزادی، نیز اظہارِ خیالات اور اجتماعات میں شرکت کی آزادی۔

۱۵۔ اپنے ملک کی حکومت میں شرکت کا حق۔

۱۶۔ تعمیرِ خویش کے لئے وسائل و ذرائع کی آزادی۔

۱۷۔ حسبِ منشاء کام کا حق کی آزادی۔

۱۸۔ آرام اور فرصت کی آزادی، نیز معیارِ زندگی اور تعلیم کا حق۔

۱۹۔ جماعتی اور ثقافتی زندگی میں شرکت کا حق۔

یہ ہے مختصر اُن حقوق کی فہرست جسے اقوامِ عالم کے نمائندگان نے اپنے مسئلہ چارٹر میں داخل کر رکھا ہے۔

ان حقوق سے کن شرائط کے ماتحت بہرہ یاب ہوا جاسکتا ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر کیا جائے گا۔ بہرِست

اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ اس فہرست کے بعد چارٹر میں یہ تحریر ہے کہ ان حقوق اور اختیارات کو ان حدود کے تابع استعمال کیا جاسکتا ہے، جو مختلف ممالک میں از روئے قانون عائد کی جائیں۔ چونکہ اپنی اپنی مرضی کے مطابق قوانین سازی کا حق ہر ملک کو حاصل ہے اس لئے ان قوانین کے تابع بنیادی حقوقِ انسانیت کی جو حیثیت رہ جاتی ہے، وہ ظاہر ہے۔

یہ ہے اجمالی سا تذکرہ ان کوششوں کا جو انسان کے بنیادی حقوق متعین اور تسلیم کرنے کے سلسلے میں انسانی فکر نے آج تک کی ہیں۔ اب ان کے مقابلہ میں اس ضابطہ حقوق کو سامنے لائیے جو چھٹی صدی مسیح میں جب دنیا، انسان کے بنیادی حقوق کے تصور تک سے نا آشنا تھی۔ تمام نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے دیا گیا اور جس پر عمل کر کے اس ضابطہ آسمانی کے لانے والے پیغمبرِ آخر الزماں نے، دنیا کو پہلی بار اس حقیقتِ کبریٰ سے روشناس کرایا کہ دنیا میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کے وہ حقوق کیا جنہیں دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ ان حقوق کا تفصیلی تذکرہ، اس مختصر سے وقت میں مشکل ہے، اس لئے میں ان کے اجمالی تعارف پر ہی اکتفا کروں گا۔



سب سے پہلے اس بات کو دیکھئے کہ نظریۂ میثاق، جسے عصرِ حاضر کی سیاسی فکر کا معرکہ آرا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے، اس کا تصور بھی قرآنِ کریم ہی نے پیش کیا تھا۔ لیکن وہ اس میثاق کو حاکم اور محکوم میں استوار نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک انسانوں میں حاکم اور محکوم کا تصور ہی باطل ہے۔ جیسا کہ

قرآنی نظریۂ میثاق

میں فدا اگے چل کر بیان کروں گا، اس کی رُو سے، کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ وہ اس میثاق کو خدا اور بندے کے درمیان معاہدہ قرار دیتا ہے۔ لیکن چونکہ اس میثاق کے لئے خدا خود بندوں کے سامنے نہیں آتا اس لئے یہ میثاق افراد اور اس معاشرہ کے درمیان طے پاتا ہے جو نظامِ خداوندی کو متشکل کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ میثاق کے الفاظ یہ ہیں کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآتٍ لَهُمُ الْجَنَّةُ ط (۹)

افرادِ معاشرہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں نظامِ عدل و احسان کے قیام اور استحکام کی خاطر ضرورت پڑے تو ان کا مال اور ان کی جان، اس مقصد کے لئے نظامِ خداوندی کے سپرد ہوں گے اور نظامِ خداوندی (یا معاشرہ) ان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں، اس کے عوض ”الْجَنَّةُ“ عطا کرے گا۔ اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی

اور اخروی زندگی میں بھی جنت۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، الْجَنَّةُ میں وہ تمام خوش حالیاں اور خوش گواریاں، سرفرازیاں اور سر بلندیاں، اطمینان اور سکون، امن اور سلامتی، غرضیکہ وہ سب کچھ آتا ہے جس کی انسان آرزو کر سکتا ہے۔ اس میثاق کی رُو سے ان تمام چیزوں کا حصول، ان لوگوں کا بنیادی حق ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے جنتی معاشرہ کی جو تفصیل بیان کی ہیں اگر میں ان کا ذکر کروں تو اس سے ایک ایسی جامع فہرست مرتب ہو جائے گی جسے ان افراد معاشرہ کے بنیادی حقوق کا چارٹر سمجھا جائے گا، لیکن میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اس لئے کہ یہ حقوق ان لوگوں کے ہوں گے جو اس میثاق خداوندی کا ایک فریق ہوں گے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اور میرا موضوع ان حقوق سے متعلق ہے جو قرآن کی رُو سے دنیا کے ہر انسان کو محض انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ یہ حقوق کسی معاہدہ یا میثاق سے مشروط نہیں ہوں گے نہ کسی خدمت کا معاوضہ۔

قرآنی حقوقِ انسانیت

یہ بلا مشروط ہوں گے اور بلا مزد و معاوضہ، ہر انسان کو۔ بلا تخصیصِ مذہب، ملت، زبان، رنگ، نسل، وطن، محض انسان ہونے کی جہت سے حاصل ہوں گے۔ دیکھئے یہ حقوق کیا ہیں، جنہیں ہر انسان قرآنی معاشرہ سے، ہر وقت طلب کر سکتا ہے۔

(۱) احترامِ آدمیت

پہلا حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (بج۱) قرآن کا ارشاد ہے، یعنی ہم نے تمام فرزندِ آدم کو واجبِ التکریم پیدا کیا ہے۔ اگر حسبِ نسب کے اعتبار سے کسی انسان کو یہ نظرِ حقارت دیکھا جائے اور دوسرے کو زیادہ واجبِ العزت سمجھا جائے، یا خاندانی نسبت کی بنا پر کسی سے، کسی قسم کی رعایت برتی جائے تو یہ تفریق و تخصیص جس انسان کے خلاف جائے اُسے حق حاصل ہو گا کہ وہ اس کا مداوا طلب کرے اور قرآنی معاشرہ کا فریضہ ہو گا کہ وہ اس کے نقصان کی تلافی کرے۔ آدمیت، احترامِ آدمی، قرآن کا پہلا اصول، اور ہر انسان کا اولین بنیادی حق ہے۔

(۲) جنسی مساوات

قرآن کی رُو سے جنسی تفریق نہ وجہِ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز، یعنی نہ مرد محض مرد ہونے کی حیثیت سے

عورتوں سے افضل ہیں اور نہ ہی عورتیں، محض عورت ہونے کی بنا پر، مردوں سے کہتر۔ زندگی کی ابتدا، نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے (خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ - ۲) قرآن کا ارشاد ہے۔ ہر انسانی بچہ ہیں، خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ کچھ حصّہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ حصّہ عورت کا۔ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَ اُنْثٰی۔ (۲۹) اس لئے نہ مرد، عورتوں سے الگ کوئی نوع ہیں نہ عورتیں، مردوں سے الگ کوئی جنس۔ دونوں نوعِ انسان کے افراد ہیں اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہوتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رکھے جائیں اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔ حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY)

مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لئے یکساں ہے اور اعمال کے نتائج بھی یکساں لَا اُضْبِعُ عَمَلٍ عَامِلٍ مِّمَّكُمْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی، بَعْضُكُمْ مِنْ اَبْغَضِی (۳۰) تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ مرد اور عورت کی تخصیص کے معنی کیا؟ تم ایک دوسرے کے اجزا ہو۔ تم خلقت اور سیرت کے اعتبار سے ایک ہو۔ زندگی کے تمام معاملات میں یکساں طور پر شریک رہتے ہو۔ تم ایک نوع کے فرد ہو۔ پھر اعمال کے نتائج میں فرق کس طرح ہو سکتا ہے؟

لہذا نفسی مساوات، انسانیت کا بنیادی حق ہے جسے کسی صورت میں بھی غصب نہیں کیا جاسکتا۔ قرآنی معاشرہ اس حق کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

(۳) مارج علی قدرِ اعمال

احترامِ آدمیت کے بعد، معاشرہ میں مختلف افراد کے مارج کا سوال سامنے آتا ہے۔ اس کے لئے اصول یہ ہے کہ وَ کُلٌّ دَرَجَتٌ مِّمَّا عَمِلُوا۔ (۲۶) ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ، اس کے اعمال و کردار کے مطابق متعین کیا جائے گا، یعنی سب سے پہلے ہر انسان کی عزت بہ حیثیتِ انسان ہوگی اور اس کے بعد اس کے جو سہ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار کو دیکھا جائے گا اور ان کے مطابق سوسائٹی میں ہر ایک کا مقام اور درجہ مقرر کیا جائے گا۔ جو جتنی زیادہ خوبیوں کا مالک، وہ اتنے ہی اونچے مقام کا مستحق، حتیٰ کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰیكُمْ (۲۹) جو

سب سے زیادہ حسنِ عمل کا پیکر، وہ سب سے زیادہ واجبِ العزت۔ نیچے سے اوپر تک، عزت کا ہر مقام ہر شخص کے لئے کھلا ہوگا جسے وہ اپنی قابلیت اور حسنِ سیرت کی رُو سے بطورِ حق حاصل کر سکے گا۔ اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، نہ ہی تعینِ مدارج کا کوئی اور معیار مقرر کیا جاسکتا ہے۔

۴) حقِ آزادی

”آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔“ یہ نعرہ اور اعلان تو آپ نے ہر جگہ سے بلند ہوتا سنا ہوگا، لیکن اس کا صحیح مفہوم بہت کم سامنے آیا ہوگا۔ جس جگہ سے آپ نے یہ نعرہ بلند ہوتے دیکھا ہوگا، وہیں سے آپ نے آئے دن ایسے احکام نافذ ہوتے بھی دیکھے ہوں گے جو ہر شخص کی آزادی پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے چلے جائیں۔ لہذا یہ بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ اگر آزادی، انسان کا پیدائشی حق ہے، تو پھر اس پر یہ پابندیاں کیوں عائد کی جاتی ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رُو سے عائد کی جاتی ہیں اور قانون کی رُو سے عائد کردہ پابندیاں، انسانی آزادی کو سلب نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ اگر پابندیاں عائد نہ کی جائیں تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے۔ لہذا صحیح آزادی کے لئے قانونی پابندیاں لایفک ہیں۔ یہ درست ہے کہ معاشرہ کے قیام اور افراد کی حفاظت کے لئے قانونی پابندیاں ضروری ہیں، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ اگر بابِ اقتدار جنہیں قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے، جس قدر ظلم اور زیادتی، قانون کے پردے میں کر سکتے ہیں، لاقانونیت کا استبداد اس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ لاقانونیت کے دور میں یہ استبداد کھلے بندوں ہوتا تھا اور اس دورِ دستور و آئین میں یہ، قانون کے پردے میں ہوتا ہے۔ صاحبِ اقتدار طبقہ نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے اس کے لئے وہ پہلے قانون سازی کی رسم ادا کر لیتا ہے۔ اور پھر یہ، شاہِ مدار کی بسمِ لٹریچر کھینچ کر پھینکی ہوئی چھری، جس جاؤر کے گلے پر پھیر دی جائے، وہ ذبیحہ حلال قرار پا جاتا ہے، یہ سوال بڑا

صلہ یو۔ پی (بھارت کا موجودہ صوبہ اتر پردیش) کے عام دیہات میں یہ رواج تھا — شاید اب بھی ہو — کہ گاؤں کا جاہل ملا جسے ذبح کے وقت تکبیر پڑھنی نہیں آتی تھی ایک چھری شاہِ مدار کی خانقاہ پر لے جاتا۔ وہاں کا مجاور بسمِ اللہ پڑھ کر چھری پھونک دیتا۔ اس چھری سے جو جاؤر ذبح کیا جاتا اسے حلال سمجھ لیا جاتا۔ سال کے بعد پھر چھری کی تجدید کرائی جاتی۔

اہم اور بنیادی ہے جس کا دنیا کو آج تک خاطر خواہ حل نہیں مل سکا کہ انسانی آزادی اور قانون کی پابندی میں ایسی مفاہمت کی صورت کس طرح پیدا کی جائے کہ قانونی پابندیاں بھی اپنی جگہ قائم رہیں اور افراد کے حقوق بھی پامال نہ ہوں۔ اس کا حل قرآنِ کریم نے بتایا۔ اس نے اس ضمن میں پہلے یہ واضح کر دیا کہ مَا تَاَنَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَ وَالنُّبُوَّةَ لَشَخٍّ يَّقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سجہ) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے کتاب اور حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ ملی ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اس کے محکوم اور تابع فرمان ہو جائیں۔

قرآنِ کریم کے اس اعلانِ عظیم نے انسانی آزادی کا ایسا بلند منشور عطا کر دیا جس کا تصور بھی ذہنِ انسانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو رہی کامل آزادی کی شکل۔ اب قانونی پابندی کو دیکھئے۔ اس کے لئے اسی آیت میں پہلے مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہہ کر یہ بات سمجھائی گئی کہ افراد کی آزادی پر پابندیاں لگانا تو ضروری ہے لیکن یہ پابندیاں کوئی انسان نہیں لگا سکتا۔ اس کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کی طرف سے یہ پابندیاں کس طرح لگائی جائیں گی۔ کیا یہ وہی مہضیا کر بسی ہوگی جس میں مذہبی پیشوا شیتِ خدا کے نام کی آڑ میں ہر قسم کی من مانی کرتی ہے؟ قرآن نے کہا کہ بالکل نہیں۔ مہضیا کر بسی تو استبداد کی بدترین شکل ہے۔ اسی لئے اس نے فرعون کے ساتھ امان کو بھی برابر کا مجرم قرار دیا ہے جو مذہبی پیشوا شیت کا نمائندہ تھا۔ قانونی پابندیوں کے لئے اس نے کہا کہ

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رٰسِيْنَ يَمٰا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَلَيْسَ اَنْتُمْ تَدُوْنَ ۙ (سجہ)

خدا نے ان حدود اور پابندیوں کو انسانی آزادی پر عائد کی جائیں گی، اپنی کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا کہ ان پابندیوں میں کسی قسم کی کمی بیشی کر سکے، یا ان کے علاوہ کوئی اور پابندی عائد کرے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو یہ اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی انسان کو اپنا محکوم اور تابع فرمان (چہ جائیکہ غلام) بنا سکے۔ اب رہا یہ کہ کتاب اللہ

ما ظاہر ہے کہ جو قرآن ایک انسان کو دوسرے انسان کا محکوم بنانے کی بھی اجازت نہیں دیتا، وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا غلام بنانے کی اجازت کب دے گا۔ قرآن نے غلامی کو ختم کر دیا تھا۔ اس کی وضاحت انسان اور جنگ کے عنوان میں کی جا چکی ہے۔

میں بیان کردہ حدود اور پابندیوں کی عملی تشکیل اور تنفیذ کی صورت کس طرح متعین کی جائے تو اس کے لئے واضح طور پر بتا دیا گیا کہ یہ حق بھی کسی خاص گروہ اور جماعت کو نہیں دیا گیا، بلکہ یہ تمام افرادِ معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ امر ان کے باہمی مشورے سے طے پائیں گے — دَامْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ۔

(۳۲) یہ حق مشاورت بھی، بنیادی حقوق کی فہرست میں داخل ہے جس میں مرد اور عورت، امیر اور غریب، سب شریک ہیں۔ اس مشاورت کی عملی مشینری، اپنے اپنے حالات کے مطابق خود مرتب کی جاسکتی ہے۔

لہذا، قرآنِ کریم نے یا تو وہ قوانین دے دیئے ہیں جن کی پابندی کرائی جائے گی اور یا وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے رہتے ہوئے افرادِ معاشرہ، باہمی مشاورت سے وقتاً فوقتاً قوانین مرتب کر سکیں گے۔ ان حدود سے تجاوز کرنے یا ان کے علاوہ اور حدود قیود متعین کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا کیونکہ انسانیت کی آزادی کو سلب کر لینے کے مرادف ہوگا جس کی اجازت کسی انسان کو نہیں دی جاسکتی۔ اُسے شرک قرار دیتا ہے۔ سورہ شوریٰ میں ہے۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ (۳۲) کیا ان کے کوئی اور شریک ہیں جو ان کے لئے دینِ خداوندی میں ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت خدا نے نہیں دی؟ لہذا انسانی معاشرہ کے لئے کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کیا جاسکتا جس کی اجازت قرآن نے دی ہو۔ یہ ہے وہ طریق جس سے قرآنِ کریم، انسانی آزادی پر کوئی حرف نہیں آنے دیتا اور اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں لائقانِ نبیت بھی نہیں پھیلنے پاتی۔ یہ قرآن کے منشورِ حقوقِ انسانیت کی منفرد خصوصیت ہے۔

(۵) حقِ محنت

قرآن کا ارشاد ہے کہ وَدُعِيَّتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ — (۳۹) ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ کوئی کسی کی محنت کے حاصل کو نہ غصب کر سکے گا نہ اس میں کمی۔ اسی سلسلے میں اس نے دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ تَبَيَّنَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳) بجز ان لوگوں کے جو کام کرنے سے معذور ہوں (جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے) کوئی شخص محنت اور کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ یعنی اس معاشرہ میں، ایسے خون آشام طبقہ (PARASITES) کے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہوگی جو دوسروں کی محنت پر تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کریں اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کی محنت کو سلب (EXPLOIT) نہیں کر سکے گا، تو ہر کام کرنے والا اپنی محنت کے حاصل کا حقدار ہوگا۔ (تفصیل اس کی میری کتاب، نظامِ ربوبیت، میں ملے گی)۔

۶۔ عدل و احسان

اسی کا نام عدل ہے، یعنی ہر شخص کو اس کا حق مل جانا۔ قرآن کی رو سے عدل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کے حقوق کا تحفظ شامل ہے۔ جیسے ہم قانونِ عدل کہتے ہیں اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی حق غصب ہوتا ہو، تو عدالت کی مشینری اسے وہ حق دلادے۔ عدل کے معاملہ میں قرآن اتنا محتاط اور جڑرس ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دیکھنا! اس باب میں دوست اور دشمن میں تمیز نہ کر لگ جانا۔ لَا يَجْزِيكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَلَّا تَعْدِلُوْا کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی طرف سے دشمنی کا برتاؤ تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اَعْدِلُوْا۔ وہ کچھ بھی کریں، تم ان کے ساتھ عدل کرو، اس لئے کہ یہ ازلے بدلے کی بات نہیں، یہ انسان ہونے کی حیثیت ان کا حق اور اس کی ادائیگی تمہارا فریضہ ہے۔ هُوَ اَقْرَبُ يَلْتَمِزُوْا (۵)

لیکن قرآن عدل تک ہی نہیں رہتا، اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ (جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے) عدل سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کسی کا واجب (DUE) ہو وہ اسے دے دیا جائے۔ لیکن اگر اس سے کسی کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو اس میں کمی ہو جاتی ہو تو پھر کیا ہو؟ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶) اس صورت میں تم اس کمی کو پورا کر کے اس کے، اور خود معاشرہ کے نوازن کو بگڑنے سے بچاؤ۔ اسے احسان کہتے ہیں۔ یہ بھی بنیادی حقوقِ انسانیت میں شامل ہے۔ دنیا ایسے مواقع پر خیرات کی تلقین کرتی ہے لیکن خیرات سے جس طرح شرفِ انسانیت پامال ہوتا ہے اور خیرات لینے والے غریب نفس جس طرح مجروح ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس لئے قرآن نے احسان کو خیرات نہیں قرار دیا بلکہ کہا ہے کہ جس کی کمی رہ جائے وہ اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع بطور حق طلب کر سکتا ہے۔ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِیْنَ وَالْمَحْرُوْمِیْنَ (۲۴) وہ لوگ جن کی محنت سے ان کی ضروریات پوری نہ ہوں یا جو محنت کرنے سے محذور ہوں، ان کا، ان لوگوں کے مال میں حق ہے جن کے پاس ان کی ضروریات سے زیادہ ہے اور یہ حق ڈھکا چھپا نہیں، قرآنی معاشرہ میں سب کو معلوم ہے۔ افراد کی ہر قسم کی کمی پوری کرنے کو بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل کرنا قرآن کے سوا آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا۔

(۷) رزق کا حق

انسان (ہر ذی حیات) کی زندگی کا مدار، سامانِ زیست پر ہے۔ دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ ہر فرد کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے سامانِ زیست خود پیدا یا تمہیا کرے۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں ساری دنیا سے منفرد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآئِبَةٍ فِی الْآلَمِ حَتّٰی لَا اَعْتٰی اللّٰہُ رِزْقًا حَآدٍ (۱)، دنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق یعنی سامانِ زیست کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن ذمہ داریوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، قرآنی نظام میں وہ ذمہ داریاں خود نظامِ مملکت کی سوجاتی ہیں۔ لہذا یہ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کوئی ذی حیات اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے پائے اور وہ تمام افرادِ معاشرہ سے اعلا نیہ کہے دے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاٰیٰتُہُمْ (۲)، ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی پوری کرتے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات پوری کرنے کے بھی۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کئے جانا ہر انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ قرآنی نظامِ معاشرہ سے ہر وقت طلب کر سکتا ہے۔ یہ حق آپ کو دنیا کے کسی چارٹر میں نہیں ملے گا۔

جہاں تک اولاد کے رزق تمہیا کرنے کا تعلق ہے اس میں ان کی صحیح تعلیم و تربیت بھی شامل ہے۔ کیونکہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ مِّمَّنْ اَمْلَاقٌ (۳)، اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو، تو اس میں قتل کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں، اس سے مراد علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہے۔ لہذا قرآنی معاشرہ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت ہو، بنا بریں قرآن کی رو سے، سب بچے عمدہ پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت بطور اپنے حق کے طلب کر سکتے ہیں اور کوئی انہیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔

(۸) جان کی حفاظت

لیکن ضروریاتِ زندگی تمہیا کرنے کی ذمہ داری سے پہلے، انسانی جان کی حفاظت کی ضمانت سامنے آتی ہے۔ قرآن نے اس باب میں واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَا تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا

یَا لَٰحِقَیَّ ۙ (۱۵۲) خدا نے انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لئے کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کسی کو جان سے مار دے۔ ہاں اگر حق کا تقاضا ہو تو ایسا کیا جاسکتا ہے۔ حق کے تقاضے کے کیا معنی ہیں؟۔ اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ مَن قَتَلَ نَفْسًا یَّغْیِرُ نَفْسِیْ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَمْرِ مِنْ فَاکَا نَتَمَّا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ط۔ اگر کوئی کسی کو ناحق قتل کر دے تو اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جاسکتی ہے یا اگر کوئی شخص معاشرہ کے نظامِ عدل و امن کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے اور کسی طرح اپنی اس تباہ کن روش سے باز نہ آئے تو اسے بھی موت کی سزا دی جاسکتی ہے۔ ایسی صورتوں کے سوا، اگر کوئی شخص کسی انسانی جان کو ناحق تلف کر دے تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک جان کو تلف نہیں کیا پوری نوعِ انسان کو تلف کر دیا۔ اس کے برعکس وَمَنْ اَحْیَا هَا فَکَا نَتَمَّا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ط (۱۵۳) جس نے ایک انسان کی جان بچائی تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کی جان بچائی۔

آپ نے غور فرمایا کہ جن مخصوص حالات میں قرآن کریم نے کسی انسان کی جان لینے کی اجازت دی ہے، (یعنی قانونِ خداوندی کی رو سے سزائے موت) وہ بھی درحقیقت عالمگیر انسانی حقوق کی محافظت کے لئے ہے۔ اسی کو بالحق کہا گیا ہے۔

(۹)۔ مال کی حفاظت

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی بنیادی حقوق میں داخل ہے جو قانونِ خداوندی کی رو سے افراد کے ذاتی تصرف میں رہیں۔ کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ دوسروں کی ان چیزوں کو ناجائز طور پر اپنے تصرف میں لے آئے اسی لئے فرمایا کہ لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ یَاٰبَاطِلَی (۱۵۴) تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ "مال" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کی مقبوضات آجاتی ہیں۔

(۱۰)۔ سکونت کی حفاظت

جاں اور مال کی حفاظت کے بعد، قرآن کریم، ہر فرد کو سکونت کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ اس نے یہودیوں کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی ہے اس میں یہ بھی کہا ہے کہ لَعَنَّا اَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُوْنَ

أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ دِيَارَهُمْ زُرَ (۲/۸۵) تم وہ ہو جو اپنے لوگوں کو ناحق قتل کر دیتے ہو اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ لہذا کسی کو بے گھر، بے در، بنادینا اس کے اس بنیادی حق کو غصب کر لینا ہے۔

۱۱۔ عصمت کی حفاظت

عصمت انسان کی بے بہا متاع ہے۔ یہ وہ بلند ترین قدر ہے جو صرف انسان کا خاصہ ہے۔ حیوانات میں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ جنسی اختلاط ایک طبیعی جذبہ ہے جس میں انسان اور حیوان سب شریک ہیں لیکن عصمت کا جذبہ صرف انسانی سطح زندگی کا تقاضا ہے۔ لہذا قرآن اس کی حفاظت کو مستقل حقِ انسانیّت قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے اس حق کی پامالی کو ایک ایسا جرم قرار دیا ہے جس کی سزا بڑی سخت ہے۔ اَلَّذَانِیۡنِیۡۃُ وَ الَّذِیۡنِیۡ فَا جَلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَۃً جَلْدَۃً س (۲۴/۲۴) زانی مرد ہو یا عورت، انہیں سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

صرف جرمِ زنا کا ارتکاب ہی نہیں، اس کے نزدیک، شریف عورتوں کے خلاف تہمت بے جا بھی سنگین جرم ہے جس کی سزا اسی کوڑے سے ہے (۲۴/۲۴)۔ اس لئے کہ اس سے بھی ان کی عصمت پر حرف آتا ہے۔ اور شریف زادوں کو چھڑنا اور تنگ کرنا، ان کے خلاف طعن آمیز اور اضطراب انگیز باتیں پھیلا کر لوگوں کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل کرنا، اس کے نزدیک اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ اس جرم کی پاداش میں اس نے کہا ہے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے۔ انہیں حقوقِ شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف وارنٹِ بلا ضمانت جاری کر کے انہیں گرفتار کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر انہیں قتل کیا جائے اس طرح کہ ان کی پارٹی کا کوئی فرد بھی سزا سے بچنے نہ پائے۔ وَقَتِّلُوْا تَقْتُلُوْا (۳۳/۳۳) یہ وہ قانونِ خداوندی ہے جس کے متعلق کہا کہ مَسْنَعَةُ اللّٰهِ فِی السَّیِّئِیۡنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَٰكِنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (۳۳/۳۳) یہی قانونِ خدا نے وحی کے ذریعے اقوامِ سابقہ کو بھی دیا تھا اور یہ ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

تعلق زوجین کے سلسلے میں قرآنِ کریم نے اس امر کی صراحت

بھی کر دی کہ شادی میں اپنی مرضی سے انتخاب بھی بنیادی حق

۱۲۔ شادی میں انتخاب کا حق

ہے۔ اس نے مردوں سے کہا کہ فَاَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ۔ (۲۴) تم اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کرو۔ دوسری طرف یہ کہہ کر عورتوں کے حقِ انتخاب کی حفاظت کر دی کہ لَا يَجِلُّ لَكُمْ اَنْ تَنْكِحُوا النِّسَاءَ كَمَا طَابَ (۲۴) تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔

اس سلسلہ میں اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے، معاہدہ نکاح کے بعد خاوند اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوتی ہیں۔ صرف ایک بات میں مرد کو رعایت دی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ طلاق (بایوگی) کی صورت میں، عورت کو عدت کی مدت میں نکاحِ ثانی کی اجازت نہیں ہوتی اور مرد کے لئے کوئی عدت نہیں۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے، یعنی اس دوران میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ عورت حمل سے تو نہیں۔ یہ حکم پیدا ہونے والے بچے کے حق کی حفاظت کے لئے ہے، یعنی یہ متعین کرنے کے لئے کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيَّهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَيُلْزِمُنَّكَ الْمَوْلَاةُ ذَرِّيَةً فَتَحْمِلُهَا فَتَكُونُ كَوِاثِرَ سُوءِ فِعْلِكَ فَاِنْ كُنَّ عَوْرَتًا لِّمَوْلَاةٍ فَاِذَا رَزَقْنَهَا مِنْ لَدُنْكَ وَكُنَّ عُورًا لِّمَا رَزَقْنَهَا فَاِنْ كُنَّ عَوْرَتًا لِّمَوْلَاةٍ فَاِذَا رَزَقْنَهَا مِنْ لَدُنْكَ وَكُنَّ عُورًا لِّمَا رَزَقْنَهَا فَاِنْ كُنَّ عَوْرَتًا لِّمَوْلَاةٍ فَاِذَا رَزَقْنَهَا مِنْ لَدُنْكَ وَكُنَّ عُورًا لِّمَا رَزَقْنَهَا۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ اور وہ یہ کہ اسے عدت نہیں گزارنی پڑتی۔

۱۳۔ حسن ذوق کا حق

قرآن، انسان کے انفرادی حسنِ ذوق (AESTHETIC TASTE) کا بڑا احترام کرتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسے، اس کے حق سے محروم کر دے۔ اس نے بڑی تحدی سے کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الزَّيْطِ۔ (۲۴) ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کی تسکین کے لئے بنایا ہے اور نیکو سامانِ زینت کو حرام قرار دینے کا حق یا اختیار حاصل ہے؟ کسی کو نہیں۔ حدودِ اللہ کے اندر رہتے ہوئے، ان سے لطف اندوز اور کیفیتِ یاب ہونا، ہر فرد کا بنیادی حق ہے جس سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ اصولاً یہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا، اسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مترادف ہے جس کا حق کسی انسان کو نہیں پہنچتا۔ اسی ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کھانے پینے کے انداز ط اور

ط یعنی حلال چیزوں کے کھانے پینے کے انداز اور طریق پر۔

رہنے پہنے کے طریق پر بھی کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا بلکہ اس میں ہر ایک کو اس کے ذوق کے مطابق حق انتخاب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں سے جس کے ان جی چاہے کھاؤ پیو اور خواہ اکٹھے مل کر بیٹھ کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ، اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَمْتًا قَاطَ (۲۴۱) اسی طرح وہ لباس کے معاملہ میں بھی وضع قطع اور تراش خراش پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا اور ہر ایک کے حسن ذوق کی رعایت رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لباس کا مقصد ستر پوشی کے علاوہ زینت بھی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا اٰدَمُ فَخُذْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يَّتَوَازَوْنَ سَوَآءً لَّكُمْ دَرِيسًا ط (۲۴۲) وہ سونے کے زیورات، چاندی اور شیشے کے برتن، باریک اور دبیر ریشمی ملبوسات، اعلیٰ درجے کے صوفے (۱۸ ذ ۱۶-۱۳) اور اسی قسم کا دیگر سامان آرائش و زیبائش، جتنی زندگی کا خاصہ قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ بیہشتِ مجموعی، معاشرہ کا تمدنی معیار اتنا بلند ہونا چاہیے کہ یہ چیزیں تمام افرادِ معاشرہ کو میسر ہوں۔ جتنی زندگی میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ایک خاص طبقہ ان آسائشوں سے بہرہ یاب ہوگا اور دوسرے لوگ ان سے محروم ہوں گے جتنی زندگی میں ہر ایک کو یہ کچھ میسر ہوگا۔

۱۴۔ مذہبی آزادی کا حق

مذہب کے معاملہ میں قرآن، ہر انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے کسی بات کو عقل و فکر کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔ لہٰذا اس میں مجبور و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا، قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قَفْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۶۹) ”ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (اس قرآن میں) آچکا ہے۔ تم اس پر غور و فکر کرو۔ اور اس کے بعد جس کا جی چاہے اسے تسلیم کر لے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے“ اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات اور انسان میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو صاحب اختیار و الادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسے راستہ دکھا دیا گیا ہے اور اس کے بعد، یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو اختیار کرے یا اس سے انحراف برتے۔ وہ اگر اسے اختیار کرے گا تو اس کی زندگی خوشگوار یوں میں گزرے گی۔ اس سے سرتابی

برتے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ اگر اسے مجبوراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اسے صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اب یہ بات منشاءِ خداوندی کے خلاف ہوگی کہ اسے ایک خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ قرآن مجیم نے نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرمایا: **وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُم جُنُودٌ** اگر تمہارے خدا کے پروگرام میں یہ ہوتا کہ انسان کو ایمان کے راستے پر مجبوراً چلایا جائے تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا؟ وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ وہ سب کے سب، آنکھ بند کئے، بھیڑ بکریوں کی طرح اسی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے انسان کو ایسا پیدا نہیں کیا۔ اسے اس باب میں اختیار دیا گیا ہے۔ **أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ** (۲۴۶) تو کیا تو انہیں مجبور کرے گا کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں۔ یہ تو مشیتِ خداوندی کے خلاف ہوگا۔ اس لئے نیراکام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے جا۔ اس سے زیادہ کا تو مکلف نہیں۔ **لَا اكْرَاهُ فِي الدِّينِ قَفًّا قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ** (۲۴۷) غلط اور صحیح راستہ (اس قرآن کے ذریعے) متعین ہو کر سامنے آچکا۔ اس کے بعد، دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں، (مذہب کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا) اس لئے وہ مذاہبِ عالم میں سے کسی کو اپنا حریف نہیں قرار دیتا۔ وہ ایک دین، یعنی ضابطہ زندگی یا مملکتی نظام ہے۔ وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس کی حدودِ مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظام مملکت قائم کریں۔ یہ تو ”ریاست درون ریاست“ (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنے کے مرادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ لیکن وہ اس سے کچھ بھی تعرض نہیں کرتا کہ اس کے حدودِ مملکت میں رہنے والے اپنے لئے مذہب کو نساپند کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کہ وہ ہر ایک کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ جہاں اپنے نظام کے مراکز، یعنی مساجد کی حفاظت کرتا ہے، وہاں، تمام اہل مذاہب کی پرستش گاہوں کی بھی حفاظت اپنے ذمہ لیتا ہے۔ وہ اسلامی مملکت کے وجود کی ایک وجہ و جواز یہ بھی بتاتا ہے کہ **وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفُتِمَتِ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا** (۲۴۸) اگر اللہ انسانوں کے ذریعے سرکش قوتوں کی رشکِ نظام نہ کرتا تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرجے، دیگر

اقوام کی پرستش گاہیں اور مسجدیں جن میں یہ کثرتِ خدا کا نام لیا جاتا ہے ڈھادی جاتیں۔ لہذا، ان تمام معبودوں کی حفاظت، قرآنی ممکنات کی ذمہ داری ہے، جس کا ہر غیر مسلم، بطور اپنے حق، کے مطالبہ کر سکتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جماعتِ مومنین سے تاکیدِ اکہا ہے کہ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ۔ فَیَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ تم غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی مت دو۔ تم ایسا کرو گے تو وہ، اس کے مقابلے میں بر بنائے جہالت، اللہ کو گالی دیں گے سو جس طرح تمہیں یہ بُرا لگے گا، اسی طرح انہیں، ان کے معبودوں کو تمہارا گالی دینا بھی بُرا لگتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ كَذَٰلِكَ ذَرَبْنَا لِ كُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (۶۸) ہر ایک کو اپنا اپنا مسلک اور اپنا اپنا معبود پسند ہوتا ہے۔ تم ان تک حق کی بات پہنچاؤ۔ جب یہ بر بنائے علم و بصیرت، غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں گے تو خود بخود اپنے معبود انِ باطل کو چھوڑ کر صحیح نظامِ زندگی اختیار کر لیں گے۔

لہذا قرآنِ نورِ انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی ضمانت بھی دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبانِ درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔

اس مقام پر میں، آپ حضرات سے، اپنے موضوع سے ذرا سے گریز

(DIGRESSION)

کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ خدا نے تو مذہب کے معاملہ میں انسان کو اس قدر آزادی عطا کی ہے، لیکن ہمارے اربابِ شریعت کا فتویٰ ہے کہ غیر مسلموں کو تو اس کا حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ چاہے اپنے مذہب میں رہیں اور چاہے اسے تبدیل کر لیں، لیکن ایک مسلمان کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ اگر مسلمان مذہب تبدیل کرے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں کہ وہ اسلام چھوڑ کر اگر کوئی اور مذہب اختیار کر لے تو اسے قتل کر دیا جائے گا بلکہ یہاں تک بھی کہ اگر کسی معاملے میں اس کے خیالات ان حضرات سے مختلف ہوں اور اس بنا پر یہ اُسے مرتد قرار دے دیں تو بھی اسے قتل کر دیا جائے گا۔

اس سلسلے میں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اس وقت پاکستان میں جس قدر مسلمان بستے ہیں، اگر کل کو یہاں، ان حضرات کے تصور کا اسلامی نظام قائم ہو گیا تو ان ”پیدائشی مسلمانوں“ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا۔ اس ضمن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اپنے رسالہ

”مرتد کی سزا“ کے صفحہ ۸۰ پر ارشاد فرماتے ہیں:-

”میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے (واللہ الموفق للصواب) کہ جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور وہ منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخِ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے اجتماعی نظام سے باہر نکل جائیں۔ اس سزا کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچا یا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے اسلام پر راضی ہوں۔“

یعنی صرف انہیں زندہ رکھا جائے جو ان حضرات سے متفق الخبال ہوں۔ جو ان سے اختلاف کریں انہیں زیادہ سے زیادہ ایک سال تک زندہ رہنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے بعد، یا وہ (مثلاً) ہندو یا عیسائی ہو جائیں یا اپنی گردن ان کی تلوار کے سامنے جھکا دیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر وہ اس وقت ان کے ہم خیال بھی ہو جائیں تو بھی انہیں ساری عمر اطمینان سے جینے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس کے بعد بھی جب یہ حضرات کہہ دیں کہ اس کا فلاں عقیدہ ان کے خیال کے مطابق اسلام کے خلاف ہے اُسے مرتد قرار دے کر قتل کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہوگی مسلمانوں کی حالت اس اسلامی نظام میں جسے یہ حضرات پاکستان میں قائم کرنے کے درپے ہیں!

اس گریز کے بعد، میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ قرآن کی رُود سے، اگلا بنیادی حق ہے:-

(۱۵)۔ سچی بات کہنے کا حق

قرآنِ کریم نے افراد کو سچی بات کہنے کا حق ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے

اسے افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑا کہ وہ حق بات کہیں یا نہ کہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ وہ، جہاں بھی ضرورت ہو، حق بات کہنے کے لئے اپنے آپ کو خود پیش کریں۔ اس کا حکم ہے کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ**۔ اے جماعتِ مومنین! تمہارا فریضہ ہے کہ تم عدل و انصاف کو دنیا میں قائم رکھو۔ اس کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ سچی بات بلا تردد رعایت کی جائے۔ اس ضمن میں تم سمجھ لو کہ جب کسی معاملہ کے متعلق کچھ کہنے کا وقت آئے تو یہ خیال کرو کہ تم کسی پارٹی یا فرقہ کی طرف سے شہادت دینے کے لئے آئے ہو، تم یہ سمجھو کہ تم صرف اپنے خدا کی طرف سے شاہد بن کر آئے ہو۔ **شَهِدْ أَعْلَىٰ** بھرتی بات کہہ دو۔ **وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ**۔ خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ (آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن انسان کو کس مقام تک لے جاتا ہے؟) **أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ**۔ خواہ وہ تمہارے والدین یا دیگر عزیز رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ جائے۔ **إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَاقِرًا**۔ جس کے خلاف بات جاتی ہے وہ امیر ہو یا غریب، اس کی پروا مت کرو۔ اس لئے کہ **قَالَ اللَّهُ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُ اللَّهُ** اللہ کا حق ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یاد رکھو! اپنے مفاد کا تحفظ، عزیز رشتہ داروں کی محبت اور تعلقات، اس پارٹی سے نقصان کا احتمال جو دولت مند ہے، یہ تمام جذبات تمہاری راہ روک کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن **فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَحْسِبُوا**۔ تم ان جذبات کا اتباع قطعاً نہ کرو اور ہمیشہ عدل کے تقاضے کو ملحوظ رکھو۔ **وَأِنْ تَلَوْا أَوْ نَعَزْ مِنْهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا** (۱۳۵) نہ ہی تم توڑ مروڑ کر، نہ وہی بات کرو اور نہ ہی اس سے پہلو تہی کرو۔ ایسا کرنے سے ہو سکتا ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو دھوکا دے سکو۔ لیکن تم اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اس لئے سچی بات کہنے کے لئے دھڑلے سے سامنے آؤ اور لگی لیٹی بغیر، صاف صاف دھوکے بات کرو۔

ادھر یہ کہا اور دوسری طرف اشارہ سے تاکید کی کہ اس کا انتظام کرو کہ حق بات کی شہادت دینے والے کو، کوئی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے۔ **وَلَا يَضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ** (۱۳۶)۔

(۱۶) مظلوم کو فریاد کا حق

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم کسی کی برائی کی خواہ مخواہ تشہیر مت کرو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے

مظلوم کو اس کا حق دیا ہے کہ اس کے ساتھ جبر نہ یادتی ہوئی ہے وہ اس کے مداد کے لئے اس کا اعلان اور فریاد کر سکتا ہے۔ لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْعِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلِمَ (۳۸) اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ تم بُری بات کی خواہ مخواہ تشہیر کرتے پھرو۔ (یہ اربابِ نظم و نسق کا کام ہے کہ وہ اس برائی کے انراد کا بندوبست کریں)۔ ہاں! جس شخص پر کوئی زیادتی ہوئی ہو وہ اس کا چرچا کر سکتا ہے تاکہ اس کی زیادتی کا مداوا ہو سکے۔

(۱۷) رازوں کی حفاظت کا حق

قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے کہ کسی کے رازوں کی خواہ مخواہ ٹوہ لگائی جائے۔ وَلَا تَجَسَّسُوا (۲۹) اس کا ارشاد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ افراد کو اس کا حق دیتا ہے کہ ان کے راز، افشا نہیں کئے جائیں گے۔ (جرائم کی تحقیق کے سلسلے میں ایسا کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے) خط و کتابت کی حفاظت کا حق بھی اسی ذیل میں آ جاتا ہے۔ اسی طرح وہ ہر شخص کو پرائیویسی کا حق بھی دیتا ہے جب کہتا ہے کہ لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ غَيْرِ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا۔ (۲۴) تم اپنے گھروں کے علاوہ، کسی اور کے گھر میں، ان کی اجازت کے بغیر مت داخل ہو۔

(۱۸) حیثیتِ عرفی کے تحفظ کا حق

جس چیز کو عام طور پر حیثیتِ عرفی کہا جاتا ہے، قرآن اس کی حفاظت کا بھی حق دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْعِ مِنَ الْقَوْلِ۔ (۳۸) اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ کسی کی بُری بات کو خواہ مخواہ اُچھالا جائے۔ اس کی اصلاح مطلوب ہو تو خاموشی سے ایسا کیا جائے۔ پھر ارشاد ہے کہ لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ (۲۹) کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کا مذاق نہ اڑائے۔ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ کسی کے اٹھے پٹے نام نہ رکھے جائیں۔ محض ظن اور گمان کی بنا پر کسی کو مطعون نہ کیا جائے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ ذ۔ (۴۹) اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم نہ سمجھا جائے بلکہ کہا یہ جائے۔ هَذَا آفَكٌ مُّبِينٌ۔ (۲۴) هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔ (۲۴) اور یہی نہیں کہ

ظن اور قیاس کی بنا پر، کسی کے سامنے اس کی برائی نہ کی جائے بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی ایسا نہ کیا جائے کہ یہ غیبت ہوگی اور غیبت سے قرآن نے سختی سے روکا ہے۔ وَلَا يَخْتَبِ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (۴۹) اس قسم کے تاکیدِ احکامات سے، قرآن، افراد کی حیثیتِ عرفی کا تحفظ کرتا ہے۔

۱۹۔ امن کی ضمانت

ان تمام حقوق سے آگے بڑھ کر، قرآنِ کریم یہ ضمانت دیتا ہے کہ لَا تَخَوْفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲۴) انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ خوف خارجی خطرات کی طرف سے اندیشہ کا نا ہے۔ لہذا، اس معاشرہ میں، ہر فرد، ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ ہوگا اور حزن اس افسردگی کو کہتے ہیں جو پریشانیوں کی وجہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ لہذا جہاں اس معاشرہ کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ معاشرہ، بیرونی خطرات سے امن میں رہیں، وہاں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہوگی کہ وہ ان پریشانیوں کو دور کرے جو لوگوں کے لئے وجہِ افسردگی بنتی ہیں۔ خوف اور حزن سے مامونیت، ایسی جامع کیفیت ہے جس میں داخلی اور خارجی، ہر قسم کے اندیشوں اور پریشانیوں سے حفاظت کا تصور آ جاتا ہے۔ اسی حفاظت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶۵)۔ اس میں کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کرے کوئی اور بھروسے کوئی۔ فریضہ کسی کا ہو اور اسے سراسر انجام کوئی اور دے۔ کام کسی کا ہو اور مفت میں بیگار کوئی اور بھگتے۔ جرم کسی نے کیا ہو اور دھڑکا کسی اور کو لگا ہوا ہو۔ یہ ہے امن کی وہ ضمانت جس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔



یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جنہیں قرآن، حقوقِ انسانیت کی حیثیت سے تسلیم کرتا اور جن کی ضمانت قرآنی معاشرہ دیتا ہے۔ یہ صرف بڑے بڑے حقوق کی فہرست ہے، ورنہ چھوٹے چھوٹے کئی اور حقوق ہیں جن کی یہاں نوکمر نہیں کیا گیا۔ آپ ان حقوق کو سامنے رکھیے اور پھر ان کا موازنہ ان حقوق سے کیجئے جن کا ذکر اقوام متحدہ کے چارٹر میں کیا گیا ہے۔ آپ پر یہ حقیقت خود بخود واضح (U.N.O)

حقوق کا موازنہ

ہو جائے گی کہ انسانی نکر اپنی اس وقت تک کی، انتہائی بندیوں کے باوجود، کہاں تک جاسکی ہے۔ اور وحیِ خداوندی، اس باب میں انسان کو کہاں لے جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ

ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیے کہ وحیِ خداوندی (قرآنِ کریم) نے انسانوں کو یہ حقوق اس زمانے (چھٹی صدی عیسوی) میں عطا کئے تھے جب انسان اپنے بنیادی حقوق کے تصور تک سے نا آشنا تھا۔

قرآنِ حقوقِ انسانیت کی فہرست کا، اقوامِ متحدہ کے مرتب کردہ منشور کے ساتھ موازنہ کے بعد ایک اور اہم حقیقت پر بھی غور کیجئے۔ جس زمانے میں یو۔ این۔ او کا منشور زیرِ تحقیق تھا، انجمنِ اقوامِ متحدہ کی

(EDUCATIONAL, SCIENTIFIC AND CULTURAL ORGANISATION)

نے جسے عام طور پر (UNESCO) کہا جاتا ہے، اس موضوع پر ایک سوانامہ مرتب کیا اور اسے دنیا بھر کے مشہور ادارہ بابِ فکر و نظر کے پاس بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کریں۔

(UNESCO) نے ان میں سے بلند پایہ مشاہیر کے مقالات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جس

کا تعارف (JACQUES MARITIAN) نے لکھا ہے۔ ان مقالات میں جس بات کو نمایاں طور پر

تسلیم کیا گیا ہے یہ ہے کہ انسان کے کوئی حقوقِ مطلق (ABSOLUTE)

ہیں ہی نہیں۔ مسٹر (MARITIAN) کے الفاظ میں:-

کوئی حقِ مطلق نہیں

”یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق، بالآخر انسانی حقوق ہیں۔ (خدائی حقوق نہیں) اور دیگر

تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و

تبدیل قرار دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن حقوق کو غیر مشروط کہا جاتا ہے ان میں بھی، ان حقوق کے

مالک ہونے میں اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے ملکیت بجا ہے لیکن انکا استعمال

ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہو گا جو ان پر اندرونی عدل عائد کی جائیں گی۔“

لیجئے! ایک ہی تشریح نے، بنیادی حقوقِ انسانیت کی رفیع الشان عمارت، دھڑام سے نیچے گرا دی۔ انسان

جس بات کی ضمانت چاہتا ہے اور جس ضمانت سے اُسے حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ اس

کے کچھ حقوق ایسے ہیں جو اسے محض انسان ہونے کی حیثیت سے غیر مشروط

حاصل ہیں۔ نہ ان حقوق میں کوئی رد و بدل کر سکتا ہے نہ من مانی حدود و قیود

مشروط حقوق

عائد کر سکتا ہے۔ لیکن جب ایک طرف اس کے ہاتھ میں حقوق کی فہرست دے دی جائے اور دوسری طرف

اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ اربابِ اقتدار (PARTY IN POWER) کو اس کا حق حاصل ہے

کہ وہ اندرونی عدل ان حقوق پر جو پابندیاں چاہے لگا دے، تو اس سے اسے خاکِ اطمینان حاصل

ہوگا؟ وہ اربابِ اقتدار کی دخل اندازی سے بچنے کے لئے ہی تو حقوق چاہتا تھا۔ اگر وہ دخل اندازی سے قائل ہے تو اسے اس قسم کے حقوق سے حاصل کیا ہوگا؟ مختلف اقوامِ عالم کے ہاں، اربابِ اقتدار کے ہاتھوں، ان حقوق کی جس قدر مٹی پلید ہوتی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ سب کچھ عدل و انصاف کی فاطر اور آئین و قانون کے نام سے کیا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اس باب میں، بات بالکل واضح کر دی۔ اس نے بیشتر حقوق کو حقوقِ مطلق قرار دیا جن پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ (مثلاً رفق، یعنی بنیادی ضروریاتِ زندگی حاصل ہونے کا حق، احترامِ انسانیت کا حق، صحیح تعلیم و تربیت کا حق، عدل و احسان کا حق، تحفظِ عصمت کا حق اور اسی قسم کے دیگر حقوق جو یکسر غیر مشروط ہیں)۔ اور جو حقوق مشروط ہیں ان کی شرائط اور حدود کو بھی خود ہی متعین کر دیا۔ اور ان دونوں چیزوں کی یکساں مثال اور غیر متبادل قرار دیا کہ قَوْلُ مَثَلٍ کَلِمَاتٌ رَبِّکَ صِدْقًا وَقَعْدًا لَا طَ لَا مُبَدِّلَ یَکَلِمَاتِہٖ۔ (۱۱۶) تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اب ان امور میں کوئی تبدیلی کر لے والا نہیں۔ اسی مکمل اور غیر متبادل ضابطہ حیات کا نام قرآن ہے۔ جو دنیا میں حقوقِ انسانیت کا واحد ضامن ہے۔

یہ تو ہم ان حقوق کے مشروط اور قابلِ تغیر و تبدیل ہونے کے متعلق جو اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں مذکور ہیں۔ اس کے بعد، اس سے بھی زیادہ اہم بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ، ہر چند اس چارٹر کو اقوامِ عالم کے نمائندوں نے منظور اور تسلیم کیا ہے لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ قومیں اس پر عمل بھی کریں گی۔ اس ضمن میں شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر (QUINCY WRIGHT) اپنے

مقالہ میں لکھتا ہے:-

”تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی مجبورہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہر حال میں حقوقِ انسانیت کا احترام کرے گی۔ گزشتہ دنوں اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں اس سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔ اگر مجلسِ اقوامِ متحدہ فی الواقعہ چاہتی ہے کہ ان حقوق کا احترام ہو تو اسے چاہیے کہ یہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور اقوامِ عالم کے اقتدارِ اعلیٰ کے تصور میں اس کے مطابق تبدیلی پیدا کرے“ (SOVEREIGNTY)

پروفیسر رائٹ، ان حقوق کے تحفظ کے لئے، یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اقوامِ عالم، اس باب میں اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو اقوامِ متحدہ کی تحویل میں دے دیں، اور ہمیں سیاسی اُفق پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ، مرحوم لیگ آف نیشنز کی طرح، انجمنِ اقوامِ متحدہ کا وجود ہی خطرہ میں ہے۔ کئی اقوام نے انجمن کو اپنے واجبات تک ادا نہیں کئے۔

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حالات یہ ہیں تو پھر وہ کونسی صورت ہے جس میں ان حقوق کے احترام اور تحفظ کا خاطر خواہ انتظام ہو سکتا ہے۔ اس باب میں مسٹر (MARITIAN) نے اپنے تعارفی مقالہ میں جو کچھ کہا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

انسانیت کے حقوق کی تعریف (DEFINITION) نہیں، بلکہ پس چہ باید کرد؟ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے

سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہو جائے۔ حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک، انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو فلسفہ زندگی کہتے ہیں۔

یعنی اخراجِ حقوقِ انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ تمام اقوام کا فلسفہ زندگی (یا آئیڈیالوجی) مشترک ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، تحفظِ حقوقِ انسانیت کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ قرآنِ کریم اس کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے اقدار (VALUES) کے یکساں پیمانے مقرر کرتا ہے وہ عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ
وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (۱۰۸)

اے نوعِ انسان! تمہارے پاس، تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، ایک ضابطہ ہدایت آگیا ہے۔ اس میں ہر اس نفسیاتی کش مکش کا علاج ہے جو انسانوں کے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی اور اس طرح ان کے معاشرہ میں فساد پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ جو اس ضابطہ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں یہ ان پر کامیابیوں اور خوشگوار یوں کی راہیں کشادہ کر دیتا ہے۔

ہاں تمام امور کی وضاحت کے لئے میری کتاب ”انسان نے کیا سوچا؟“ میں سیاست کے متعلق باب دیکھیے۔

اس ایمان کی بنیاد اس علی وجہ البصیرت یقین پر ہے کہ انسان (یا اقوام) کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے متعین ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قوانینِ حقوقِ انسانیت کا احترام اور تحفظ نہیں کرتیں وہ تباہ اور برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان کا عسکری ساز و سامان اور سیاسی مہرہ بازیاں انہیں اس تباہی سے نہیں بچا سکتیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے، جو نہ کبھی کسی کی خاطر بدلا ہے نہ کبھی بدلے گا۔ یہی وہ ایمان (یا فلسفہ زندگی) ہے جس سے حقوقِ انسانیت کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ اسی ایمان کو ایک زندہ حقیقت بنانے اور اسے عملی پیکر میں لانے کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، تاکہ اس آزاد مملکت میں انسانی حقوق کا تحفظ ہو سکے۔

پاکستان کی ضرورت

اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ان حقوق کا تحفظ ہے، بلکہ اس کی ہستی کی وجہ جو انہی پر ہے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے طلوعِ اسلام نے تحریکِ پاکستان کی اس شہد و مد سے حمایت کی تھی اور یہی وہ نصب العین ہے جس کی طرف یہ مسلسل دعوت دیتا چلا آ رہا ہے۔ یہ مقصدِ عظیم اُس وقت حاصل ہو گا جب اس خطہ زمین میں قرآنی نظامِ زندگی قائم ہو گا کہ وہی، اور صرف وہی نظام، احترامِ آدمیت کا ضامن اور حقوقِ انسانیت کا محافظ ہو سکتا ہے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

(نومبر ۶۰ء ۱۹۷۰ء)

آپ کسی سے بات کیجئے اور زندگی کے کسی شعبے سے متعلق کیجئے، چل گفتگو یہ ہوگا کہ ہمارے دل لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ گھر کے افراد میں کیریکٹر نہیں، اہل محلہ میں کیریکٹر نہیں، کاروباری دنیا میں کیریکٹر نہیں۔ دفاتر میں، عدالتوں میں، ایوانِ حکومت میں، اربابِ نظم و نسق میں، غرضیکہ کہیں بھی کیریکٹر نہیں ملتا۔ آپ کسی خرابی کا تجربہ کریں، کسی شکایت کے بنیادی سبب کا سراغ لگائیں، آخر الامر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ سب کیریکٹر کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ قوم کے زوال کا باعث ہے تو یہی مرض اور پاکستان کی تباہی کا موجب ہے تو یہی علت۔ یہ لوگ، قوم اور ملک کو گھس کی طرح اندر ہی اندر کھاٹے جا رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قصرِ حیات کا ہر ستون کھوکھلا ہو چکا ہے اور ہر قلبِ حساس اس خطرے سے متوحش ہے کہ کہیں ذرا سا بھی جھٹکا لگا تو یہ عمارت چھت سمیت نیچے آگرے گی۔

کیریکٹر کیوں نہیں | کیریکٹر کے متعلق ہم گفتگو تو اس شرح و بسط سے کرتے ہیں، لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیریکٹر کب سے ہے تو شاید سو میں سے ایک آدھ بمشکل بتا سکے گا کہ اس کا متعلق مفہوم کیا ہے۔ جو کچھ عام طور پر کہا جائے گا وہ یہی ہوگا کہ جب تک کسی کو رشوت نہ دی جائے کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنیں گے کہ صاحب! اس موجودہ افسر سے تو وہی افسر اچھا تھا جو دس روپے لے کر کام کر دیتا تھا۔ اس کے ہاتھوں تو دنیا تنگ آچکی ہے۔ جس کی مثل اس

کے سامنے ہذا اس کے متعلق یہ پہلے پتہ کرتا ہے کہ اس نے پچھلے الیکشن میں ووٹ کسے دیا تھا؟ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جس مقام پر کسی کے کام میں کوئی رکاوٹ پڑے یا اسے کوئی نقصان ہو، تو وہ کہہ دیگا کہ لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کیریکٹر کی یہ تعریف (DEFINITION) تو بے معنی ہے؟ لہذا، سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کتنے کسے ہیں؟

علمی نقطہ نگاہ سے اس سوال کا تعلق اخلاقیات (ETHICS) سے ہے
کیریکٹر کی تعریف لیکن علمائے اخلاقیات بھی جس انداز سے کیریکٹر کی تعریف (DEFINITION)

بیان کرتے ہیں اس سے عام لوگوں کے لئے بات صاف نہیں ہوتی۔ مثلاً (SOREY KIERKE GARRD) کے نزدیک:-

”اخلاق کیریکٹر کا نام ہے اور کیریکٹر وہ ہے جو انسان کی ذات کے اندر منقوش ہے۔ کیریکٹر درحقیقت داخلیت کا نام ہے۔ بد اخلاقی بھی تو انائی کی حیثیت سے کیریکٹر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ تو اچھے اخلاق کا مالک ہے اور نہ ہی بُرے کا، تو وہ انسان نہیں حیوان ہے۔“

(THE PRESENT AGE)

پروفیسر وائٹ ہیڈ کے نزدیک کیریکٹر، صداقت (TRUTH) کے مظاہرہ کا نام ہے اور ”جب ظاہر (APPEARANCE) حقیقت (REALITY) کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو اسے صداقت کہتے ہیں“ (ADVENTURES OF IDEAS)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ کیریکٹر درحقیقت خیر (GOOD) اختیار کرنے کا نام ہے۔ خیر کے معنی ہیں ایسا سفر جس میں ہر قدم نزل مقصود کی طرف اٹھے اور شر کے معنی ہیں انسانی ممکنات کا بگولے کا سارِ قص۔ (BETWEEN MAN AND MAN)

بارڈیو کے نزدیک ”اپنے آپ پر قابو پانے کا نام کیریکٹر ہے۔ اس کی تائید (ALEXANDAR LOVEDAY) بھی کرتا ہے۔ (TEINER) کا قول ہے کہ

”انسانی ماحول کے متعلق انسان کا وہ رویہ جو مستقل ہو اور اس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے، کیریکٹر کہلاتا ہے۔“

(THE CONCEPT AND EDUCATION OF CHARACTER)

آپ نے دیکھا کہ کیریکٹر کی ان (DEFINITIONS) سے بات صاف نہیں ہوتی۔ آئیے ذرا عام فہم الفاظ میں دیکھیں کہ کیریکٹر کا مفہوم کیا ہے۔



ہمارے دل ایک عام محاورہ ہے۔۔۔۔۔ مال صدقہ، جان، جان صدقہ، آبرو۔۔۔۔۔ اس محاورہ کا پہلا حصہ بالکل واضح ہے، یعنی مال بھی اپنی قیمت رکھتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے جہل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہیئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز باقی رہ سکتی ہے تو اس وقت جان کی حفاظت کے لئے مال کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے۔۔۔۔۔ یعنی جان کی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بڑا بلند ہے، نہ ہی اس شخص کے متعلق جو جان دے دیتا ہے لیکن پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست تھا۔ آپ نے اس بنیئے کا قصہ سنا ہوگا جو سخت بیمار ہو گیا اور اس کا بیٹا سول سرجن کو بلا لایا۔۔۔۔۔ اس لئے نہیں کہ اس کے علاج سے اس کے باپ کو شفا ہو جائے گی بلکہ اس لئے کہ برادری والے یہ نہ کہیں کہ اس نے باپ کا اچھی طرح علاج نہیں کرایا۔۔۔۔۔ سول سرجن نے مریض کو دیکھا، مرض کی تشخیص کی، پھر نسخہ لکھا جس میں مختلف قسم کی قیمتی دوائیں تجویز کیں۔ ڈاکٹر رخصت ہوا تو بیٹا نسخہ لے کر بازار کو چلا گیا باپ نے آواز دی اور پوچھا کہ کہاں چلا جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بازار سے دوائیاں خریدنے جا رہا ہوں تاکہ علاج شروع کیا جائے۔ باپ نے کہا کہ یونہی بلا پوچھے گچھے دوائیاں نہ خریدنا۔ پہلے پنڈت جی کے پاس جانا اور معلوم کرنا کہ کربا کرم، (تجہیز و تکفین) پر کیا خرچ ہوگا اور پھر دوائیوں کی قیمت دریافت کرنا۔ دونوں میں جو طریق سستا ہو اسے اختیار کرنا۔

آپ کو بنیئے کی اس بات پر بے اختیار ہنسی آجائے گی۔ لیکن آپ اس کے متعلق یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا کیریکٹر پست تھا۔ آپ یہی کہیں گے کہ وہ بڑا بے وقوف تھا۔ جان کی حفاظت۔۔۔۔۔ ایک جذبہ ہے جو ہر ذی حیات میں جیتی طور پر۔۔۔۔۔ (PRESERVATION OF SELF)

پایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ (BY INSTINCT) چونٹی کو دیکھئے انھنی سی جان ہے، لیکن اگر کوئی اس کے راستے میں ذرا سی رکاوٹ بھی ڈالے جس سے اسے خطرہ محسوس ہو تو وہ اپنی حفاظت کے لئے کس قدر ہاتھ

پاؤں مارتی ہے؛ یہ جذبہ تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر انسان بھی اپنی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے تو اس میں بلندی اخلاق کی کوئی بات نہیں۔ یہ حیوانی سطح زندگی کے ایک جبلی جذبہ کا مظاہرہ ہے۔ جو انسان اس کے خلاف کرتا ہے اسے عقل و سوش سے عاری سمجھا جاتا ہے۔ جو اپنے آپ کو نقصان پہنچائے اسے پاگل کہتے ہیں۔

جان صدقہ آبرو

اب اس محاورے کے دوسرے حصے کو لیجئے، یعنی ”جان صدقہ آبرو“ اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بھی اپنی قیمت رکھتی ہے اور اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسا وقت آجائے کہ جان اور آبرو میں (TIE) پڑ جائے، جب ان دونوں میں سے صرف ایک کو بچایا جاسکتا ہو تو پھر انسان کو چاہیے کہ جان دے دے، لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے دے۔ جو شخص آبرو کو بچانے کے لئے جان دے دیتا ہے، ساری دنیا اس کے متعلق کہتی ہے کہ اس نے بلند کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آبرو کو جانے دے اور اپنی جان بچالے، اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہر شخص کہتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جان بچانے کا جذبہ ہر انسان میں جبلی طور پر پایا جاتا ہے۔ اس لئے جو شخص (مثلاً مال کی قربانی سے) جان بچا لیتا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ اس کے برعکس آبرو کا تعلق حیوانی دنیا سے نہیں۔ حیوانات، آبرو کے تصور سے بھی آشنا نہیں ہوتے۔ یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔ اس کا تعلق شرفِ انسانی سے ہے۔ اس لئے جو شخص جان دے کر شرفِ انسانی کو بچا لیتا ہے، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ آبرو انسانی قدر (HUMAN VALUE) ہے۔ اس قسم کی اقدار بھی ہیں جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔ ان اقدار کا تحفظ زندگی کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لے جاتا ہے۔ لہذا بات یوں ہوئی کہ جو شخص کسی انسانی قدر کی حفاظت کے لئے اپنے طبعی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے، اسے کیریکٹر والا انسان کہتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اسی اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

کیریکٹر کی تعریف

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ آبرو کے تحفظ کے لئے جان دے دینے والا، صاحبِ کردار کہلاتا ہے۔ آبرو ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق انسانیت کے مختلف گوشوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ خدا نے میری آبرو

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ آبرو کے تحفظ کے لئے جان دے دینے والا، صاحبِ کردار کہلاتا ہے۔ آبرو ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق انسانیت کے مختلف گوشوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ خدا نے میری آبرو

رکھ لی تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے ہم عصروں میں شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ لیکن آبرو کا ایک مفہوم ایسا ہے جو بہت نمایاں ہے۔ اس کا تعلق عفت و عصمت سے ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لئے جان تک دے دی تو اس سے عفت و عصمت ہی مقصود ہوتی ہے۔ آبرو کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر ان مثالوں پر غور کیجئے جو ابھی بیان کی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں اگر کوئی بد باطن کسی شریف زادی کے بڑے کی طرف بھی بُری نگاہ سے دیکھے تو اس لڑکی کا باپ یا بھائی اس شخص کو گولی مار دے گا، خواہ اس کے لئے اسے پھانسی کے تختے پر بھی کیوں نہ چڑھنا پڑے۔ لیکن یورپ میں کوئی لڑکی اپنے آپ کو کسی نوجوان کی آغوش میں بھی کیوں نہ دے دے اُس کے باپ یا بھائی کی پیشانی پر شکن تک نہیں پڑے گی، بلکہ وہ خوش ہوں گے۔

آبرو کا معیار

کہ ان کی لڑکی (یا بہن) سوسائٹی میں بڑی ہرولہ رہے (POPULAR) ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا (BOY FRIEND) تلاش کر لیا ہے۔

اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ جو شخص کسی انسانی قدر (HUMAN VALUE) کی حفاظت کرتا ہے اُسے کیریکٹر کا مالک قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مثال ابھی ابھی ہمارے سامنے آئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ "انسانی اقدار" ہر معاشرہ (SOCIETY) کی اپنی اپنی ہیں۔ ایک قدر جو ہمارے معاشرہ میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے، دوسرے معاشرہ میں اسے قدر ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف معاشروں میں کیریکٹر کا معیار مختلف ہوگا۔ اور ہم کسی چیز کو انسانی کیریکٹر یا عالمگیر کیریکٹر قرار نہیں دے سکیں گے۔ ہم ماں باپ کی اس قدر عزت اور تعظیم کرتے ہیں، لیکن ایسے قابل بھی گذرے ہیں جو ماں باپ کو کھا جانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔ مقدس (PURITANS) حبشی بچوں کو چرا کر لے جانے اور آئرستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں ایک دوسرے سے سو لینا معیوب بلکہ جرم تھا لیکن غیر یہود سے سود لینے کی عام اجازت تھی۔ بجر الکاهل کے قریب ایک قبیلہ ہے جس کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق سمجھی جاتی ہے جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہوا ہے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ٹھگوں کے ہاں وہ نوجوان سب سے زیادہ قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے جو مظلوم راہرو کو پُرفریب طریق پر قتل کر ڈالے۔

اقدار مختلف ہیں

کو کھا جانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔ مقدس (PURITANS) حبشی بچوں کو چرا کر لے جانے اور آئرستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں ایک دوسرے سے سو لینا معیوب بلکہ جرم تھا لیکن غیر یہود سے سود لینے کی عام اجازت تھی۔ بجر الکاهل کے قریب ایک قبیلہ ہے جس کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق سمجھی جاتی ہے جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہوا ہے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ٹھگوں کے ہاں وہ نوجوان سب سے زیادہ قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے جو مظلوم راہرو کو پُرفریب طریق پر قتل کر ڈالے۔

دوسرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے انسانوں کا طرزِ معاشرت اور اندازِ بود و باش مختلف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اقدار مختلف نہیں ہو سکتیں۔ انسانی اقدار ہر جگہ ایک ہی ہونی چاہئیں اور ایسی ہونی چاہیے جن میں کوئی رد و بدل نہ کر سکے۔ یہ اقدار عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ آج یہ اقدار قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضابطہ و ہدایت ہے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام کیریکٹر ہے۔ قرآن اسے ”تقویٰ“ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ مغرب کے مشہور عالمِ اخلاقیات راشڈل (HASTING RASHDAL) کے الفاظ میں :-

”اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔“ (THE THEORY OF GOOD AND EVIL VOL. II P-286)

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے یہ اقدار عقلِ انسانی کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ اس باب میں راشڈل کہتا ہے :-

”اس قسم کا اخلاقی قانون کسی انسانی شعور سے نہیں مل سکتا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان اخلاقیات میں کبھی ایک ہی نگاہ رکھیں گے۔“ (ایضاً۔ ص ۳۱)

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان اقدار کا نعتن انسان کی انسانی سطحِ زندگی (HUMAN LEVEL OF LIFE)

سے ہے۔ حیوانی سطح سے نہیں۔ حیوانی سطحِ زندگی کو طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کہہ لیجیے۔

قرآن اسے ”حیوة الدنیا“ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے، جس سے مراد ہے ایسی زندگی جس میں انسان کی نگاہ قریبی یا پیش پا افتادہ مفاد پر ہی رہے۔ (لفظ دنیا کے معنی ”قریب تر“ کے ہیں) انسان کو اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں بڑی لذت ملتی ہے۔ (اگرچہ یہ لذت بڑی سطحی ہوتی ہے) قرآن کی رو سے ان لذات کا حصول بڑی چیز نہیں، وہ انہیں وجہِ جاذبیت قرار دیتا ہے۔ لیکن اصل سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس سطحِ زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی قدر (TIE) پڑتی ہے۔ اس دقت اگر کوئی شخص اس حیوانی تقاضے کو ترجیح دے کر انسانی قدر کو قربان کر دیتا ہے تو وہ بلندیِ کردار کا ثبوت نہیں دیتا۔ لیکن اگر وہ انسان قدر کے تحفظ کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے کیریکٹر کہا جائے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں

ہے۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! تم عدل و انصاف کی پوری پوری حفاظت کرو۔ شَهِدَاةَ اللَّهِ۔ اگر تمہیں کبھی گواہی دینی پڑے تو اپنے اور بیگانے سب کے خیال سے بلند ہو کر صرف اللہ کے لئے شہادت دو۔ وَلَا تَوَعَّلَىٰ أَنْفُسُكُمْ أَوْ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ۔ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف۔ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا۔ خَالِدًا أَوْ لِي بِهَمَّا۔ اس کا بھی خیال نہ کرو کہ جس کے حق میں تمہاری شہادت جارہی ہے، وہ امیر ہے یا غریب۔ قانونِ خداوندی، امیر اور غریب دونوں کا سب زیادہ محافظ اور چارہ ساز ہے۔ لِهَذَا خُذُوا حَقَّ سَبْكِ زَيْدِهِ۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا۔ دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اپنے مفاد، رشتہ داری کے تقاضے، یا دو لہتمندی کی وجاہت کا خیال، تمہیں انصاف سے روک دے۔ اس باب میں تم اپنے کسی جذبے کی پروا مت کرو۔ وَإِنْ تَلَوْا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَاتِبٌ لِّمَا تَعْمَلُونَ خَيْرًا۔ (۴/۱۳۵) ایسا بھی نہ ہو کہ تم شہادت دیتے وقت کوئی گول مول یا پیچیدہ بات کہو یا ویسے ہی ٹال جاؤ۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ آپ دیکھئے کہ یہاں حیوانی اور انسانی اقدار میں کس طرح (TIE) پڑتی ہے۔ عدل کی پابجانی اور اس کے لئے سچی شہادت مستقل اقدار میں سے ہے۔ اس کے برعکس، مفاد خویش، اعزاء و اقرباء کے تعلقات کا خیال، فریقِ مخالف کی دولت اور وجاہت کے اثرات کا تصور، قدم قدم پر خفاں گیر ہو رہا ہے کہ اگر سچی گواہی دی تو یہ نقصان ہوگا، وہ ضرر پہنچے گا۔ لیکن ان تمام نقصانات کا تعلق انسان کی طبعی زندگی سے ہے۔ اس کش مکش میں جو شخص ان طبعی تقاضوں کو ترجیح دے کر جھوٹی شہادت دیتا ہے، یا شہادت دینے سے پہلو تہی کرتا ہے، اس کا کیریکٹر پست ہے (قرآن اسے اتباعِ ہویٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ ہویٰ کے بنیادی معنوں میں پستی کی طرف لے جانے کا مفہوم ہے)۔ لیکن جو شخص ان تمام امیال و خواہشات کو نظر انداز کر کے حق کی گواہی دیتا ہے وہ بلند کردار کا حامل ہے۔ حیوانی جذبات اور انسانی افتداری کی یہ جنگ زندگی کے ہر دورا ہے پر ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان دورا ہوں پر آپ کا قدم کس طرف اٹھتا ہے۔

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ انسان اپنے طبعی (حیوانی) تقاضے کو قربان کر کے انسانی اقدار کی حفاظت کیوں کرے؟ طبعی تقاضوں میں بڑی کشش و جاذبیت ہوتی ہے۔ دولت، ثروت، عیش و آرام کی زندگی، عزت اور نام

کی شہرت، بلند مناصب و مدارج، قوتِ اقتدار، حکومت، ان سب میں بڑی جاذبیت ہے۔ ان کے مقابلہ میں انسانی اقدار کے تحفظ میں کونسی لذت یا منفعت ہے، جس کی خاطر انسان ان تمام مفاد و منافع اور لذات و حظائے کو قربان کر دے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور جب تک اس کا اطمینان بخش جواب سامنے نہ آئے انسان اس قدر منافع و لذات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آج دنیا میں جو اس قدر کیریکٹر کا فقدان نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ انسان مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ ذاتی مفاد کا خیال اس کے دل سے نکالا نہیں جاسکتا۔ وہ مفادِ خویش کی خاطر انسانی اقدار کی اس لئے پروا نہیں کرتا کہ اسے ان اقدار کی نگہبانی میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے اس امر کا یقین ہو جائے کہ انسانی اقدار کا تحفظ، حیوانی تقاضوں کی تسکین کے مقابلے میں زیادہ منفعت بخش ہے تو وہ یقیناً ان اقدار کے تحفظ کے لئے وہ سب کچھ کر گزیرے گا جو وہ آج اپنے حیوانی مفاد کے تحفظ کے لئے کرتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔۔۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔

ایک شخص کئی دنوں کا بھوکا ہے، اتنا بھوکا کہ نقاہت کی وجہ سے اس سے اٹھا تک نہیں جاتا۔ اتنے میں ایک آدمی، گرم گرم پلاؤ کا قاب اس کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قاب پر جھپٹ پڑے گا۔ وہ جلدی سے لقمہ اٹھاتا ہے اور اُسے منہ کے قریب لے جاتا ہے کہ دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں اور تو ہر چیز نہایت عمدہ اور خالص ہے لیکن غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سننے کے بعد، وہ اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دیگا؟ وہ یقیناً قاب اٹھا کر پھینک دے گا۔ وہ اس پلاؤ کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ بھوک کی تکلیف اور زندگی کے زیاں کا مقابلہ کرے گا اور اپنا فائدہ اسی میں دیکھے گا کہ بھوک کی تکلیف برداشت کر لے لیکن اپنی جان ضائع نہ کرے۔

اب اسی مثال میں اتنی سی تبدیلی کر لیجئے کہ جب اس نے پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تو دوسرے شخص نے کہا کہ بھئی! یہ پلاؤ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہے حرام کی کماٹی کا۔ اب سوچیے کہ وہ شخص اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ پلاؤ ضرور کھا لے گا اور اس بات کی ہزار تاولیں کرے گا کہ

وہ جائز کمائی کا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے پلاؤ دکھا لینے میں تو اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن اسے چھوڑ دینے میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اس پلاؤ کے کھانے سے بھی اس کی ہلاکت ہو جائے گی تو وہ اُسے اسی طرح اٹھا کر پھینک دیتا جس طرح اس نے سنکھیا والے پلاؤ کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

سوال سارا یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں تضادم ہو جائے، اگر اس وقت انسان کو یہ یقین ہو کہ اس قدر کی حفاظت میں اس کا زیادہ فائدہ ہے تو وہ یقیناً اس کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضے کو قربان کر دے گا۔ آئیے یہ دیکھیں کہ اس مقصد کے لئے عام طور پر کیا کہا جاتا ہے اور قرآن اس اہم گتھی کو کس طرح سلجھاتا ہے۔ اخلاقیات کا سارا راز اسی میں ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جواب

جن لوگوں کے نزدیک انسانی اقدار اپنا وجود ہی نہیں رکھتیں، سرِ دست انہیں چھوڑیے اور ان کی طرف آئیے جو ان اقدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ وہ ہے جسے عام طور پر ”مذہب پرست“ یا خدا پرست کہا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن امور کو انسانی اقدار کہا جاتا ہے وہ خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت سے خدا خوش ہو جاتا ہے اور اگر اس کے احکام کو نہ مانا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ لہذا انسان کو خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ اس انداز کے جواب سے انسان اُس زمانے میں تو مطمئن ہو سکتا تھا، جب اس کا ذہن سنوڑ عہد طفولیت میں تھا، لیکن اب یہ جواب اس کے لئے دجہ دھماکت نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک بچے سے تو ڈرا دھمکا کر اپنا حکم منوا سکتے ہیں، بڑے آدمی سے نہیں منوا سکتے۔ بڑا آدمی اگر بعض حالات میں اس کے لئے آمادہ ہو بھی جائے، تو بھی اس کا دل اس کے خلاف بغاوت کرتا رہے گا اور اس موقع کی تلاش میں رہے گا کہ وہ ڈر کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو بات محض کسی کے ڈر سے کی جائے، اس میں کیڑ بکیر کی بلندی کا کیا سوال؟ لہذا مذہب پرست طبقہ کا یہ جواب، اس مقصد کے حصول کے لئے اطمینان بخش ثابت نہیں ہو

سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مذہب کی گرفت دلوں پر سے ڈھیل پڑ رہی ہے۔

مفکرین کا طبقہ | دوسرا طبقہ مفکرین کا ہے۔ اس باب میں ان کا کیا خیال ہے، اس کے متعلق بہت سے مفکرین مغرب کے اقوال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس سے بات لمبی ہو جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں ایک آدھ مفکر کا نظریہ پیش کر دیں تو مقصد پیش نظر کے لئے وہی کافی ہو گا۔ مغربی مفکرین میں جو مقام کانت کو حاصل ہے وہ ارباب فکر سے پوشیدہ نہیں۔ کانت کے نزدیک اخلاقیات کی ساری عمارت انسان کے نیک ارادے (GOOD WILL) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”اس دنیا میں، بلکہ اس سے باہر بھی کوئی چیز ایسی نہیں جسے بلا مشروط خیر محض کہا جاسکے، سوائے نیک ارادے کے“

اور نیک ارادے کی تعریف (DEFINITION) کانت کے نزدیک یہ ہے کہ ”وہ ارادہ جو کسی کام کو محض اس لئے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض (DUTY) ہے۔“ یعنی ہر قسم کے افادی تصور سے بے نیاز ہو کر، فرض کو محض فرض سمجھ کر ادا کرنا، نیک ارادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس عمل میں (خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو) ذرہ بھر بھی صلہ کی امید یا معاوضہ کا تصور شامل ہو جائے وہ عمل، عمل خیر نہیں رہتا۔ اس کے نزدیک عمل خیر کی قیمت وہ اصول ہوتا ہے جس کے مطابق وہ عمل ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت کانت کے نزدیک، اصول بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لئے آمادہ عمل کریں۔ انہیں کانت مادی اصول (MATERIAL MAXIMS) قرار دیتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی مقصد کے تصور کے بغیر آمادہ عمل کریں۔ ان کا نام اُپری کی اصطلاح میں (A PRIORI MAXIMS) ہے۔ اس کے نزدیک اصول انسان کے اندر فرض (DUTY) کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اصول کو وہ امر غیر مشروط (CATEGORICAL IMPERATIVE) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

”امر غیر مشروط سے مفہوم یہ ہے کہ اس سے ایسا کام ظہور میں آئے جس سے کسی مقصد کا حصول مقصود نہ ہو، بلکہ وہ کام اپنی ذات میں واجب العمل ہو۔“

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اگر اسے عام فہم الفاظ میں بیان کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ انسانی اقدار انسان کیلئے فرائض ہیں۔ انہیں انسان کو فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ ان کے ”فرائض“ ہونے کے لئے نہ کوئی دلیل دی جا سکتی ہے اور نہ ہی ان فرائض کی سرانجام دہی سے کسی صلہ یا معاوضہ کی توقع رکھنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ فکری طور پر کتنا ہی بلند آہنگ اور خوش آئند کیوں نہ ہو، انسان کے دل میں ایسی چگاری پیدا نہیں کر سکتا جس سے وہ مادی مفاد اور طبعی لذات کو قربان کر کے انسانی اقدار کے تحفظ کے لئے آمادہ عمل ہو جائے۔ اس کے لئے کسی بڑے جذبہ محرکہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ انسان ”مفاوہ خورش“ کے خیال سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ (ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن ہو کر) کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نہ فلاسفر کے بلند آہنگ نظریات اور نہ تارک الدنیا اور بابِ تصوف کے کیف آور پند و نصائح انسانوں کو ”مفاوہ خورش“ سے بے نیاز کر کے مستقل اقدار کے محافظ بننا سکے۔ ان کی کامیابی زیادہ سے زیادہ چند افراد تک محدود رہی ہے، زندگی کا مسدک نہیں بن سکی۔ ان میں زندگی کا عالمگیر مسک بننے کی صلاحیت صرف اس اصول میں ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے متعلق دو نظریے ہیں۔

قرآن کی رو سے زندگی کے دو نظریے

ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی طرح

ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس طبعی زندگی ہے۔ یہ طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے، اور انہی قوانین کے تابع ایک دن اس کے جسم کی مشینری چلتے چلتے بند ہو جاتی ہے اسے موت کہتے ہیں۔ اور موت کے ساتھ اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصویرِ زندگی کے مطابق

انسان کے سب تقاضے حیوانی سطحِ زندگی کے تقاضے ہیں۔ اس میں انسانی

اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے اور اس طرح رہنے سے ان کے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں ایک دوسرے سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس لئے سوسائٹی ایسے قوانین و ضوابط مرتب کرتی رہتی ہے جن سے ان تصادمات کا امکان کم ہو جائے۔ جو شخص ان قوانین و ضوابط کے مطابق

زندگی بسر کرتا ہے اسے پُر امن شہری کہا جاتا ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ عدالت میں سزا پاتا ہے یا سوسائٹی کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصورِ حیات کی رُو سے

۱۔ سوسائٹی کے پاس کوئی مستقل اقدار یا اصول نہیں ہوتے۔ وہ جس قسم کے قوانین و ضوابط مناسب سمجھے وضع کرے اور جب چاہے ان میں تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کر لے۔

۲۔ ان قوانین و ضوابط کے اتباع کے لئے جذبہ محرکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے عدالت سے سزا مل جائے گی یا انسان سوسائٹی کی نظروں سے گر جائے گا۔ لہذا:

۳۔ اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے لیکن عدالت کی گرفت میں نہ آئے یا سوسائٹی اس کا محاسبہ نہ کرے تو پھر اسے ان قوانین کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

۴۔ اس سوسائٹی میں کیریکٹر کی بندی کا معیار صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ذاتی مفاد کو قوم اور ملک کے مفاد پر ترجیح نہ دے۔ ان کے ہاں قوم فروشی، قانونی جرم بھی ہوتا ہے اور سوسائٹی کی نظروں میں معیوب بھی۔ لیکن اگر کسی ملک میں قانونی نظام کمزور ہو جائے اور مفادِ خویش کا جذبہ ایسا عام ہو جائے کہ سارے کا سارا ملک اس کو میں بہہ نکلے تو پھر نہ کوئی قوت ایسی رہتی ہے جو افرادِ قوم کو اس لوٹ سے باز رکھ سکے اور نہ کوئی جذبہ محرکہ ایسا جو ان کے اندر کیریکٹر کے احساس کو بیدار کر سکے۔

اس وقت دنیا جس جہنم میں سے گزر رہی ہے، اس کی وجہ، زندگی کا یہی تصور ہے۔

جن قوموں میں قومی مفاد کا شعور بیدار ہے وہ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کے لئے عذاب

بن رہی ہیں۔ اور جن میں یہ شعور بھی باقی نہیں رہا وہ ایسے جذام میں مبتلا ہیں جس سے وہ اپنے آپ سے بھی نالاں ہیں اور ساری دنیا بھی اس سے نفرت کرتی ہے۔

کیریکٹر کی اس تعریف (DEFINITION) کی رُو سے، جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس

تصورِ حیات کے مطابق کسی شخص میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر انسان (یا انسانوں کا گروہ) اپنے طبعی مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ جب دو (طبعی) مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو تو وہ دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور زیادہ فائدے کو محسوس کرے یا فائدے پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے آپ عقلِ مندی کہیں گے کیریکٹر نہیں کہیں گے۔ حتیٰ کہ اس تصور کے ماتحت اگر کوئی شخص قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتا ہے تو وہ بھی ایک زیادہ قیمتی طبعی تقاضے کو کم قیمتی طبعی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے۔ (تفصیل

اس کی آگے چل کر پیش کی جائے گی۔



دوسرا تصورِ حیات

یہ تھا ایک تصورِ زندگی اور اس کے نکلنے و حواقب کا بیان۔ قرآن کی رو سے دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت

نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY)

یا نفس کہتے ہیں۔ قرآن اسے رُوحِ خداوندی (DEVINE ENERGY) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے۔ چونکہ اس کی نشوونما کیلئے جسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس کے ساتھ جسمانی نشوونما بھی ضروری ہے۔ لیکن جسمانی نشوونما

ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں مقصود بالذات انسانی ذات کی نشوونما ہی ہے۔

آپ کسی انسان کے دل کو ٹٹولیے اور دیکھئے کہ اس کی عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کیا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ انسان کی سب سے زبردست خواہش یہ ہے کہ وہ زندہ رہے۔ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ تحفظِ غلش اس کی جبلت کا تقاضا ہے اور اس کی عقل وہ تمام سامان و ذرائع بہم پہنچاتی ہے جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے قرآن نے قصہ آدم کے پیشانی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپا۔ وہ اس کے پاس گیا اور نہایت مشفقانہ انداز میں کہا کہ کیا تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے اور ایسا اقتدار مل جائے جسے کبھی زوال نہ ہو؟ یہ آدم (آدمی) کے دل کی خواہش تھی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور ابلیس سے کہا کہ مجھے ضرور ایسا نسخہ بتاؤ۔ ابلیس نے کہا تم اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعہ زندہ رہ سکتے ہو۔ اس سے تمہارے نام کو حیاتِ دوا حاصل ہو سکتی ہے۔ ابلیس کا یہ افسوس کس درجہ کارگر ہوا، اس کا ثبوت روزِ مرہ کی زندگی میں قدم قدم پر مل سکتا ہے۔ جس عمر رسیدہ آدمی کے ہاں اولاد (بالخصوص نرینہ اولاد) نہیں ہوتی، دیکھئے کہ وہ بیٹے

کے لئے کس قدر تڑپتا ہے۔ وہ ہر سانس میں کہتا ہے کہ اگر میں اسی طرح مر گیا تو میرے گھر کا چراغ گل ہو جائیگا، میرا نام نشان مٹ جائے گا۔ میرے نسب کا شجرہ منقطع ہو جائے گا۔ میرے خاندان کی جڑ کٹ جائے گی۔

لیکن خدا نے انسان سے کہا کہ یہ ابلیس کا فریب ہے۔ یہ مادی تصورِ حیات کا افسوس ہے۔ باپ کی زندگی اپنی ہے، اولاد کی اپنی۔ اولاد کے زندہ رہنے سے باپ کو حیاتِ جاوید نہیں مل سکتی۔ حیاتِ جاوید حاصل ہونے کا طریقہ کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کی طبعی موت

اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے زندہ۔ انسان کو حیات جاوید انسانی ذات کی نشوونما سے مل سکتی ہے۔ اس نے انسان کی عین ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کی برادری کیلئے یہ طریق بتایا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ زندگی کی موجودہ سطح پر ذات کی نشوونما جسم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے انسانی جسم کا تحفظ اور اس کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے انڈے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو اس کے اندر مضمر حیات ایک جیتے جاگتے چوزے کی شکل اختیار کر لے لیکن اس کے لئے انڈے کے خول کا محفوظ اور مضبوط ہونا ضروری ہے لیکن انڈے کا خول بہر حال انڈے کی امکانی صلاحیتوں کے برومند ہونے کا ذریعہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔ اسی طرح انسانی جسم، اس کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے طبعی قوانین مقرر ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں۔ ان قوانین کو انسانی اقدار یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار وحی کے ذریعہ ملتی ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جس طرح جسم کی پرورش کے قوانین عالمگیر ہیں اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی عالمگیر ہیں۔ ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ جو شخص اس تصویرِ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس کی زندگی (اور زاویہ نگاہ) میں اور اس شخص کی زندگی (اور زاویہ نگاہ) میں جو مادی تصویرِ حیات رکھتا ہے، کتنا وسیع اور گہرا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ مادی تصویرِ حیات کی رو سے انسان کی طبعی زندگی اور تقاضے مقصود بالذات ہوتے ہیں، اس لئے اس کے سامنے نہ طبعی تقاضوں سے بلند کوئی اور تقاضا ہوتا ہے اور نہ طبعی قوانین سے بالاتر

کوئی اور قوانین اور اقدار۔ لیکن

۲۔ قرآنی تصوّرِ حیات کی رُو سے، انسانی جسم اور اس کے تقاضے، مقصود بالذات نہیں ہوتے، ایک بلند مقصد (استحکامِ ذات) کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں اور دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

۳۔ قرآنی تصوّرِ حیات کی رُو سے جسم کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہوتی ہے، لیکن جب کبھی جسم کے کسی تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے (یا طبعی تقاضا اور مستقل انداز کے تقاضا) میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ ذات کے تحفظ کے لئے جسمانی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی صاحبِ عقل و ہوش ”ذریعہ“ کو بچانے کے لئے مقصد کو قربان نہیں کرتا۔ جب اس شخص نے سنکھیا والے پلاؤ کو پھینک دیا تھا تو اس لئے کہ پلاؤ، اس کی جان بچانے کا ذریعہ تھا، لیکن جب وہ ذریعہ اس کی جان کی ہلاکت کا موجب بن گیا تو اس نے جان کی حفاظت کی خاطر ذریعہ کو چھوڑ دیا۔

۴۔ قرآنی تصوّرِ حیات پر ایمان رکھنے والا، مستقل انداز کی حفاظت، کسی کا حکم یا فریضہ سمجھ کر نہیں کرتا۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ وہ طبعی تقاضا اور مستقل انداز کے ٹکراؤ کے وقت، دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان میں سے کس کے تحفظ میں اس کا زیادہ فائدہ ہے۔ وہ طبعی تقاضا کے تحفظ میں طبعی (لہذا عارضی) حیات کا فائدہ دیکھتا ہے اور مستقل انداز کے تحفظ میں، انسانی (لہذا دائمی) حیات کا فائدہ۔ لہذا خود اس کی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ فائدہ کی خاطر کم فائدہ کو قربان کر دے۔ اقبالؒ صرف طبعی تقاضوں کا تحفظ کرنے والی عقل کو ”عقلِ خود“ اور طبعی اور انسانی ذات دونوں کے تقاضوں کا تحفظ کرنے اور ان میں موازنہ کرنے والی عقل کو ”عقلِ جہاں“ کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن طبعی تقاضوں کو قریبی زندگی (حیوة الدنیا) کے مفاد اور انسانی ذات کے تقاضوں کو مستقبل (آخرت) کے مفاد سے تعبیر کرتا ہے اور مومنین کو اولوالالباب کہہ کر پکارتا ہے، یعنی بلند سطح کی عقل کے حامل انسان۔

۵۔ اس سے ظاہر ہے کہ مستقل انداز کا تحفظ، خود انسان کی عقل کا تقاضا ہو جاتا ہے۔ انسانی عقل ہمیشہ مفادِ خویش چاہتی ہے۔ جب وہ دو مفادات میں موازنہ کرتی ہے تو وہ بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو چھوڑ دیتی ہے۔ حیوانی سطح زندگی پر انسان کی عقل کا درجہ پست ہوتا ہے۔ انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ مومن کی عقل، بلند سطح کی عقل ہوتی ہے۔

۶۔ جو کام عقلِ خود میں کے تقاضے سے کیا جائے اسے (عام اصطلاح کے مطابق) عقلِ مندی کہا جائے گا۔ سیکس جو کام

عقل جہاں ہیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے عقل مندی اور کردار دونوں کا مجموعہ قرار دیا جائے گا۔ مومن کے ہاں ایمان اور عقل میں قطعاً مغائرت نہیں ہوتی۔

=

نصیر حیاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ جب تک انسان اس تصورِ حیات پر ایمان نہ لائے (اس کی صداقت کا یقین نہ کرے) کہ

۱۔ انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں، جسم کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے جس کی نشوونما مقصودِ زندگی ہے۔

ایمان کی ضرورت | ۲۔ ذات کی نشوونما کے لئے اسی طرح قوانین مقرر ہیں جس طرح جسم کی پرورش کے لئے ان قوانین کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

۳۔ یہ مستقل اقدار خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ اور

۴۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔

اُس وقت تک اُس کیریکٹر کا سوال ہی سامنے نہیں آتا جس کا تعلق عالمگیر شرفِ انسانیت سے ہے۔
راشدِ دل لکھتا ہے کہ مستقل اقدار ماننے کے لئے

۱۔ سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات بلا مقصود نہیں پیدا کی گئی، بلکہ اس کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ وہ سامانِ فراہم کرے جس سے انسانی ذات منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔

۲۔ دوسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسانی ذات۔

(۱) ایک مستقل حقیقت ہے۔

(ب) اس کی اپنی مستقل زندگی ہے، یعنی مادی جسم کے تغیرات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔
(ج) یہ اپنے تمام افعال کی سبب آپ ہے۔

۳۔ تیسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان کے موجودہ عمل اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں، یعنی جس قسم کے اس کے اعمال "آج" ہوں گے اسی قسم کا اس کا "کل" ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا۔ اس لئے کہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آ سکتی ہے جب انسان زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ ورنہ جو شخص یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ ہی میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سرکھپانے کی کیا ضرورت ہے۔

۴۔ اور سب سے ضروری یہ کہ خدا پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لئے کہ اخلاقی آئیڈیل، نفس (MIND) کے علاوہ اور کہیں موجود ہی نہیں ہو سکتا، اور ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل، نفس مطلق میں ہی موجود ہو سکتا ہے جو ہر حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ (ایضاً - ص ۲۲۰ - ۲۲۱)

آپ نے غور کیا کہ کیریکٹر کے لئے ایمان، کس قدر لاینفک شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر جگہ "عَمَلُوا الصَّالِحَاتِ" سے پہلے "الَّذِينَ آمَنُوا" کہتا ہے۔

اب آپ اس نکتہ کی طرف پھر آجائیے جسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ انسان ایسے کام کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ دو شخص دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس سے انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں ان کا فائدہ ہے۔ ایک کاروباری آدمی کچھ خلافتِ قاعدہ مراعات حاصل کرنے کے لئے ایک اچھی خاصی رقم بطور رشوت پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ رشوت کی رقم فوراً قبول کر لے گا، بشرطیکہ اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ وہ رشوت اس لئے لے گا کہ اس میں اس کا مالی فائدہ ہے لیکن وہ شخص جو انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے کبھی رشوت قبول نہیں کرے گا اس لئے کہ اسے دیا نثار رہنے میں فائدہ نظر آتا ہے کہ رشوت لینے سے اسے طبی فائدہ ہوگا لیکن اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ دوسری طرف رشوت دینے سے اس کا طبی نقصان تو ہوگا لیکن اس کی ذات کا فائدہ ہوگا۔ وہ طبی فائدہ اور ذات کے فائدہ میں موازنہ کرے گا اور چونکہ اس کے نزدیک ذات کا فائدہ بہر حال وہ بہر کیف زیادہ گراں بہا ہوتا

ہے، اس لئے وہ زیادہ فائدے کے لئے کم فائدے کو ٹھکرا دے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایمان سے انسان کے ”مفادِ خویش“ کے جذبہ کی تسکین بھی کس طرح ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس کا جذبہ محرکہ بھی ”مفادِ خویش“ ہی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ مفاد اور مفاد میں فرق کرتا ہے۔ وہ طبعی جسم کے فائدے کے مقابلے میں ذات کے فائدے کو زیادہ قیمتی

مفاد اور مفاد میں فرق

سمجھتا ہے اس لئے کم فائدے سے صرف نظر کر کے زیادہ فائدے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لہذا وہ رشوت کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اس کام کو نہ تو اس لئے کرتا ہے کہ یہ کسی کا ”حکم“ ہے اس لئے اس کی تعمیل ضروری ہے، نہ اس لئے کہ ایسا کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ اسے اس لئے کرتا ہے کہ ایسا کرنے میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ اس میں ڈر کا پہلو بھی ہوتا ہے، لیکن وہ ڈر ہوتا ہے اپنی ذات کی تباہی کا۔

اسے قرآن کی رو سے مکافاتِ عمل کہتے ہیں، یعنی ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا۔

آپ نے غور کیا کہ انسانی ذات پر ایمان انسان کو کس طرح ہر اک حسنِ عمل (کیریکٹر کے مظاہرہ) پر آمادہ کئے چلا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک، مردِ مومن، حسنِ عمل کسی صلہ یا معاوضہ کی خاطر نہیں کرتا تو اس سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل کا صلہ یا معاوضہ، طبعی یا حیوانی پیانوں میں نہیں مانگتا۔ اسے اس کا صلہ ذات کے پیانوں کے مطابق ملتا ہے ﴿فَمَا سَأَلْتَهُمْ مِنۡ أَجْرٍ اِنْ اَجْرِيْٓ اِلَّا عَلٰی اللّٰهِ﴾ (نہ) سے یہی مراد ہے۔ عمل کوئی بھی ہو وہ بلا صلہ یا بلا معاوضہ کبھی نہیں رہتا۔ صرف معاوضہ اور معاوضہ میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک قانون (مستقل قدر) یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے دوسروں کی پرورش کے لئے جس قدر زیادہ دیتا ہے اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے وہ پوری محنت سے کمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں

اس کے یہ معنی نہیں کہ مستقل اقدار کے مطابق عمل کرنے سے طبعی مفاد ملتے ہی نہیں۔ ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی منسلک کرنے سے اس دنیا کے طبعی مفاد بھی بڑی عمدگی سے حاصل ہوتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ربنا التانی فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة۔ کا یہی مفہوم ہے۔

سے صرف اتنا اپنے لئے رکھتا ہے جس سے اس کی طبعی ضروریات پوری ہوں اور فاضلہ کمائی دوسروں کی پرورش کیلئے عام کر دیتا ہے۔ (قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشوونما کا یہی طریق بتایا ہے) ظاہر ہے کہ طبعی پیمانوں سے ماپئے تو اس میں اس شخص کا سراسر نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہوگا وہ دوسروں کے پاس چلا جائے گا تو وہ اتنا کمائے گا ہی کیوں جو اس کی ضروریات سے زائد ہو۔ وہ تھوڑی سی محنت کر کے اپنی ضروریات کے مطابق کمائے گا اور پھر چین سے سوئے گا۔ ان لوگوں کی یہ دلیل بڑی معقول نظر آتی ہے اور اس کا اطمینان بخش جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

روس کی مشکل

یہی وہ مشکل ہے جو آج کل روس میں پیش آرہی ہے اور اسے اپنی سرحدوں پر آہنی پرے لٹکانے پڑ گئے ہیں۔ اس سوال کا جواب صرف قرآنی تصور حیات کی رو سے مل سکتا ہے اور یہی ہے وہ مقام جہاں قرآنی نظام، دیگر نظام ہائے معیشت و معاشرت سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ قرآن نظام کی حامل، مومنین کی جماعت ہوتی ہے، یعنی ان لوگوں کی جماعت جو اس حقیقت پر علی وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں

۱۔ انسانی ذات کی نشوونما مقصودِ حیات ہے۔ اور

۲۔ ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے کہ انسان پوری پوری محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد جس قدر ہو اسے نوعِ انسان کی پرورش کے لئے عام کر دے۔

ان لوگوں کے دل میں اس کے لئے کس قدر ترپ ہوتی ہے، ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جو ماں اپنے دودھ سے بچے کی پرورش کرتی ہے اس کی انتہائی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ دودھ پیدا ہوتا کہ اس کا بچہ بھوکا نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے اس کا دودھ اس غذا سے بنتا ہے جو وہ اپنے جسم کی پرورش کے لئے کھاتی ہے۔ لیکن وہ کبھی نہیں چاہتی کہ یہ غذا اس کے بدن کا جزو بن جائے اور دودھ میں تبدیل نہ ہو۔ اس کے برعکس، اگر کبھی اس کے دودھ میں کمی واقع ہو جائے، تو وہ

مومن ایسا کیوں کرتے ہیں؟

ڈاکٹروں سے مشورہ کرتی ہے کہ کس طرح اس کی غذا (زیادہ سے زیادہ حد تک) دودھ میں تبدیل ہو جائے۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے؟ محض اس لئے کہ بچے کی حفاظت اور پرورش اس کی زندگی کا مقصد بن چکی ہوتی ہے اس سے اس کے قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ بعینہ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا ایمان یہ

ہو کہ دوسروں کی پرورش سے ان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ کماتے ہیں اور اس سے صرف اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ اس سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور یُؤثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ذَلِكُمْ أَتَىٰ بِهَمِّ خَصْمَاتِهِ (۵۹) دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح مامتا کی ماری ماں خود بھوک رہتی ہے لیکن اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر کرتی ہے۔ خود گیلیے بستر پر سوئی ہے اور بچے کو خشک جگہ پر ملاتی ہے۔ جس طرح اس ماں کے دل میں اس وقت کسی معاوضہ یا صلہ کا خیال نہیں ہوتا، اسی طرح یہ لوگ بھی جن کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ: لَا تَزِدْكُمْ مِّنْكُمْ حَبْرًا ۚ وَلَا تَشْكُرُوا (۶۰) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں، نہ شکریہ تک کے متمنی۔ اس مثال میں فرق یہ ہے کہ ماں بچے کے لئے یہ کچھ اس جہتی تقاضے کے ماتحت کرتی ہے جو ہر حیوان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

لیکن بندہ مومن یہ کچھ عقل و فکر کی رُو سے اور اپنے اختیار و ارادہ

سے کرتا ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآن اپنے اس نظام کی عمارت استوار کرتا ہے جس میں کیریکٹر خود بخود بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے مملکت کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی اور ان کی مصمراصلہ حقیقتوں کی نشوونما کا سامان فراہم کرے۔ اس سے انسانی سیرت کی وہ تمام کمزوریاں رفع ہو جاتی

عملی طریق

ہیں جو احتیاج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جو کیریکٹر کی پستی کا موجب بنتی ہیں۔

دوسری طرف وہ ہر فرد معاشرہ کے دل میں اس ایمان کو راسخ کرتا ہے (وہ راسخ کیا کرتا ہے) معاشرہ مشتمل ہی ان افراد پر ہوتا ہے جو اس ایمان کے حامل ہوں کہ وہ جس قدر محنت کر کے کمائیں گے اور جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو اُسے دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیں گے اسی قدر ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں جو دولت جمع کرنے کی ہوس یا افراطِ زر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس نظام میں نہ فاصلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہے..... نہ مفاد پرستی کے جذبات انسانی سیرت کو داغدار کرتے

حالا وہ نظام بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کے دل میں شروع ہی سے یہ تصور راسخ ہوتا چلا جائے۔

(SURPLUS MONEY)

ہیں۔ ہمارے زمانے میں کمیونزم کے نظام کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ فاضلہ دولت

افراد کے پاس نہیں رہنے دے گا اور اس طرح نظام سرمایہ داری کی لعنتوں کو ختم کر دے گا۔ لیکن کمیونزم کا نظام

مادی تصویرِ حیات پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں وہ جذبہ محرکہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر انسان زیادہ سے

زیادہ محنت کرے اور اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے بطیب خاطر دے دے۔

یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے کمیونزم کا نظام نہ قائم رہ

سکتا ہے، نہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ اسے صرف استبداد کے زور پر قائم

کمیونزم کی بنیادی کمزوری

رکھا جاسکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد کے ٹنڈے سے قائم کردہ نظام، زیادہ دنوں تک چل ہی نہیں سکتا۔

دہی نظام قائم رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے جو افرادِ معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے

اُبھرے۔ یہ چیز قرآن کے پیش کردہ تصویرِ حیات کے علاوہ اور کہیں ممکن نہیں۔ کمیونزم جس تصویرِ حیات کی تخلیق

ہے اسے قرآن (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) حیوانی سطحِ زندگی قرار دیتا ہے جس میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ اس تصویرِ حیات کی دوسری مادی مفاد سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اس میں آپ زیادہ سے زیادہ

نیشنلزم کا جذبہ اُبھار کر، افرادِ معاشرہ کو انفرادی مفاد سے قومی مفاد کی طرف

لے جاسکتے ہیں۔ لیکن چونکہ (مغربی نظریہ جمہوریت کی رو سے) نیشنلزم کی بنیاد

نیشنلزم کا جذبہ

قوموں کے باہمی جذبہ منافرت پر ہے اور ایک قوم جانتی ہے کہ اگر مجھ میں کمزوری آگئی تو طاقتور قومیں مجھے ہڑکے جائیں

گی، اس لئے جس چیز کو نیشنلزم میں قومی کردار کہا جاتا ہے وہ بھی تحفظِ خویش

(PRESERVATION OF LIFE) ہی کے جذبہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے، کسی انسانی قدر کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دینے کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں ایک فرد کے

بجائے، افراد کا مجموعہ اپنا تحفظ چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تحفظِ خویش اچھی چیز نہیں اور کسی قوم کو اپنے

ملک کی حفاظت نہیں کرنا چاہیئے۔ تحفظِ خویش نہایت ضروری ہے اور اپنے وطن کی حفاظت تحفظِ خویش کے لئے

لا ینفک۔ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تحفظِ خویش کے لئے (خواہ وہ

انفرادی ہو یا اجتماعی) کوشش کرتا ہے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ کسی بلند کیریکٹر کا

ثبوت دیتا ہے۔ اس کے متعلق یہ ہی کہنا چاہیئے کہ وہ عقل مندی اور دانش اطوادی کا ثبوت دیتا ہے۔

اسی طرح جو شخص اپنا تحفظ نہیں چاہتا (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا

جائے گا کہ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ وہ بڑا احمق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی

شخص کشتی میں بیٹھا، کشتی میں سوراخ کر رہا ہو تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں کیریکٹر کی کمی ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ پاگل ہے۔ جو شخص وطن میں رہتے ہوئے اس وطن کی تخریب چاہتا ہے، اس کا شمار پاگلوں میں ہوگا۔ لہذا ایشیاء میں اگر کوئی شخص وطن کے مفاد کو، مفادِ خویش پر ترجیح دیتا ہے تو اسے نہایت سمجھدار اور ہوشمند کہا جائے گا۔ (جس طرح اگر کوئی شخص کشتی کا سوراخ بند کرنے کے لئے اپنا قیمتی رومال اس میں ٹھونس دے تو اسے عقل مند کہا جائے گا) صاحبِ کردار وہ ہوگا جو کسی ڈوبتے کو بچانے کے لئے دریا میں کود جائے اور چیز صرف بلند اور مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض افراد ایسے بھی ملیں گے جنہیں بلند اقدار کا احساس و شعور بھی نہیں ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ، وہ دُوبتوں کو بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ لیکن ان کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یا تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ وہ اس بلند قدر کا غیر شعوری طور پر احساس رکھتے تھے اور یا ان کا جذبہ محرکہ کچھ اور تھا۔ صاحبِ کردار وہی ہے جو دو اقدار کا شعوری طور پر موازنہ کرے اور پھر بلند قدر کی حفاظت کے لئے اس سے پست درجہ کی قدر کو علی وجہ البصیرت قربان کر دے۔ یہ چیز قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار پر ایمان لانے سے ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ ہم یا کبھی ازم کے بس کی بات یہ نہیں۔ قرآن پر ایمان رکھنے والے اگر اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ذاتی مفاد کی پروا نہیں کرتے تو اس لئے نہیں کہ ملک کے تحفظ سے ان کا اپنا تحفظ ہو جائے گا بلکہ اس لئے کہ وہ ملک کو ان بلند اقدار کے بروئے کار لانے اور دنیا میں عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اور اس کا تحفظ اس لئے چاہتے ہیں کہ اس مستقل اقدار کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر وہ ملک کی حفاظت و استحکام کے لئے ذاتی مفاد کی پروا نہیں کرتے تو ان کا یہ عمل بھی اپنے طبعی تقاضے پر مستقل اقدار کو ترجیح دینے کے لئے ہوتا ہے۔ لہذا یہ ان کے کیریکٹر کی بندی کی دلیل ہوتا ہے۔

مردِ مومن کا جذبہ تحفظِ وطن

آپ نے غور کیا کہ ایک مادہ پرست کے جذبہ تحفظِ وطن اور ایک مومن کے جذبہ تحفظِ وطن میں کس قدر بنیادی فرق ہے؟ مادہ پرست کے نزدیک وطن مقصود بالذات ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔ لیکن مردِ مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک وہ مستقل اقدار کے تحفظ و تنفیذ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا تحفظ بھی ہو جاتا

ہے جس طرح قرآنی نظام میں انسانی ذات کے استحکام کے ساتھ ساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ جو شخص مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے اس کے نزدیک مقصودِ زندگی ان اقدار کا تحفظ ہے۔ باقی سب کچھ اس بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جب وہ ان ذرائع کے تحفظ و استحکام کی خاطر اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو وہ درحقیقت ان مستقل اقدار کے تحفظ و استحکام کے لئے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مومن کے دنیاوی کام بھی دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔

جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ:

خلاصہ مباحث

(۱) جب انسان کی طبعی زندگی سے متعلق دو اقدار میں تصادم ہو تو جو شخص زیادہ قیمتی قدر کی خاطر کم قیمت کی قدر کو قربان کر دیتا ہے اسے عقل مند کہا جاتا ہے۔

(۲) جب کسی طبعی مفاد یا تقاضا اور انسانی قدر میں تصادم ہو تو اس وقت اگر انسانی قدر کو طبعی تقاضا پر ترجیح دی جائے تو اسے کیڑکیڑ کہتے ہیں۔

(۳) اس سے ظاہر ہے کہ کیڑکیڑ کا مظاہرہ اسی شخص سے ہو سکتا ہے جو انسانی اقدار اور انسانی ذات پر یقین رکھتا ہو۔ واضح رہے کہ چونکہ یہ شخص بھی درحقیقت زیادہ قیمتی قدر کی خاطر کم قیمتی قدر کو قربان کر دیتا ہے، اس لئے یہ بڑا عقل مند ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مومن کو اولوالالباب کہا ہے یعنی صاحبانِ عقل و بصیرت حقیقت یہ ہے کہ صحیح عقل و بصیرت کے مالک یہی لوگ ہوتے ہیں لیکن جو لوگ انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتے وہ نہیں یوازہ سمجھتے ہیں انسانی اقدار عقل انسانی یعنی معاشرہ کی پیداوار نہیں ہو سکتیں یہ صرف وحی کی نوس سے مل سکتی ہیں۔ اس لئے انسانی اقدار پر وہی شخص ایمان رکھ

سکتا ہے جسے وحی پر ایمان ہو یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایمان اور عمل صالح کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔

(۵) یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ وحی پر ایمان نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود وہ بعض انسانی اقدار کا بڑا احترام کرتے ہیں اور ان کے تحفظ کیلئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان لوگوں کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہو گا کہ ان کی ابتدائی تعلیم تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں انسانی اقدار بطور روایت چلی آئی تھیں اور ان پر زور دیا جاتا تھا۔ اس طرح ان اقدار کا علم اور احترام ان کے

تحت الشعور میں جاگزیں ہو چکا تھا۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ تھی تو پھر آپ دیکھیں گے کہ ان کی اس قسم کی قربانی کا جذبہ محرکہ کچھ اور تھا مثلاً نام اور نوس کی خواہش شہرت کی آرزو یا کوئی اور مفاد۔ اس لحاظ سے ان کی اس قربانی کو کیڑکیڑ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ کیڑکیڑ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس طبعی تقاضا کی تسکین مقصود ہو۔

(۶) انسانی ذات کی نشوونما، ان تمام اقدار پر یقین ان کے احترام اور تحفظ سے ہوتی ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، ان میں سے بعض کو چھوڑ دینے اور بعض پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما ایک معاشرہ کے اندر ممکن ہے جلوت کی تجربہ گاہوں میں نہیں اس معاشرہ کو اسلامی مملکت کہتے ہیں جس کی عمارت قرآن کی مستقل اقدار کے

ایمان پر استوار ہوتی ہے۔ انسانی اقدار کا تحفظ اس مملکت کا فریضہ اور دنیا میں ان کا عام کرنا اس کا مقصود ہوتا ہے اس نظام میں افراد مملکت

کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی ہے اور انہیں دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں بھی نصیب ہوتی ہیں۔

آخر میں ایک شبہ کا انزال بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جاسکتا ہے کہ تصوف کے پیش نظر بھی تزکیہ نفس اور روحانی ترقی ہوتا ہے اور تصوف اور قرآن

یہ سوال نظرِ لطیف اور ذہنی و کھائی دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تصوف اور قرآن دونوں کی تعلیم سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ تصوف کی ماہیت کے متعلق میں دوسرے مقام پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس تفصیل کو یہاں (معنی طور پر) دہرایا نہیں جاسکتا۔ اس لئے یہاں چند اصولی باتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان پر غور کرنے سے حقیقت سامنے آجائے گی۔

(۱) یہ سمجھنا غلط ہے کہ تصوف کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما اور استحکام ہے۔ تصوف کی رُو سے انسانی ذات (خودی) کا وجود تمام صیبتوں کی جڑ ہے اور اسے مٹا دینے کا نام نجات ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو ہے جو اپنے اصل سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ اسے اس دلدل سے نکالنا تاکہ یہ پھر اپنے اصل سے مل جائے، انسانی زندگی کا مقصود ہے اور یہ چیز ترکِ دنیا، ترکِ علاقہ اور ترکِ خواہشات سے حاصل ہوتی ہے۔ فنا، ذات، نہ کہ ذات کا استحکام، تصوف کا بنیادی عقیدہ ہے۔

(۲) تصوف کی رُو سے معاشرہ، ممکنات، نظامِ سب دنیا داروں کے دھندے ہیں۔ "تزکیہ نفس" کیلئے ان سے الگ رہنا ضروری ہے۔ انسانی نجات کا حصول (یعنی روح کو مادہ کی دلدل سے نکال لینا) ایک انفرادی فعل ہے جو مختلف قسم کی ریاضتوں، مراقبوں اور عہدوں سے حاصل ہوتا ہے۔

(۳) تصوف میں صرف منفیہ خصائص (NEGATIVE VIRTUES) کو حسنِ عمل قرار دیا جاتا ہے۔ نفی ذات کیلئے اعمال بھی منافیہ ہی ہونے چاہئیں، عاجزی، مسکینی، انکساری وغیرہ۔ اقبالؒ اس ضابطہء اخلاق کو راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم اذکر وہ گو سفند ان قدیم کا ایجاد کردہ مسکب گو سفندی قرار دیتا ہے اس کے نزدیک افلاطون :

گو سفندے در لباس آدم است حکم اُو بر جان صوفی محکم است

۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ تصوف کو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا قرار دیتا ہے۔ قرآنِ تنبیہ کائنات کا درس دیتا ہے۔ اور دنیا میں نظامِ عدل کے قیام کو مقصود زندگی بتاتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس میں انسان کی ذات کی نشوونما ممکن ہے اور کیریکٹر نشوونما یافتہ ذات کی مختلف شئیون (FACETS) کا دوسرا نام ہے جس طرح ہیرے سے روشنی کی کرنیں نکلتی ہیں، اسی طرح نشوونما یافتہ ذات سے کیریکٹر کی نورانی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اسی کو قرآن نے صبغۃ اللہ (خدا کا رنگ) کہہ کر بیان کیا ہے۔

خدا کا رنگ صرف اس معاشرہ میں نکھرتا ہے جو قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار کا ضامن ہوگا اور جس میں ہر فرد عقل و بصیرت کی رُو سے اور اپنے اختیار و ارادہ سے مستقل اقدار کا تحفظ کرے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وحدتِ ملت

(ایک تقریر)

(فروری ۱۹۶۱ء)

یوں دیکھئے تو ساری دنیا میں انسان بستے ہیں جو (سب کے سب) ایک ہی نوع کے افراد ہیں۔ لیکن ان کے اختلافات پر نگاہ ڈالئے تو ایسا دکھائی دے گا گو یا دنیا کی آبادی مختلف قسم کی مخلوقات کا مجموعہ ہے جن میں سوائے شکل و صورت کے کوئی بھی بات مشترک نہیں۔ کہیں ان میں خاندانوں کا اختلاف ہے اور ہر خاندان دوسرے خاندان کا دشمن ہے۔ کہیں ذاتوں اور برادریوں کا اختلاف ہے اور ہر برادری دوسری برادری سے بیرکھتی ہے۔ کہیں قوموں کا اختلاف ہے اور ہر قوم دوسری قوم کو ننگلنے کی فکر میں دکھائی دیتی ہے۔ ایک ہی قوم کے اندر سیاسی پارٹیوں کا اختلاف ہے اور ایک پارٹی دوسرے پارٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہے۔ ان تمام اختلافات سے اوپر چلئے تو مذہب کا اختلاف ہے اور ایک مذہب دوسرے مذہب کو مٹانا

فریضہ خداوندی سمجھتا ہے۔ پھر مذاہب کے اندر فرقوں

کا اختلاف ہے اور ہر فرقہ دوسرے فرقے کو جہنم کا ایندھن

نوعِ انسان کے اختلافات

قرار دیتا ہے۔ غرضیکہ انسان کی نوع تو ایک ہے لیکن باہمی اختلافات سے اس طرح بٹی ہوئی ہے کہ ان میں کوئی شے (بجز باہمی عداوت کے) بطور قدر مشترک دکھائی نہیں دیتی۔

قرآنِ کریم نے اس طرح اختلافات سے بٹے ہوئے انسانوں کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ تمہیں اس کا علم دھسا

بھی ہے کہ

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ - (۲۲)

خدا نے تم کو ایک جڑ سے پیدا کیا۔

پیدائش کے اعتبار سے تم سب کی اصل ایک ہے۔ تم سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی شاخ کے پتے ہو۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ ایک درخت کی ایک شاخ دوسری شاخ کی تباہی کی فکر میں رہتی ہو اور ایک پتہ دوسرے پتے کی گھات میں بیٹھا ہو کہ وہ کب غافل ہو اور میں

وحدتِ انسانیت

اسے نگل جاؤں؟ درخت سرسبز و شاداب ہوتا ہے تو اس کی ہر شاخ اور ہر پتے میں زندگی اور نازکی کی نمود ہوتی ہے۔ اگر وہ خشک ہوتا ہے تو اس کی ہر ٹہنی مرجھا جاتی ہے۔ یاد رکھو!

مَا خَلَقَكُمْ وَلَا يَعْشَكُمُ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ط (۲۳)

تم سب کا پیدا کرنا اور دوبارہ اٹھانا، ایک نفس (کی پیدائش اور بعثت) کی طرح ہے۔

اس نے کہا کہ شروع میں تمام نوعِ انسان ایک برادری تھی لیکن اس کے بعد لوگوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے۔

وَمَا كَانَتِ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ط (۲۴)

اور تمام نوعِ انسان ایک امت (برادری) تھی پھر انہوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے۔

اور اس طرح مختلف خاندانوں، قبیلوں، نسلوں، گروہوں، قوموں اور مذہبوں میں بٹ گئے۔ جب ان میں اس طرح اختلافات شروع ہو گئے اور ایک گروہ، دوسرے گروہ کا دشمن ہو گیا تو خدا نے اپنی طرف سے

حضراتِ انبیاءِ کرامؑ کو بھیجا شروع کیا تاکہ وہ ان کے اختلافات مٹا کر پھر سے انہیں ایک عالمگیر برادری بنادیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ط

وَآَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ط (۲۵)

تمام انسان ایک ہی برادری تھے۔ (پھر انہوں نے باہمی اختلافات سے تفرقہ شروع کر دیا تو) اللہ

نے انبیاءِ کرامؑ کو بھیجا جو انہیں (باہمی اتحاد اور یکانگت کی زندگی کے خوشگوار نتائج کی) خوشخبری

دیتے تھے اور (اختلافات و افتراق کے تباہ کن عواقب سے) آگاہ کرتے تھے اور ان میں سے ہر

ایک کے ساتھ اللہ نے ضابطہ تو انہیں بھی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کرے۔

لِيَحْكُمَ الْكِتَابَ كَمَا تَبَيَّنَ كے متعلق ہے نہ کہ التبتین کے۔

ان تمام انبیاء کرامؑ کا پیغام ایک ہی تھا، یعنی وحدتِ انسانیت۔ یہی پیغام حضرت نوحؑ کا تھا، یہی حضرت ابراہیمؑ کا، یہی حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا۔ یہی حضرت عیسیٰؑ نے اور آخر الامر یہی پیغام نبی اکرمؐ نے نوعِ انسان تک پہنچایا تھا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا
وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ. وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ
إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَتِمُّوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ
كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ (۲۲)

اے (مومن!) اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا اور وہی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا۔ (وہ حکم یہ تھا کہ) خدا کے مقرر کردہ نظامِ زندگی (الدین) کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ مت ڈالو۔ (یہی دعوت تمہاری ہے) لیکن جس بات کی طرف تو انہیں بلاتا ہے مشرکین پر وہ بات بڑی گمراہ کن ہے۔

یہاں اس بات کو ذرا غور سے سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ انسانوں کے اختلافات مٹا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کی دعوت، مشرکین پر بڑی گمراہ کن ہے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ذرا آگے چل کر جائے گی۔ چونکہ ان انبیاء کرامؑ کا پیغام ایک تھا اس لئے یہ سب کے سب ایک ہی برادری کے افراد تھے۔ یہی وہ جماعت تھی جس کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ - (۲۱)

یہ تمہاری جماعت، ایک ہی برادری ہے اور میں تم سب کا رب ہوں سو تم میری محکومیت اختیار کرنا۔

جو لوگ حضراتِ انبیاء کرامؑ کی اس دعوت پر ایمان لاکر، باہمی تفرقے مٹا دیتے تھے اور اس طرح ایک خدا کی محکومیت اختیار کر کے، ایک برادری بن جاتے تھے وہ ایک اُمت قرار پاتے تھے۔ جو اس دعوت سے انکار کر کے اپنے اپنے اختلافات پر قائم رہتے وہ دوسرا فرقہ بن جاتے تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

هَذَا الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ - (۶۴)

دو جاعتیں

اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں کچھ لوگ نہ ماننے والے

(کافر) بن گئے اور کچھ ماننے والے (مومن) ہو گئے۔

جو لوگ اس دعوت پر ایمان لا کر اپنے اختلافات مٹا دیتے تھے ان میں باہمی تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جماعتِ مومنین کے اندر تفرقہ کتنا سنگین جرم ہے، اس کا اندازہ بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے لگائیے جسے قرآنِ کریم نے سورہ طہ میں بیان کیا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ حضرت موسیٰ ؑ کچھ دنوں کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے اور اپنی جگہ حضرت ہارون ؑ کو بنی اسرائیل کا نگران بنا کر چھوڑ گئے۔ یاد رہے کہ حضرت ہارون ؑ ابھی حضرت موسیٰ ؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

بنی اسرائیل اپنی جہالت سے سامری کے فریب میں آ گئے اور انہوں

نے گوسالہ (بچھڑے) کی پرستش شروع کر دی۔ حضرت ہارون نے انہیں

تفرقہ سنگین جرم ہے

نرمی سے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش سے باز نہ آئے۔ جب حضرت موسیٰ ؑ واپس آئے تو وہ قوم کی اس حالت کو دیکھ کر سخت برا فرختہ ہوئے۔ انہوں نے حضرت ہارون سے کہا۔

مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا أَلَّا تَتَّبِعَنِ (۹۳-۹۴)

جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ لوگ اس طرح گمراہ ہو رہے ہیں، تو وہ کونسی بات تھی جس نے تمہیں اس

سے روکا کہ جس طرح میں ان پر سختی کیا کرتا ہوں، تم بھی اسی طرح کر دو؟

آپ نے سوال سن لیا؛ اب اس کا جواب سنئے۔ اسے پھر سمجھ لیجئے کہ یہ جواب ایک نبی کی طرف سے دیا جا رہا ہے اور دوسرا نبی اس جواب کو سن رہا ہے۔ جواب یہ تھا کہ

إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتُ بَيْنَ بَنِي إِسْرَءِيلَ دَلِمَ تَفَرَّقْتَ قَوْلِي - (۹۴)

میں اس سے ڈر گیا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا اور میری بات یاد نہ رکھی۔

اس جواب سے حضرت موسیٰ ؑ مطمئن ہو گئے یعنی انہوں نے اس سے اتفاق کیا کہ حضرت ہارون نے اچھا کیا کہ

مخدوڑے سے وقت کے لئے قوم کی جہالت کو گوارا کر لیا اور انہیں تفرقہ سے بچا لیا، یعنی قوم میں تفرقہ ایسا شدید

جرم ہے کہ اس سے بچنے کے لئے کچھ وقت کے لئے شرک جیسی جہالت کو بھی برداشت کیا جاسکتا ہے۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کی اس جہالت کو صرف حضرت موسیٰ کی

واپسی تک (عارضی طور پر) گوارا کر لیا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ (معاذ اللہ) مستقل طور پر حق کو چھوڑ کر باطل پرستی پر راضی ہو گئے تھے تاکہ قوم میں اتحاد قائم رہے۔ حق کو چھوڑ کر اتحاد پیدا کرنا، جائز قرار نہیں پاسکتا۔ حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کو ان کی جہالت پر روکا تھا، البتہ سختی نہیں کی تھی۔ ان سے، حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک نرمی برتی تھی۔ بہر حال قرآن کریم کے اس بیان سے واضح ہے کہ اس کی نگاہ میں تفرقہ کس قدر سنگین جرم ہے۔

قرآن کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ایک نبی آتا اور اپنے متبعین کے اختلافات مٹا کر انہیں امتِ واحدہ بنا جاتا۔ لیکن اس کے چلے جانے کے بعد وہ لوگ آپس میں تفرقہ پیدا کر لیتے۔ وہ کیوں ایسا کرتے؟ اس کا جواب اس نے ایک لفظ میں دیا ہے۔ سورہ شوریٰ میں ہے۔ وَمَا تَفَرَّقُوا

نبی کے بعد اختلافات

إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعْدًا بُيِّنَهُمْ (۲۲)

خدا کی طرف سے وحی آ جانے کے بعد وہ باہمی ضد کی بنا پر آپس میں تفرقہ پیدا کر لیتے، یعنی یہ بات نہیں تھی کہ ان کی نگاہوں سے حقیقت گم ہو جاتی۔ یادہ وحدتِ امت اور باہمی اخوت و الفت کی برکات کے قابل رہتے اسلئے تفرقہ پیدا کر لیتے۔ بالکل نہیں۔ وہ ان تمام باتوں کو اچھی طرح جانتے۔ لیکن محض ایک دوسرے کی ضد سے، ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ کے ماتحت، دوسروں سے بڑا بننے کے خیال سے باہمی تفرقہ پیدا کر لیتے۔ اس طرح امت مختلف فرقوں میں بٹ جاتی اور ان کے مذہبی پیشوا یا سیاسی لیڈر ایک دوسرے کی ضد سے فرقہ بندی کی گریہوں کو مضبوط کرتے رہتے۔ اسی میں ان کی ”چودہراہٹ“ کا راز تھا۔ اس سے وہ بڑے بنتے تھے۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تا آنکہ نبی اکرمؐ تشریف لائے۔ آپؐ کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا کہ نوعِ انسان کے ان اختلافات کو مٹا کر انہیں امتِ واحدہ بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو قرآن کریم ملا جو تمام امور کو کھول کھول کر بیان کرتا تھا جن میں لوگ اختلاف کرتے تھے۔

وَمَا أُنْزِلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ ۖ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (۱۶)

اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے سامنے وہ باتیں کھول کر بیان کر دے جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ جو لوگ (اس طرح اپنے اختلافات مٹا کر) اس کتاب پر ایمان

لے آئیں گے یہ ان کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرے گی اور ان کے لئے موجبِ رحمت بنے گی۔

اُمّتِ مسلمہ

چنانچہ اسی طرح نبی اکرمؐ نے ایک اُمّت تیار کی جس میں کوئی باہمی اختلاف نہیں تھا۔ ان کا ضابطہ حیات (قرآنِ کریم) ایک تھا۔ ان کا نظامِ زندگی ایک تھا۔ ان کا نصب العین ایک تھا۔ ان کا راستہ ایک تھا۔ منزل ایک تھی۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲۴۱) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایسی بنادیا جو تمام افرادِ انسانیہ سے یکساں قاصدہ پر ہے۔ (یعنی اس کے نزویک تمام انسان ایک جیسے ہیں) اس اُمّت کا فریضہ ہے کہ یہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگراں رہے اور ان کے اعمال کا نگران ان کا رسول ہو۔

یہ اُمّت بنائی اور اس سے تاکیدِ اکہہ دیا کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا۔ تم سب خدا کے اس ضابطہ حیات (قرآنِ کریم) کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ اس سے تمہاری وحدت قائم رہے گی۔ وَلَا تَفَرَّقُوا اور دیکھنا آپس میں تفرقہ نہ پیدا کر لینا۔ وَادْكُرُوا اللَّهَ عَالِيكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءَ۔ تم اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فَأَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ۔ اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی۔ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔ اور اس طرح اس نے اپنے فضل و عنایات سے تمہیں بھائی بھائی بنادیا۔ وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ۔ تم تباہی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ سو اُس نے تمہیں اس میں گرتے گرتے بچالیا۔ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ (۲۴۲) اس طرح اللہ اپنے احکام و دلائل تم سے واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم سیدھے راستے پر چلتے رہو۔

قرآنِ کریم کی یہ آیاتِ جلیلہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ ان میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ باہمی اختلافات اور تفرقہ سے تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے وہ اس میں گمراہی چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بچالیا۔ قرآنی تعلیم کے ذریعہ ان کے دلوں سے عداوت کی آگ نکال کر اس کی جگہ ایک دوسرے کی اُلفت کی ٹھنڈک پیدا کر دی۔ اور اس طرح انہیں ایک ایسی اُمّت بنادیا جس میں کوئی اختلاف اور کسی قسم کا تفرقہ نہ تھا۔ یہ سب مسلمان تھے۔ ان میں کوئی فرقہ نہ تھا۔ یہ سب بھائی بھائی تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے نفرت، بغض، حسد اور

عداوت نہیں تھی۔ ان کا نظام ایک بھاء اس میں الگ الگ پارٹیاں نہیں تھیں۔

ان سے کہہ دیا کہ دیکھو! اب تم میں کوئی تفرقہ نہیں رہا۔ خدا کی کتاب تمہارے پاس ہے۔ یہ اختلافات مٹانے کے لئے آئی ہے۔ اس لئے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ آتِهِ مَا جَاءَهُمْ
الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (۲۳) اب تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں
نے خدا کی طرف سے واضح تعلیم آجانے کے بعد فرقے پیدا کر لئے اور باہمی اختلافات
کرنے لگ گئے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

وحدت کی تاکید

ان سے، اس سے بھی زیادہ تاکید سے کہا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ دیکھنا! (خدا کے) واحد
پر ایمان لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ کوئی شخص خدائے واحد
پر ایمان لانے کے بعد مشرک کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس میں حیرت کی کوئی بات ہے۔
وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهْمًا مُشْرِكُونَ۔ (۱۲) لوگوں میں اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اللہ پر
ایمان کے مدعی بھی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ مشرک بھی ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ بات اس
لئے نہیں آتی کہ تم سمجھتے ہو کہ مشرک وہی ہوتے ہیں جو بتوں کو پوجتے ہیں۔ لیکن شرک اتنا ہی نہیں، اس کے علاوہ
کچھ اور بھی ہے۔ اور یہ وہ شرک ہے جس میں ایمان کے مدعی بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ شرک کیا ہے؟ غور سے سنئے،
ارشاد ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ دیکھنا تم کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ مِنَ الْمُشْرِكِينَ
فَرَقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر دیئے
اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ كُلُّ شِيعَةٍ يُمَالِدُ بَيْنَهُمْ

فرقہ بندی شرک ہے

فَرَقُوا دِينَهُمْ۔ (۳۱-۳۲) فرقہ بندی سے انسانوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ
ہر گروہ اپنے اپنے مسلک پر اترتا ہے۔ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ میں جنتی
ہوں باقی سب جہنمی ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رو سے دین میں اختلاف پیدا کرنا اور فرقے بنانا کس قدر سنگین جرم ہے۔
آپ نے شروع میں دیکھا تھا کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ آپ جو اتحاد اور اتفاق، وحدت اور یگانگت کی دعوت
دیتے ہیں، تو کب جو علیٰ الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ۔ (۲۲) یہ بات مشرکین پر بڑی گراں گزرتی ہے۔
اب آپ نے دیکھ لیا کہ یہ مشرکین کون ہیں جن پر وحدتِ امت کی دعوت گراں گزرتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دین

میں تفرقہ پیدا کریں اور فرستہ بندیاں اور گروہ سازیاں شروع کر دیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق نبی اکرم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ

إِنَّ السَّيِّئِينَ فَتَرَقُّوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شَيْعَةً لَّسْتُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶۰)

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود ایک گروہ بن گئے، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

کس قدر واضح ہیں قرآن کریم کے یہ ارشادات کہ جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کریں:

(i) وہ توحید پرست نہیں، مشرک ہیں اور

(ii) خدا کے رسول کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

یعنی ان سے نہ خدا کا کوئی تعلق ہے نہ خدا کے رسول کا کوئی واسطہ!

رسول اللہ کی زندگی میں ایک مرتبہ منافقین نے امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک مسجد بنائی۔ سنیہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کے متعلق کیا ارشاد فرمایا ہے۔ سورہ توبہ میں ہے

وَالسَّيِّئِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس طرح سے مسجد بنائی ہے کہ اس سے (اسلام کو) مضرت پہنچائی جائے اور کفر کی راہ اختیار کی جائے۔

یہ کفر کی راہ اور اسلام کے لئے ضرر کا موجب کیا چیز تھی۔ وَتَفَرِّقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ انہوں نے یہ مسجد اس لئے بنائی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے۔ یہ ہے کفر کی راہ۔ یہ ہے وہ خطرہ جس سے اسلام کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہ مسجد نہیں۔

وَإِصْطَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلِ يَدٍ۔ یہ اس شخص کے لئے کہیں گاہ

مسجدِ ضرار ہے جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول سے جنگ کرتا رہا ہے کہ وہ اس کی اوٹ میں

بیٹھ کر اسلام کے قلعے پر گولہ باری کرے۔ وَلِيَحْلِفَنَّ إِنَّ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ۔ یہ لوگ قسمیں کھائیں گے

کہ ہمارے ارادے بڑے نیک ہیں۔ ہم یہ سب کچھ کارِ خیر سمجھ کر کر رہے ہیں۔ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ

لَكَاذِبُونَ۔ اللہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بچے جھوٹے ہیں۔ لہذا اے رسول! لَا تَقْعُدْ فِيهِ

أَبَدًا۔ (۹۰-۹۱) تم ہرگز ہرگز اس مسجد میں قدم نہ رکھنا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے امت میں تفرقہ پیدا کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟ اتنا بڑا جرم کہ اگر کوئی

مسجد بھی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب بنے تو اس مسجد میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ وہ مسجد نہیں، ایسی مکین گاہ ہے جس میں بیٹھ کر، دشمنانِ دین، حصارِ ملت پر گولہ باری کرتے ہیں۔

ایک طرف اس اُمت کو تفرقہ اور اختلافات سے بچنے کی اس قدر سخت تاکیدات کیں اور دوسری طرف یہ حقیقت ان کے دل پر اچھی طرح منقوش کر دی کہ **إِنَّمَا السُّهُومُونَ إِخْوَةٌ**۔ (۲۹) یاد رکھو! سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ۔ (۲۸)

محمد اللہ کا رسول، اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں، وہ کفار کے مقابلہ میں (چٹان کی طرح) سخت ہیں اور آپس میں نہایت نرم اور مرحمت کو ش۔

ان کے باہمی اتفاق، یک جہتی اور باہم پیوستگی کا یہ عالم ہے :-

كَانَتْهُمْ بَنِيَّاءُ مَرْمُومًا — (۳۱)

گویا وہ ایک سیہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

یہ تھی وہ اُمت جسے قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا۔ اس اُمت کے افراد میں کوئی اختلاف نہیں تھا، کسی قسم کا تفرقہ نہیں تھا۔ کوئی الگ الگ پارٹیاں نہیں تھیں۔ حضورؐ کو ان کی وحدت اور باہمگر محبت اور الفت کا اس قدر خیال تھا کہ آپؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ

لے لوگو! یقیناً تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے (یعنی حجتہ الوداع کا خطبہ) تم سب اصل کے اعتبار سے ایک ہو (عربی کو عجمی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، بجز تقویٰ کے۔

یاد رکھو! ہر مسلمان، دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ تمہارا خون اور تمہارا مال قیامت تک اس طرح (ایک دوسرے پر) حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینے میں اور اس شہر میں حرام (واجب الاحترام) ہے۔

پھر فرمایا :-

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں، اگر تم نے اسے مضبوط پکڑ لیا تو تم گمراہ نہیں

ہو گے، وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ!

(صباح، بحوالہ سیرۃ النبیؐ، علامہ شبلی، جلد دوم، ص ۱۵۶-۱۵۷)

مسلمانوں کے خون کے واجب الاحترام ہونے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا۔ (۲/۹۳)

اور جو (مسلمان) کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اس کے لئے خدا نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ان تاکیدِ احکام کے ساتھ نبی اکرمؐ نے اس اُمتِ واحدہ کو اپنے پیچھے چھوڑا۔ پھر اس اُمت سے یہ بھی کہہ دیا کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ وحدت اور اتحاد، صرف نبی اکرمؐ کی زندگی تک ہے۔ حضورؐ کے بعد اس میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہ اُمتِ قرونِ اہد پارٹیوں میں بٹ سکتی ہے۔ ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ۔ محمدؐ سبجز این نیست کہ اللہ کے رسول ہیں۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ آپؐ سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں۔ أَفَايِنَ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ۔ سو اگر یہ (کل کو) وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں، تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سارا نظام اور اُمت کی وحدت آپؐ کی زندگی تک تھی) پھر سے اُسی روش کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ (اور قرون اور گروہوں میں بٹ جاؤ گے؟) وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنُيَضِرَ اللَّهَ شَيْئًا۔ (۲/۲۱۴) اور جو کوئی اس روش کہن کی طرف پلٹ جائے گا تو وہ اس سے اللہ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ (کچھ اپنا ہی نقصان کرے گا)۔



یہ تھی وہ اُمتِ واحدہ جسے نبی اکرمؐ نے چھوڑا، اس کے بعد تاریخ کے

ہماری حالت

اور اق چودہ سو سال آگے کی طرف اُلٹیے اور دیکھئے کہ آج اُسی اُمتِ واحدہ کی کیا صورت ہے؟ تعداد کے اعتبار سے دیکھئے تو آسمان کے تاروں کی طرح آن گنت (کم از کم پچاس) ساٹھ

کروڑ کا تو عام اندازہ ہے، جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے دیکھئے تو کمرہ ارض کے بیچوں بیچ، مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ لیکن اختلافات کو دیکھئے تو انسان محو حیرت رہ جائے کہ کیا یہ وہی اُمت ہے جس کی وحدت کے متعلق قرآن کریم نے اتنے تاکیدِ احکام دیئے تھے؟ کہیں نسلوں کا اختلاف ہے۔
 — یہ منغل، وہ پٹھان، یہ ترک وہ عرب — کہیں قومیتوں کا اختلاف ہے — یہ مصری وہ ایرانی، یہ عراقی وہ
 حجازی، یہ ہندی وہ چینی — یہ تو رہے نسلی اور وطنی اختلافات۔ اس سے آگے بڑھئے تو ایک ہی ملک
 کے اندر ذاتوں اور برادریوں کے اختلافات — شیخ، مرزا، راجپوت، پٹھان، جاٹ، اراٹیں — پھر صوبائی
 اختلافات — سندھی، پنجابی، سرحدی، بلوچی — ان سب اختلافات اوپر، اور سب سے گہرا مذہبی
 فرقہ بندی کا اختلاف — یہ شیعہ وہ سنی، یہ حنفی وہ وہابی، یہ دیوبندی وہ بریلوی، یہ اہل حدیث وہ اہل
 قرآن — ان کے علاوہ، سیاسی پارٹیوں کے ہنگامی اختلافات۔ جب انسان اس اُمت کو دیکھتا ہے جسے
 نبی اکرمؐ نے چھوڑا تھا اور اس کے بعد اس اُمت پر نظر ڈالتا ہے جو آج کل ہمارے سامنے ہے تو وہ انگشت
 بندہ رہ جاتا ہے — یقیناً آسمان کی آنکھ نے ایسا انقلاب کبھی نہیں دیکھا ہوگا! یہ اختلافات کیسے رونما ہوئے۔
 اور اُمتِ واحدہ اس قدر تاکیدات کے باوجود اتنے ٹکڑوں میں کیسے بٹ گئی، یہ ایک جگر پاش داستان ہے جسے
 دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کے بعد کیا پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ہو سکتی
 ہے تو کس طرح؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے (اس سوال کا کہ یہ اختلافات

کیا یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں | مٹا کر اُمت پھر سے اُمتِ واحدہ بن سکتی ہے یا نہیں) تو اس کے

جواب کے لئے قرآن کریم کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ

وَمَا آتَرْنَا عَلَيْكَ إِلَّا تَبَيِّنَ لَهُمُ الشَّيْءَ اخْتَلَفُوا فِيهِ (۱۶۶)

اور ہم نے تیرے اوپر یہ کتاب نازل ہی اس لئے کی ہے کہ تو لوگوں پر ان باتوں کو واضح کر دے جن میں

یہ اختلاف کرتے ہیں۔

یعنی قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تمام فروعِ انسان کے اختلافات مٹانے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس

کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اختلافی امور کو واضح کر کے دودھ اور پانی کو الگ الگ کر کے بتادے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ہم قرآن کی موجودگی میں یہ کہیں کہ ہمارے اختلافات کسے مٹنے کی کوئی شکل نہیں تو اس سے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) قرآن کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ اختلافات مٹا سکتا ہے اور یا یہ کہ قرآن کے اس دعویٰ پر ہمارا ایمان نہیں۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف فرقوں میں سے ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ ان کا عقیدہ اور مسلک قرآنِ کریم کے مطابق ہے۔ اگر اس بات کو صمیم مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خود قرآنِ کریم میں (معاذ اللہ) اختلافی باتیں موجود ہیں، جیسی تو اس سے ہر فرقہ کو اس کے مسلک کی تائید مل جاتی ہے۔ لیکن یہ چیز خود قرآنِ کریم کے دعوے کے خلاف ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میرے منجانب اللہ سونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ ۖ وَقَدْ كَانَتْ مِنْ عِنْدِ عَزِيزٍ اللَّهِ تَوْحِيدًا وَافِيًا
ضرار | اِخْتِلَافًا كَثِيرًا - (۸۴)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں یہ بہت سے اختلافات پاتے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

۱۔ قرآنِ کریم میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اس سے مختلف فرقوں کو اپنے اپنے مسلک کی تائید میں سند نہیں مل سکتی۔

۲۔ قرآنِ کریم دنیا کے اختلافات مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہمارے اختلافات مٹادے۔

لیکن کس طرح؟ | اس سے دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ یہ اختلافات مٹ کس طرح سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (طہ ۴۵) تم جس بات میں بھی اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہونا چاہیئے، یعنی ہر اختلافی معاملہ میں فیصلہ خدا سے لینا چاہیئے ”خدا سے فیصلہ لینے“ کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کتاب سے فیصلہ لیا جائے۔ ہر اختلافی معاملہ میں قرآنِ کریم کو حکم مانا جائے، اسے ثالث تسلیم کیا جائے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم سے فیصلہ کس طرح لیا جائے؟ کیا اس طرح کہ جن دو فرقوں یا پارٹیوں میں اختلاف ہو، وہ اپنے اپنے طور پر قرآنِ کریم سے فیصلہ لے لیں۔ اس طرح تو اختلافات مٹ نہیں سکتے۔ ہم آئے دن، مختلف فرقوں کے مناظرہ کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ دونوں فریق، قرآن کی آیات پیش کرتے ہیں لیکن یہ اُسے کہتا ہے کہ تم نے قرآن کے غلط معنی کئے ہیں یا غلط مفہوم لیا ہے اور وہ اسے یہی الزام دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دن بھر مناظرہ ہوتا رہتا ہے اور شام کو اس کا خاتمہ اکثر جھگڑے اور فساد پر ہوتا ہے۔ ہزار برس سے یہ مناظرے ہو رہے ہیں لیکن ان سے کوئی فرقہ مٹ نہیں سکا، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لہذا قرآنِ کریم سے فیصلہ لینے کا یہ طریق صحیح نہیں۔ اختلافی امور میں فیصلہ لینے کے لئے کسی تیسری پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی کو حکم یا ثالث کہتے ہیں۔ یہ وہ طریق تھا جسے نبی اکرم ص کے زمانے میں خود اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا تھا۔ اس نے حضور کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۲/۲۵)

تیرے رب کی قسم ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملہ میں

ایک زندہ امتحان کی ضرورت

تجھے اپنا ثالث (حاکم) نہ بنائیں۔ پھر تیرے فیصلہ سے اپنے دل میں بھی کوئی گرائی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے سامنے (بہ طیب خاطر) سر تسلیم خم کر دیں۔

مومنین پر یہ شرط عائشہ کی اور نبی اکرم ص کو حکم دیا کہ جب یہ لوگ کسی اختلافی معاملہ میں فیصلہ کرانے کے لئے تیرے پاس آئیں تو فلا حکم بئیںہم یہاں آ نزل اللہ ص (۵/۵۸) "تو ان میں قرآنِ کریم کے مطابق فیصلہ کیا کرو۔"

یہ تھا وہ عملی طریق جس سے امت میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا تھا۔ لیکن یہ سوال سامنے آئے گا کہ یہ عملی طریق تو رسول اللہ ص کی زندگی میں کار فرما تھا۔ رسول اللہ ص کے بعد کو نسا عملی طریق اختیار کیا جائے گا؟

اس سوال کا جواب قرآنِ کریم نے خود ہی دے دیا تھا، جب اس نے کہا تھا کہ اَخَانِیْنَ مَاتَ اَوْ قُتِلَ اِنْقَلَبَتْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ ط (۳/۱۳۳)۔ کیا اگر کل کو (رسول اللہ ص) وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں، تو تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ صرف حضور ص کی ذات تک محدود تھا) پھر اپنے پرانے طریقے کی طرف پلٹ جاؤ گے؟

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہی عملی طریق جو رسول اللہؐ کی زندگی میں رائج تھا، حضورؐ کے بعد بھی جاری رہنا تھا۔ اسلام کا نظام حضورؐ کی طبعی زندگی تک محدود نہیں تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ حضورؐ کے بعد، اس سلسلہ کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کا جواب **حضورؐ کے بعد**

بھی قرآنِ کریم نے خود ہی دے دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ نبی اکرمؐ کا فریضہ یہ تھا کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّهُ كَانَ شَافِعًا عِنْدَ اللَّهِ** (۲۴۱) ”وہ لوگوں کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے“ یعنی جن امور کو قرآن نے صریح ٹھہرایا ہے وہ ان کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور جنہیں اس نے غلط قرار دیا ہے وہ لوگوں کو ان سے روکتا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد یہی فریضہ امت کا قرار پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** (۲۴۲) ”تم بہترین امت ہو جسے نوح انسان کی بھلائی کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔ اسی امت کو خدا نے اپنی کتاب کا وارث قرار دیا ہے۔ **ثُمَّ آوَزْنَا النَّبِيَّ بِمَا قُتِبَ عَلَيْهِ مَقَالَتُ الْكَافِرِينَ أَصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا** (۲۴۳) ”پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے اس مقصد کے لئے چن لیا تھا۔ لہذا رسول اللہؐ کے بعد امت کا فریضہ قرار پا گیا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ لوگ اپنے اختلافی امور کے فیصلہ کے لئے ایک حکم (ثالث) کی طرف رجوع کیا کریں جو، ان امور کا فیصلہ قرآنِ کریم کے مطابق کرے، یعنی یہ امت باہمی مشورہ سے۔“ (۲۴۴)۔ ایسا نظام حکومت قائم کرے جس میں تمام اختلافی امور کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے رہیں۔ چنانچہ **أَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ** کا جو فریضہ سب سے پہلے رسول اللہؐ کا اور حضورؐ کے بعد امت کا قرار دیا گیا ہے وہی فریضہ

قرآنی نظامِ حکومت

اسلامی حکومت کا قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ حج میں ہے:-

الَّذِينَ إِذَا مَنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ قَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۴۴)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمینیں عطا کریں گے تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور اتنا زکوٰۃ کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور نہی سے روکیں گے۔

نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد امت نے باہمی مشورہ سے اس قسم کی حکومت قائم کی تھی جسے خلافتِ علیٰ منہاج

نبوت کا جاتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کرنے میں جو فرائض اپنی زندگی میں رسول اللہؐ سرانجام دیتے تھے حضورؐ کی وفات کے بعد وہی فرائض رسولؐ کا جانشین (خلیفۃ الرسولؐ) سرانجام دیتا تھا، یعنی اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے قرآن کریم کے مطابق کرتی تھی۔

جب امت نے اس عملی طریق کو چھوڑ دیا تو اس میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اب ان اختلافات کو مٹانے کا طریق یہ ہے کہ پھر اسی قسم کی حکومت قائم ہو جائے، یعنی ایسی حکومت جو قرآن کریم کے مطابق فیصلے کرے۔ جب ہم نے یہ عملی طریق اختیار کر لیا تو قرآن کریم کا یہ دعویٰ سچا ثابت ہو کر سامنے آجائے گا کہ یہ کتاب نوع انسان کے اختلافات مٹانے کے لئے آئی تھی اور اس میں آج بھی یہ صلاح موجود ہے کہ امت کے اختلافات مٹا سکے۔

سیاسی پارٹیاں | قرآن نظام حکومت میں سیاسی پارٹیاں بھی باقی نہیں رہتیں۔ یہ پارٹیاں وحدت امت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے پارٹی بازی کو سنگین جرم قرار دیا ہے۔ (مثلاً) جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ وہ فرعون کے خلاف اپنی ہم شروع کریں تو فرعون کے جرائم میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَصْلٰهَا شَيْعًا۔ (۲۸) فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی ہے اور اس کے باشندوں کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا ہے، یعنی فرعون کا یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ اسے اس سے روکنے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو مامور کیا گیا۔ قرآن نے کسی ملک میں پارٹیوں کے وجود کو، اس ملک کے لئے خدا کا عذاب قرار دیا ہے۔ سورہ انفصاف میں ہے۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰی اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا يَّاۤتِيَنَّ فَوْقَكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْضِكُمْ۔ ان سے کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اُوپر سے عذاب بھیجے یا تمہاریسے اُوپر سے آویلیسکم شیعًا وَبَيْنَ يَدَيۡنَاۤیۡنَ بَعْضَکُمْ بِاَسۡبَاطٍ یَّهۡتَدٰی یَاۤتٰی بَنَیۡکُمۡ تَمۡہِیۡنَ اَکۡسِیۡنَ میں بھڑا دے اور اس طرح تمہیں ایک دوسرے کی لڑائی کا مزا چکھا دے۔ اُنظُرْ کَیۡفَ نَصَرِیۡنَ الْاٰیٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَفْقَہُوۡنَ۔ (۶۵) ”دیکھو! ہم کس طرح ان احکام و دلائل کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ بات کو سمجھ سکیں۔“

اس نظام حکومت میں ساری امت شریک ہوگی، یعنی یہ ساری امت کے باہمی مشورے سے قائم

ہوگا۔ اور تمام امور کے فیصلے، نمائندگانِ اُمت کے باہمی مشورے سے، قرآنِ کریم کے مطابق کئے جائیں گے۔ اس میں حکومت کسی خاص پارٹی کی نہیں ہوگی۔ نہ ہی حکومت کے مقابلہ میں کوئی پارٹی ہوگی جو ہر وقت اس فکر میں لگی رہے کہ کسی طرح حکومت کو ناکام بنا کر خود حکومت کی کرسیاں سنبھال لے۔ بغیر کسی پارٹی کے اُمت کی مشترکہ حکومت، یہ ہے قرآنی نظام کی خصوصیت۔

اس وحدت سے ذائقوں اور برادریوں کی کش مکش ختم ہو جائے گی اور اس سے بنگالی اور غیر بنگالی، سندھی اور پنجابی، سرحدی اور بلوچی کا تفرقہ مٹ جائے گا۔ یہ سب قطرے، اُمت کے سمندر میں مل کر خود سمندر بن جائیں گے۔ ہر ایک اپنے آپ کو مسلمان کہے گا کہ یہی نام ہمارے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا (هُوَ سَمَّكُمُ الْمُسْلِمِينَ - ۲۲)، اور مسلمان اور مسلمان میں کوئی تفریق یا متاثریت باقی نہیں رہے گی۔ سب آپس میں بھائی بھائی ہوں گے۔ ایک دوسرے کے خیر خواہ اور خدا کے سپاہی یعنی دنیا میں حق کے محافظ۔

اُمت میں از سر نو وحدت پیدا کرنے کے پروگرام کی ابتدا کسی ایک ملک سے ہونی چاہیے۔ اس کے لئے پاکستان سے زیادہ موزوں اور کوئی خطرہ زمین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ پاکستان کا مطالبہ، تمام مسلمانانِ ہند نے نسلی، لسانی، قبائلی، صوبائی، مذہبی، فرقہ دارانہ، غرضیکہ ہر قسم کے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، بیک زبان کیا تھا اور

پاکستان میں وحدتِ ملت

اس مطالبہ کی بنیاد اس آئندہ پر تھی کہ ہم سب اس آزاد مملکت میں اسلامی انداز کی زندگی بسر کریں۔ یہ ہماری بقیستی تھی کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم مختلف قسم کے مفادات میں الجھ کر رہ گئے اور وحدتِ ملت اور اسلامی طرزِ زندگی کے بلند مقاصد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اختلافات مٹانے والی خدا کی کتاب ہمارے پاس ہے۔ اگر حکومت اسے اپنے فیصلوں کا مرکز قرار دے لے تو عام اختلافات مٹ جائیں گے۔

اگر ہم وحدتِ ملت کے اس تجربہ میں کامیاب ہو گئے تو یہ مسلمانانِ عالم کی وحدت کے لئے سنگِ بنیاد کا کام دے گا۔ ہم دیگر مسلم ممالک کے سامنے اس تجربہ کے درخشندہ نتائج پیش کر کے، انہیں اس کی طرف دعوت دے سکیں گے۔

یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ

ایک ہوں مسلمِ حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کا شغرا!

وحدتِ انسانیت | پھر یہ بھی واضح رہے کہ امتِ مسلمہ کی یہ وحدت دوسری اقوام یا ممالک کے خلاف (خدا نکر وہ) کسی جارحانہ اقدام کے لئے نہیں ہوگی۔ بلکہ انسان کی عالم گیر برادری کی تشکیل کے لئے خشتِ اول ہوگی۔ اس لئے کہ (جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے) قرآنِ کریم کا نصب العین، پوری کی پوری انسانیت میں وحدت پیدا کرنا ہے۔ اس امت کا مقصد جمعیتِ اقوام کے بجائے ”جمعیتِ آدم“ ہے اور یہ جمعیت، ایمان (آئیڈیالوجی) کے اشتراک کے سوا کسی بنیاد پر استوار نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کا خدا، رب العالمین، ان کا ضابطہ زندگی، ذِکْرُ لِقَاءِ لَمِیْنِ، ان کا رسول، رحمتِ لِّلْعَالَمِیْنِ ہے۔ اور یہی وہ آئیڈیالوجی ہے جو تمام نوزِ انسانی میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اولیاء اللہ کون ہیں؟

(جنوری ۱۹۶۳ء)

اولیاء اللہ کے الفاظ سنتے ہی ہمارا ذہن ایک خاص گروہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو عام انسانوں ہی سے نہیں بلکہ جماعتِ مومنین سے منفرد اور الگ ہے۔ ان کی خصوصیات ایسی ہیں جو دوسرے مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی تعلیم الگ، ان کی عبادت (ریاضت) کے طور پر الگ، ان کا رہن سہن باقی لوگوں سے جدا گانہ، وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ دوسروں کے دل کے حالات تک سے واقف ہیں۔ ہر آنے والے کے متعلق پہلے ہی جان لیتے ہیں کہ وہ کیا مانگنے کے لئے آیا ہے۔ آنے والے واقعات سب اُن کی آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں، ہو جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں، بگڑی بنا دیتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی خصوصیات

تقدیریں بدل دیتے ہیں قسمت کا لکھا مٹا دیتے ہیں۔ ان کا غصہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ان کی خوشنودی، دنیا و آخرت سنوار دیتی ہے۔ انہوں نے جس کی طرف نگہِ کرم سے دیکھ لیا اُس کا بیڑا پار ہو گیا، جس سے رُخ پھیر لیا وہ کہیں کا نہ رہا۔ ان کا ماننے والا جہاں بھی انہیں پکارے وہ اس کی سنتے ہیں، اس کی پکار کا جواب دیتے ہیں اور اس کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ ان سے ایسی ایسی کرامات سرزد ہوتی ہیں جن سے عقلِ دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ جب تک جی چاہے دنیا میں رہتے ہیں۔ جب چاہیں یہاں سے ”پردہ“ کر لیتے ہیں۔ (وہ مرتے نہیں صرف لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ وہ دنیا میں ہوتے ہوئے لوگوں کے سامنے کرتے ہیں وہی کچھ اُن کی نگاہوں

سے اوجھل ہو کر بھی کرتے ہیں) وہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کی دعائیں بدستور سنتے ہیں، ان کی مرادیں پوری کرتے ہیں، ان کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ وہ جیتے جی بھی دربارِ خداوندی میں جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد وہیں ہوتے ہیں۔ محکمہ قضا و قدر کی طرف سے دنیا کا نظم و نسق ان کے سپرد ہوتا ہے۔ جس طرح دنیاوی حکومت کی طرف سے مختلف کار پر داز مقرر ہوتے ہیں، گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ، اسی طرح محکمہ قضا و قدر کی طرف سے دنیاوی امور کا انتظام و انصرام "اولیاء اللہ" کے سپرد ہوتا ہے۔ انکے بھی مختلف مدارج و مناصب ہوتے ہیں اور انہی کے اعتبار سے مختلف امورِ مملکت ان کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ظاہری حکومت کے کارندے، گورنر، کمشنر وغیرہ یوں ہی کچھ پتکیاں ہوتے ہیں جو ان حقیقی کار پر دازان قضا و قدر کے فیصلوں کی تعمیل کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔ غرضیکہ کائنات کا سارا نظم و نسق انہی کے سپرد ہوتا ہے۔ اور جو کچھ ہوتا ہے انہی کے اشاروں سے ہوتا ہے۔ جب ان کا کوئی معتقد مرنے کے بعد قبر میں منکر نکیر کے عذاب سے ڈر کر ان کی دہائی دیتا ہے تو یہ وہاں بھی ان کی مدد کو پہنچتے ہیں اور جب قیامت میں ہر طرف نفسا نفسی ہوگی تو یہ اپنے مریدوں کو سیدھے جنت میں لے جائیں گے۔

اس گروہ کے، عام جماعتِ مومنین سے الگ اور منفرد ہونے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب "اولیاء اللہ" کہا جاتا ہے تو کسی کا خیال نہ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی طرف جاتا ہے نہ عمر فاروقؓ کی طرف۔ نہ خالد سیف اللہؓ اس زمرہ میں شریک دکھائی دیتے ہیں نہ عمرو بن العاصؓ۔ ان کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ (مثلاً) ان کے عرسوں کی تاریخیں ہر وقت، ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے رہتی ہیں۔ لیکن اگر آپ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی تاریخِ وفات یا حضرت عمرؓ کے سنِ شہادت کے متعلق دریافت

صحابہ کا شمار بھی ان میں نہیں ہوتا

کریں تو شاید شوک میں سے دس مسلمان بھی نہ بتا سکیں۔ ان کے مزارات کی عظمت کی یہ کیفیت ہے کہ، ایک ایک قبر پر لاکھوں روپے کی عمارات قائم ہوں گی اور ہزاروں روپے کے خلاف سالانہ چڑھتے ہوں گے۔ لیکن اس کا علم شاید ایک فی صد مسلمانوں کو بھی نہ ہو کہ (مثلاً) حضرت عثمانؓ کہاں دفن ہوئے تھے اور ان کے مزار کی آج کیا حالت ہے؟ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی کسی کرامت کا ذکر تک آپ نے کہیں سے نہیں سنا ہوگا، لیکن سائیں "گھوڑے شاہ" اور "کھوٹا شاہ" کی

کرامات کے چرچے ہر خاص و عام کی زبان پر ہوں گے۔ آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نیاز دے رہا ہوں۔ اس کے برعکس حضرت "شاہ لکھی" کی نیاز کی دیگوں کی آواز ہر تیسرے دن سنائی دے گی۔

"اولیاء اللہ" کے اس خاص گروہ کا تصور، جہلا تک ہی محدود نہیں، مسلمانوں کا بلند پایہ علمی طبقہ — خواہ وہ علوم شریعت کے حامل ہوں یا دنیاوی علوم کے ماہر، ان کی ان خصوصیات کا معترف اور ان کی جداگانہ ہستی کا قائل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی اس میں ذرا مبالغہ سے کام لیتا ہے کوئی اعتدال پر رہتا ہے، لیکن اس جداگانہ گروہ کے قائل سب ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم بھی اس قسم کے کسی الگ گروہ کا ذکر کرتا ہے اور ان کی وہ خصوصیات بتاتا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں "ولی" کا لفظ بھی آیا ہے، اور "اولیاء" کا بھی — بلکہ "اولیاء اللہ" کا بھی — اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں اور قرآن انہیں کن لوگوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔



ولی کے معنی | اَلْوَلِیُّ کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا۔ قُرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مددگار کو کہتے ہیں۔ اِسْتَوَلٰی عَلٰی الشَّیْءِ کے معنی ہیں، کسی چیز کو اپنے قبضہ قدرت میں لے لینا، کسی پر غالب آجانا۔ اس اعتبار سے ذالِ نکران، ناظم اور حاکم کو کہتے ہیں۔

ذَلٰی کے متضاد معنی آتے ہیں، یعنی کسی کی طرف رجوع کرنا بھی اور اس سے اعراض برتنا بھی۔ تَوَلٰی عَنْہُ اس سے اعراض برتنا۔ تَوَلَّاهُ، اس کی پیروی کرنا، اسے اختیار کرنا۔ اس اعتبار سے اَلْوَلِیُّ کے معنی اطاعت کرنے والا بھی ہوں گے۔

قرآن کریم میں :-

(۱) خدا کو مومنین کا ولی کہا گیا ہے۔

(۲) مومنین کو خدا کا ولی بتایا گیا ہے۔ اور

(۳) مومنین کو ایک دوسرے کا ولی کہا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب خدا کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ مومنین کا ولی ہے تو اس کے بنیادی معنی نگران، سرپرست، حاکم، مطاع کے ہوں گے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ ۗ (۱۶)

”اللہ ان لوگوں کا سرپرست، نگران، حاکم، مطاع ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کی سرپرست، نگران، حاکم، مطاع، غیر خداوندی سرکش قوتیں ہوتی ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔“

اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا ”ولی“ نہ بناؤ۔

أَمَّا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آدِلِيَاءَ ۖ قَالُوا هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۚ (۱۷)

کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو ”اولیاء“ (سرپرست، آقا، حاکم، مطاع) قرار دے رکھا ہے، حالانکہ اللہ ہی ہے جو حقیقی سرپرست اور کارساز ہے۔ وہ مردوں تک کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔

خدا کو ”ولی“ (یا مولیٰ) تسلیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اطاعت صرف اسی کے قوانین کی کی جائے۔ اس میں کسی کی حکومت کو شریک نہ کیا جائے۔ سورہ کہف میں ہے:-

ولی بمعنی مطاع

مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸)

اس کے سوا لوگوں کا کوئی ولی نہیں اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

خدا کی ولایت (سرپرستی، نگرانی، حفاظت) بھی اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو اس کے قوانین کی اطاعت کرے اور ان کے مقابلہ میں اپنے یا دوسروں کے جذبات اور خواہشات کا اتباع نہ کرے لگ جائے۔ سورہ بقرہ میں ہے:- قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ - ان سے کہہ دو کہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہدایت ہی ایسی ہے جو حقیقی مسنوں میں ہدایت کہلانے کی مستحق ہے۔ وَلَسِينَ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۱۹)

”اگر تم نے ان لوگوں کے خیالات کا اتباع کر لیا، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی (روحی خداوندی) آچکی ہے تو تم خدا کی

ولایت و نصرت سے محروم ہو جاؤ گے۔ یعنی اس کی نصرت اور سرپرستی مشروط ہے اس سے کہ انسان اس کی نازل کردہ وحی کے مطابق چلے۔ دوسرے مقام پر ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَيَرْزُقْكُمْ مِنْهُ عَلَىٰ رَحْمَةٍ ۚ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ اللَّهَ مُخْلِصٌ لِلْكَافِرِينَ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ - (۱۳۸-۱۳۹)

اے ایمان والو! اگر تم نے ان لوگوں کی اطاعت کی جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے تو یاد رکھو وہ تمہیں راہِ حق سے اُلٹے پاؤں پھرا دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کامیابوں کے راستے پر گامزن ہو جانے کے بعد پھر تباہیوں کے جہنم میں جا کر دو گے۔ یہ لوگ تمہارے کارساز اور مطاع نہیں ہو سکتے۔ تمہارا کارساز اور مطاع، حامی و ناصر صرف خدا ہے۔ تم اسی کی اطاعت اختیار کرو۔

یہ اطاعت صرف قرآنِ کریم کی ہے۔ اس کے سوا کسی کی اطاعت اور اتباع جائز نہیں۔

اطاعت قرآن کی ہے | اَتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ - (۱۳۷)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ اپنے خود ساختہ مطاعوں کا اتباع مت کرو۔ (یہ بڑی واضح بات ہے) لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم اس حقیقت کو نگاہ کے سامنے رکھو۔ (تم اوروں کی اطاعت کرنے لگ جاتے ہو)۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ خدا کو اپنا ولی تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نازل کردہ قوانین کی اطاعت کی جائے۔ لیکن یہ اطاعت (معاذ اللہ) کسی مستبد حاکم کی اطاعت نہیں۔ اس سے خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ (اور یہ ولایت کا دوسرا مفہوم

خدا اور بندے کا تعلق | ہے)۔ رفاقت کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں خدا کا ایک پروگرام جاری

و ساری ہے۔ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے انسان اس پروگرام کی تکمیل میں مدد و معاون ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید و نصرت اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ اس طرح خدا اور بندہ ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔ سورہ محمد میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

إِنَّ تَتَّصِرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ۔ (۴۷) اے ایمان والو! اگر تم نے دینِ خداوندی کی مدد کی، تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اور اس کی مدد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں استقامت نصیب ہو جائے گی۔ تمہارے پاؤں جم جائیں گے۔ یوں خدا اور نبردہ ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔



اب ہم اس موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آتے ہیں۔ اور وہی گوشہ اس وقت بنیادی طور پر ہمارے پیشِ نظر ہے، یعنی جب کسی انسان کو ”ولی اللہ“ یا انسانوں کی جماعت کو ”اولیاء اللہ“ کہا جائے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں مومن ہی اولیاء اللہ ہیں | کہہ دیا کہ یہ مومن اور متقی ہی ہوتے ہیں۔ ان سے الگ ان کا کوئی اور گروہ نہیں ہوتا، یعنی مومن اور متقی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے طمع و فرماں پذیر اور اس کے دین کی مدد کرنے والے ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر جس طرح صالح، شہید، صدیق ہونا مومنین کی صفات ہیں اسی طرح اس کا ”ولی اللہ“ ہونا بھی اس کی ایک صفت اور خصوصیت ہے۔ چنانچہ سورہ یونس میں ہے۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۱۰۶)

سن رکھو کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

آپ قرآن کریم کے اوراق پر نگاہ ڈالیے۔ یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ مومنین کی صفت بتاؤ گئی ہے اور یہ نتیجہ ہے ہدایتِ خداوندی کے اتباع کا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے شروع میں نورِ انسان کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲۸)

تمہارے پاس میری طرف سے راہِ نالِ آئی رہے گی۔ سو جو لوگ میری راہِ نالِ کا اتباع کریں گے، انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر ہے!

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۶۲)

جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور صلاحیت بخش کام کرے تو ان لوگوں کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ اور وہ اجر یہ ہے کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔ اس سے بھی واضح ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کی خصوصیت مومنین کے کسی خاص گروہ کی نہیں، سارے مومنین کی ہے۔

ان تصریحات کے بعد پھر سورہ یونس کی اس آیت کی طرف آئیے جسے اوپر درج کیا گیا ہے اور دیکھئے کہ اس سے اگلی آیت نے کس طرح اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے کہ ”اولیاء اللہ“ مومنین سے الگ کوئی جماعت نہیں۔ جو آیت پہلے درج کی گئی ہے وہ یہ ہے۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ جس رکھو کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔ اس کے بعد ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا اٰتِقٰوْنَ۔ (سپ) یعنی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے قوانین خداوندی کی نگہداشت کی۔ یہاں دیکھئے قرآن کریم نے کس طرح اولیاء اللہ کی تشریح یہ کہہ کر کر دی کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا اٰتِقٰوْنَ۔ یعنی یہ مومنین اور متقین ہی کا دوسرا نام ہے، ان سے الگ کوئی گروہ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ مومن اور متقیوں میں سے بعض اولیاء اللہ ہو جاتے ہیں اور باقی صرف مومن اور متقی رہتے ہیں۔ ہر تقویٰ شمار مومن ولی اللہ ہوتا ہے، یعنی خدا کا مطیع و فرمان بردار، اس کا رفیق۔

ہمارے ہاں اولیاء اللہ کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھٹے ہوئے کپڑے، ایک کمبل یا گڈری اور بھنے بچھانے کو، دنیا کی تمام لذات اور حظا ئظ سے کنارہ کشی، ہر خوش گوار شے سے نفرت، ایک بہت بڑے ”ولی اللہ“ حضرت فضیل ابن عیاضؒ کے الفاظ میں ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ

اگر دنیا، اس کی تمام دلچسپیوں کے ساتھ مجھے دے دی جائے اور اس پر کسی محاسبہ کا اندیشہ بھی نہ ہو تب بھی میں اسے ایسا ہی ناپاک سمجھوں گا جیسے تم مردار کو ناپاک سمجھتے ہو۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان اولیاء اللہ — یعنی مومنین، متقین کی اولیاء اللہ کی دنیاوی زندگی | کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَهِمْ الْبُشْرٰی فِی الْحٰیٰوِۃِ وَالدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ۔ ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر طرح کی خوش خبریاں ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی،

یعنی انہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور مرقہ الحالیاں حاصل ہوں گی۔ اور آخری زندگی میں بھی کامیابیاں اور کامرانیاں۔ اور یہ بات محض مہنگامی اور اتفاقی نہیں ہوگی، نہ ہی یہ کہ ان میں سے بعض کو یہ حاصل ہوں اور دوسروں کو نہ ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ ایسا ہوگا۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہمیشہ ہوگا۔ اولیاء اللہ یعنی جماعتِ مومنین کی دنیاوی زندگی بھی خوشگوار یوں کی ہوگی اور آخری زندگی بھی ذلِّلَ لَهُمُ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۲۰۴﴾ اور یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے۔

اولیاء اللہ کے متعلق یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ملائعہ اعلیٰ کے ساتھ ان کا خاص تعلق ہوتا ہے۔ ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی مومنین کے کسی خاص گروہ کی خصوصیت نہیں۔ تمام مومنین کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ ان پر نزولِ ملائکہ ہوتا ہے جو انہیں اس دنیا کی زندگی اور آخری زندگی میں خوشگوار یوں کی بشارت دیتے ہیں۔ سورہ حتم اس پر ہے۔

إِنَّ السَّيِّئِينَ قَالُوا رَبَّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَنْزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا دَلَّاتِخْرَنُوا دَا بَشِّرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۲۰۵﴾ یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے تو ان پر سکون و طمانیت کے حامل فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ (جو ان سے کہتے ہیں کہ) مت خوف کھاؤ، غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

وہ ان سے کہتے ہیں کہ

تَحَنُّ أُولَئِكَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَتَكُمُ فِيهَا مَا تَشْتَهَى أَنْفُسُكُمْ وَتَكُمُ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿۲۰۶﴾

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور دوست ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ تمہارے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی وہ سب کچھ ہے جس کی تمہیں آرزو ہوگی اور آخری زندگی میں بھی۔ تمہیں یہاں بھی وہ سب کچھ ملے گا جو تم مانگو گے اور اس زندگی میں بھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور استقامت کا لازمی نتیجہ نزولِ ملائکہ ہے اور یہ کسی خاص گروہ کی خصوصیت

نہیں۔ یہ جماعتِ مومنین کے لئے ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اس دنیا میں بھی وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی وہ خواہش کرتے ہیں اور آخرت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ مومن جو مانگے اسے ملتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور اس دنیا میں بھی — اس لئے کہ وہ مانگتا ہی وہ کچھ ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق مل سکتا ہے۔ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (۶۱) ظاہر ہے کہ جب جماعتِ مومنین کو ان کے ایمان و عملِ صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض حاصل ہو جائے گا تو ان کی ہر مانگ پوری ہوگی۔ واضح رہے کہ ان کی یہ مانگ کسی مافوق الفطرت طریقہ سے پوری نہیں ہوتی، فطرت کے قاعدوں کے مطابق پوری ہوتی ہے۔ وہ تسخیرِ فطرت کرتے ہیں اور فطرت کی مستحکم کردہ قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی ہر مانگ پوری ہوتی جاتی ہے۔ یہی نزولِ ملائکہ ہے۔ اشیائے فطرت کی تسخیر سے انہیں اس زندگی میں ہر قسم کی خوش گواریاں حاصل ہوتی ہیں اور چونکہ وہ ان قوتوں کی تقسیمِ قوانینِ خداوندی کے مطابق تمام نوعِ انسان کی مرفہ الحالی کے لئے کرتے ہیں، اس لئے ان کی اخروی زندگی بھی کامرانیوں اور سرفرازیوں کی زندگی ہوتی ہے۔ علامۃ اقبال کے الفاظ میں ۷

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے ہجوری

کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و فوری

قرآنِ کریم کی رو سے، مومن کی زندگی کا مقصود مستقل اقدار کی حفاظت ہوتا ہے۔ جب کبھی ایسا ہو کہ کسی مستقل قدر اور اس کے ذاتی رجحان یا مفاد میں (TIE) پڑ جائے، تو وہ اپنے ذاتی رجحان یا مفاد کو مستقل قدر پر قربان کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا وقت آجائے کہ اسے کسی بلند مستقل قدر کے تحفظ کی خاطر جان و دینی پڑ جائے،

موت کی تمنا کرنے والے

تو وہ بلا تامل جان بھی دے دیتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے دعوائے ایمان کی صداقت کا (TEST)

قرار دیا ہے۔ یہود کا دعویٰ تھا کہ وہ اللہ کے پیارے اولیاء اللہ ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ اِنْ زَعَمْتُمْ اَنْكُمْ اَوْلِيَاءُ لِلّٰهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمْنُوا اَلْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

(۶۲) اگر تم سمجھتے ہو کہ اور لوگ نہیں، صرف تم ہی اللہ کے دوست ہو، تو اگر تم اپنے اس دعویٰ میں

سچے ہو تو موت کی آرزو کر کے دکھاؤ۔ واضح رہے کہ موت کی تمنا سے مراد وہ نفس کشی نہیں جو ہمارے

ہاں "اولیاء اللہ" کی نشانی بتائی جاتی ہے۔ نفس کشی کا تو تصور ہی غیر قرآنی ہے، اور عیسائی رسالت ہندوؤں کے یوگ اور بدھوں کے نروان سے لیا گیا ہے۔ قرآن کی رو سے موت کی تباہی سے مراد ہے قتال فی سبیل اللہ، خدا کی راہ میں جنگ کرنا اور اس طرح دین کی محافظت کے لئے، کفن بدوش اور سرکھٹ دشمن کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آنا۔ یَقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (۹/۱۱) وہ خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاجر و منصور واپس آتے ہیں یا میدان جنگ میں جان دے دیتے ہیں۔ خائفوں میں بیٹھے، اپنے نفس کے خلاف "جہاد اکبر" میں مصروف رہنا قرآن کی رو سے "قتال فی سبیل اللہ" نہیں۔ یہی وہ جماعت مومنین **حزب اللہ** ہے جسے قرآن نے "حزب اللہ" کہہ کر پکارا ہے۔ اُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵۸/۵۸) ان کے برعکس کفری مسلمانوں کو اُس نے "حزب الشیطان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (۵۸/۵۸)

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، پوری کی پوری جماعت مومنین کا نام "اولیاء اللہ" ہے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ اس جماعت کے اندر اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اولیاء اللہ کا ایک گروہ تصور کیا جاتا ہے اور ان کی خصوصیات بھی عام جماعت مومنین سے جداگانہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ وہ نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس لئے لوگ اپنی مرادیں مانگنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے یہ عقیدہ توہم پرستی کا پیدا کردہ، فلہذا نہایت کمزور اور بودا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ اَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْدَهَا الْمُبِیُوتِ لَبَیْثٌ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۲۹/۲۹) وہ لوگ جو اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تصور اور تسلیم کرتے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے۔ وہ ایک گھر بناتی ہے لیکن جانتے والے جانتے ہیں کہ اس کا گھر کس قدر کمزور اور بودا ہوتا ہے۔ لے کاش!

نفع نقصان کی قدرت نہیں

لوگ علم و بصیرت سے کام لے کر سوچتے ہیں کہ ان کے اس قسم کے عقائد کس قدر جہالت پر مبنی ہوتے ہیں۔ جہاں تک کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کا تعلق ہے، قرآن کہتا ہے کہ یہ تو اپنی ذات کے لئے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، چہ جائیکہ دوسروں کو نفع یا نقصان

پہنچا سکیں۔ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ قُلْ أَفَأَتَّخِذُ شُحْرَ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا (۱۳۶) ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہو، جن کی حالت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، چاہے دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ عام اولیاء اللہ تو ایک طرف، اس باب میں اس ذاتِ اقدس و اعظم کے متعلق جن کا مقام یہ ہے کہ —
”بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر“

خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ

اللہ (۱۳۶) ان سے کہو کہ میں اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم ان ”اولیاء اللہ“ کی طرف اس لئے رجوع کرتے ہیں کہ چونکہ یہ خود مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں اس لئے ہمیں بھی خدا کا مقرب بنادیں گے۔ ہم ان کی اطاعتِ قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس عقیدہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی سختی سے تردید کی ہے سورۃ الزمر میں ہے۔ اِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ - فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ اَلَّذِينَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا نَسَبُوا يَتَوَلَّوْنَ أُولَئِكَ فَرَصَاحَةً لِّمَنْ يَبْغِي الْفَسَادَ

یہ خدا کا مقرب بنادیں گے | اللہ مخلصاً لہ الدین الہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ سو تم اس کتاب کے مطابق خدا کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو اور اس اطاعت کو اس کے لئے مختص کرو۔ اس میں کسی اور کو شریک مت کرو۔ اَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ۚ يَمُحِّسُنْ رُكُوعًا ۚ اَطَاعَتِ خَالِصَةً اِحْكَامٌ وَقَوَانِیْنِ خداوندی کی ہوگی جو اس نے اس کتاب میں دے رکھے ہیں۔ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ اَوْلِيَاءَ هُمْ مِمَّا نَعْبُدُ هُمْ اِلَّا لِيُقَرَّبُوا اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی جو لوگ اس کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہیں، (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی اطاعت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کا مقرب بنادیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ یَحْکُمُ بَیْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ

اللہ ان کی ان باتوں کا بھی فیصلہ کرتا ہے جن میں یہ (دین کی اصل و حقیقت سے) اختلاف کرتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْہِدُ مَنۢ کَانَ هُوَ کَذِبًا ۚ کَفَّارٌ — (۳۹) جو جھوٹا اور ناشکر گزار ہے، خدا اسے کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ یاد رکھو! مَنۢ یَّہْدِ اللّٰهُ فَہُوَ الْمُهْتَمِّ — صحیح راستے پر وہی ہے

جو خدا کے بتائے راستے پر چلتا ہے۔ وَمَنْ يُضِلِّ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْسِدًا۔ (۱۱۱) اور جو اس کی راہ نمائی کو چھوڑ کر اور راہیں اختیار کر لے تو اس کا نہ کوئی ولی ہو سکتا ہے نہ مرشد۔ مرشد (صحیح راستہ دکھانے والا) اور ولی (جس کی اطاعت کی جائے) صرف خدا کی ذات ہے اور اس کی اطاعت اس کتاب کے ذریعے کی جاتی ہے۔ جسے اس نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے نازل کیا ہے۔

اس ضمن میں یہ کہا جاتا ہے کہ ”اولیاء اللہ“ خدا تک پہنچنے (یا ہماری دعاؤں کو خدا تک پہنچانے) کا وسیلہ (ذریعہ) ہیں۔ اور ہم اس مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عقیدہ کی تائید میں سورہ مائدہ کی یہ آیت پیش کر دی جاتی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ، وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهِ تَعَلَّكُمْ

یہ وسیلہ ہیں

تَفْلِحُوْنَ۔ (۱۱۲) اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یہ ہے۔ ”اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی طرف ”وسیلہ“ طلب کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“ اس لفظ ”وسیلہ“ سے پیر پستی کی دلیل لائی جاتی ہے اور پھر اس پر اشخاص پرستی کی وہ عظیم عمارت قائم کر دی جاتی ہے جسے مسلمانوں کے لئے قرآن آیا تھا اور جو نبی اکرم کی بعثت کا مقصد تھا۔ وَيَصْنَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالاَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱۱۳) قرآنی آیات کا اسی قسم کا غیر قرآنی مفہوم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ط (۱۱۴) بہت سے لوگ اس قرآن (کا غلط مفہوم لے کر) گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے اس سے صحیح راہ نمائی حاصل کر لیتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ ”وسیلہ“ کے معنی ذریعہ ہی نہیں بلکہ مرتبہ، درجہ، قرب، منصب، منزلت بھی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اور خدا کے ہاں درجہ، مرتبہ، قرب، منزلت، طلب کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے میں پوری پوری جدوجہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصد زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یہ مفہوم کہ تقویٰ سے خدا کے ہاں درجہ اور منزلت حاصل ہو جاتی ہے، قرآن کے متعدد مقامات سے واضح ہے مثلاً اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط (۱۱۵) خدا کے ہاں تم میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے اور اگر ”وسیلہ“ کے معنی ذریعہ کئے جائیں تو بھی مطلب واضح ہے کہ تم تقویٰ اور جہاد کے ذریعہ خدا کے ہاں قدر و منزلت طلب کرو۔ قرآن، خدا اور انسان کا براہ راست تعلق قائم کرتا ہے اور یہ تعلق اس کی کتاب کے ذریعہ قائم ہوتا ہے۔

خدا اور انسان کے درمیان دوسرے انسانوں کے ذریعہ بننے کا تصور غیر قرآنی ہے۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ — جب (اے رسول) تجھ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں، اتنا قریب کہ أَجِيبُ دَعْوَةَ السَّادِعِ إِذَا دَعَانِ میں ہر اس شخص کی پکار کا جواب دیتا ہوں جو مجھے پکارتا ہے، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ قَلِيلٌ مِّنْهُمْ يَفْقَهُوْنَ قَوْلِي وَلَكِن كَثِيرٌ لَا يَفْقَهُوْنَ قَوْلِي (۱۸۶) انہیں چاہیے کہ میری فرماں برداری کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ انہیں رشد و ہدایت مل جائے۔ بات کس قدر صاف ہے۔ جو شخص قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اُسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے لوگ مُرشد تلاش کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم کا نقطہء ماسکہ یہ سمجھئے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا، نہ سیاست میں حکمران کی طاقت کو، نہ رزق کے معاملہ میں سرمایہ دار کی طاقت کو، نہ مذہب میں پیشوائیت کی طاقت کو، (اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ عناصر ہیں ہی نہیں) اور نہ ”خدا اور بندے کے تعلق“ کے لئے پیرانِ طریقت کی طاقت کو۔ اس کی کتاب کے ذریعہ ہر شخص کا خدا سے براہِ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس کی اطاعت اس نظام کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس مقصد کے لئے باہمی مشاورت سے متشکل کیا جاتا ہے۔

اولیاء اللہ کے غلط تصور کی رُو سے خدا اور انسانوں کے درمیان اس کے ”خاص بندوں“ کی کڑی کو کس قدر لاینفک سمجھا جاتا ہے، اس کا اندازہ اس حکایت کیجئے جو خانقاہیت کی تعلیم گاہوں میں سب سے پہلے ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔

حکایت یہ ہے کہ بابا فریدؒ دریا کے اس پار رہتے تھے اور ان کی خانقاہ دریا کے **یا فرید۔ یا فرید** اُس پار تھی۔ وہ ہر صبح گھر سے نکلنے۔ آگے آگے آپ پیچھے پیچھے آپ کا ایک مرید دریا کے کنارے پہنچنے تو کسی پل یا کشتی کے بغیر پانی پر سیدھے چلتے ہوئے اس پار پہنچ جاتے۔ اسی شام کو واپس آ جاتے۔ مرید سے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ پانی پر چلتے وقت یا فریدؒ یا فرید پکارنے لگا کرو۔ اس طرح برسوں گزر گئے۔ ایک دن پانی پر چلتے مرید نے سنا کہ خود بابا صاحب بھی کچھ الفاظ دہرا رہے ہیں۔ اس نے کان بگا کر سنا تو وہ کہہ رہے تھے۔ یا اللہ، یا اللہ۔ مرید نے دل میں سوچا کہ میں بھی ”یا فرید“ کے بجائے ”یا اللہ“ ہی کہوں

نہ کہوں۔ اس نے جوں ہی "یا اللہ" کہا دھڑام سے پانی میں گر گیا اور لگا غوطے کھانے۔ بابا صاحب نے اُسے سنبھالا اور کنارے پر آکر پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا۔ اس نے ڈرتے کانپتے بات بتائی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے کبھی اللہ کو دیکھا ہے؟ اس سے براہِ راست کوئی راہ درخسم ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جس سے تمہاری نہ جان نہ پہچان؟ اسے تم اپنی مدد کے لئے کس طرح پکار سکتے ہو؟ فرید کی خدا سے راہ و رسم ہے اس لئے وہ اسے پکارتا ہے۔ تمہاری فرید سے راہ و رسم ہے تم اسے پکارو۔ جس دن تمہاری راہ و رسم خدا سے براہِ راست ہو جائے گی، تم بھی اسے پکار لینا۔!

یہ اور اس قسم کی حکایات سے شروع ہی سے یہ چیز فہم نشین کرائی جاتی ہے کہ خدا کے مقرب بندے، اولیاء اللہ، خدا اور دوسرے انسانوں کے درمیان لاینفک کڑی ہوتے ہیں۔ تم خدا سے براہِ راست اپنا رشتہ جوڑ ہی نہیں سکتے اور ان سے یہ رشتہ ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں سمجھا جاتا ہے، ان کی وفات کے بعد بھی ان سے بدستور قائم رہتا ہے۔ اس لئے کہ اولیاء اللہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح حاضر و ناظر رہتے ہیں جس طرح زندگی میں۔ وہ سب کی سننے ہیں، سب کچھ دیکھتے ہیں، مانگنے والوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں، خدا کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم

مردے ہماری سن نہیں سکتے

واضح الفاظ میں کہتا ہے: وَمَنْ آمَنَ مَعِيَ قَدْ عَمِيَ دُونَ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنِ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ۔ اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اُسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا۔ (جواب دنیا تو ایک طرف) وہ ان کی پکار سے یکسر بے خبر ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ انہیں کون پکار رہا ہے۔ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كُفَرِينَ۔ (۲۶) اور جب لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا تو یہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے۔ اور ان کی پرستش سے یکسر انکار کر دیں گے۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ یہاں کفار کے بتوں کا یا ان کے دیگر معبودانِ باطل کا ذکر نہیں۔ ذکر خدا کے ان نیک بندوں کا ہے جنہیں لوگ ان کی وفات کے بعد اپنی مرادوں کے لئے پکارتے ہیں۔ ان کا ان عقیدت مندوں کی اس قسم کی حرکات سے بری الذمہ ہونے کا اظہار، ان کے خدا کے مخلص بندے ہونے کی شہادت کی ہے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وَهُ

اپنے پکارنے والوں کی پکار کو سُن ہی نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے مرنے والوں کا اس دُنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اُن کا تعلق اُس دُنیا سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ اِنَّ تَدْعُوهُمْ لَّا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سُننے ہی نہیں۔ وَتَوْسِمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ۔ اور اگر بفرضِ محال وہ تمہاری پکار کو سُن بھی لیتے تو وہ اُس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ وَتَوْمَرُ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ۔ (۲۵-۱۴) اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک سے اظہارِ نفرت اور بیزاری کریں گے۔ یہ باتیں تمہیں وہ خدا بتا رہا ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں۔ وہ اس دُنیا سے چلے جانے والوں کے احوال و کوائف سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہاں بھی آیت کے دوسرے حصے سے واضح ہے کہ بات خدا کے ان نیک بندوں کی ہو رہی ہے جو اپنے ان عقیدت مندوں کے اس شرک سے متنفر ہوں گے۔ سوچئے کہ جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کے اس فعل کو شرک قرار دیتے ہیں اور یہ ان کے عقیدت مند اور تابع فرمان بنتے ہیں۔ ان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ اور خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ ان سے کہہ دو کہ کائنات کی پستیوں اور بندوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو۔ اور مردوں کی توحشات یہ ہے کہ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اٰیٰتٍ يُبْحَثُوْنَ۔ (۲۶-۲۵) انہیں اس کا بھی علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دیجئے

غیب کا علم کوئی نہیں جانتا

طالعِ غیب کے متعلق اور تو اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد ہے قُلْ لَا اَقُوْلُ نَكَمٌ عِنْدِيْ خَرَّ اَيْنُ اللّٰهِ۔ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۱۶) ان سے کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو (اور دوسرے رسولوں کو) جن امورِ غیب کا علم دینا چاہتا تھا وہ وحی کے ذریعہ دے دیتا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت مریم ؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (۳۳) یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جسے اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ چونکہ وحی نبی اکرم ص کے ساتھ ختم ہو چکی گئی اور غیب کے جملہ امور قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیئے گئے اُس لئے اس کے بعد کسی کو غیب کا علم ہونے کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ جو غیب کے علم کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔

ہیں کہ یہ آیات عام مردوں کے متعلق ہیں۔ شہیدوں سے متعلق نہیں۔ شہید زندہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان اولیاء اللہ کو شہیدوں کے زمرے میں شامل کر دیتے ہیں؛ کیونکہ انہوں نے اپنے نفس کو مار دیا ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا رتبہ شہداء سے بھی بڑھ کر بتایا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ

او کشتہ دشمن است، ایں کشتہ دوست

اس باب میں سب سے پہلے ضمناً اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے شہداء کی اصطلاح قرآن میں نہیں آئی۔ قرآن کی رو سے پوری کی پوری اُمت محمدیہ شہداء

شہداء کے متعلق

عَلَى النَّاسِ هِی۔ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شَٰهَدًا عَلَى النَّاسِ وَیَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَٰهِدًا۔ (۲/۱۴۳) اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنایا ہے؛ تاکہ تم تمام نوع انسان کے اعمال کی نگرانی کر سکو اور رسول (اور اس کے بعد اس کا جانشین) تمہارے اعمال کی نگرانی کرے۔

(۲) قرآن کریم میں ”مقتولین فی سبیل اللہ“ کے متعلق ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ یُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمُوتَ۔ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ۔ (۲/۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں، لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر ان کی زندگی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا۔ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرِزْقُونَ۔ (۲/۱۶۸)

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں انہیں مردہ مت خیال کرو۔ وہ اپنے اللہ کے ہاں زندہ ہیں اور رزق پاتے ہیں۔

مقتولین فی سبیل اللہ کی یہ زندگی کس قسم کی ہے اس کے متعلق بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ اس ضمن میں پہلے دو ایک باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) مقتولین فی سبیل اللہ کے جو خصوصی مراتب ہیں وہ انہی تک محدود نہیں جو جنگ میں جان دیدیں۔

وہ ان سب کے لئے ہیں جو اللہ کی راہ میں جان دینے کے لئے تیار ہوں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ اور حضورؑ کے صحابہؓ ان تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے جو فی سبیل اللہ لڑی گئیں۔ ان میں سے بعض صحابہؓ میدانِ جنگ میں مقتول ہو گئے۔ خود حضورؑ اور بہت سے صحابہؓ اس طرح مقتول نہ ہوئے بلکہ زندہ رہے۔ اگر ان خصوصی مراتب کو مقتولین تک محدود سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دیگر مجاہدین (جو میدانِ جنگ میں مقتول نہیں ہوئے اور خود رسول اللہ ﷺ ان مراتب سے محروم رہ گئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ محض اتفاقی امر تھا کہ ان مجاہدین میں سے بعض میدانِ جنگ میں مقتول ہو گئے اور باقی زندہ واپس آ گئے۔ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ ان مراتب میں یہ سب شریک ہیں۔ سورہ آل عمران میں ہے۔ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ۔ (۱۵۶) اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے جاؤ یا مرجاؤ تو نعم اللہ کی مغفرت اور رحمت کے مستحق ہو گے۔ اور یہ منافع عظیم ہر اس چیز سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینے کا تہیہ کرنے والے خواہ مقتول ہوں یا ویسے ہی فوت ہو جائیں ان کے مراتب یکساں ہوں گے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا۔ (۲) جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے، تو اس کے بعد وہ قتل ہو جائے، یا دشمن پر غالب آ جائے تو ہم اسے بہت بڑا اجر دیں گے۔ اسی حقیقت کو سورہ توبہ میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ فَيُقْتَلُونَ أَوْ يَغْلِبُونَ۔ (۹) وہ (مومنین) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو قتل بھی کرتے ہیں اور قتل ہو بھی جاتے ہیں۔

(ب) یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مقتولین فی سبیل اللہ طبعی موت (PHYSICAL DEATH)

دارد ہی نہیں ہوتی۔ طبعی موت ہر ذی حیات کے لئے ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ (۳۱) ہر ذی حیات کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ خدا کا کلی قانون ہے۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق ارشاد ہے کہ إِنَّكَ مَيِّتٌ قَدْ أَتَتْهُمْ مَيِّتُونَ۔ (۳۹) تو بھی مرنے والا ہے اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں۔ (ج) یہ بھی صحیح نہیں کہ موت کے بعد کی زندگی صرف مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے ہے، اوروں کے لئے نہیں۔ موت کے بعد زندگی ہر ایک کے لئے ہے۔ یہ حقیقت ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ مومن اور کافر ہر ایک کو مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے، كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ

أَمْوَاتًا فَآخَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَحْيِيكُمْ - (۲۸) تم خدا کا کس طرح انکار کر سکتے ہو۔ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر وہ تم پر موت طاری کرے گا اور پھر تم زندہ ہو گے۔

مقتولین فی سبیل اللہ کے زندہ ہونے کا خصوصیت سے ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ منافقین کا اغراض یہ تھا کہ اگر یہ لوگ جنگ میں نہ جاتے تو موت سے بچ جاتے۔ اَلَّذِينَ قَالُوا لَا خَوَافَ مِنْهُمْ وَقَدْ فُتُوا كَوَاطِفًا مَّا قَاتِلُوا۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خود میدانِ جنگ میں نہیں گئے، گھروں میں بیٹھے رہے اور ان کے بھائی بند (مجاہدین) جو میدان میں گئے ان کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہنا مانتے (اور جنگ میں نہ جاتے) تو قتل نہ ہوتے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ اول تو یہ بتاؤ کہ کیا تم ہمیشہ زندہ رہو گے؟ قُلْ خَاذِرْ عَمَّا نَفْسُكُمْ الْمَوْتُ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ - (۳۲) اگر تم اس بات میں سچے ہو تو اپنے آپ سے موت کو ہٹا کر بتاؤ۔ اور دوسرے یہ کہ جو لوگ حق و صداقت کی راہ میں جان دیتے ہیں انہیں مردہ مت سمجھو۔ مردہ تو تم ہو جو ذلت کی زندگی جی رہے ہو۔ حیاتِ مرگ با شرف کا نام ہے۔ اور مرگ، حیاتِ بے شرف کا نام۔ زندہ ہونے کو تو، مرنے کے بعد مومن و کافر دونوں زندہ ہوتے ہیں لیکن ایک زندگی اہل جہنم کی ہے جس کے متعلق فرمایا کہ لَا يَمُوتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰی - (۲۱) وہ اس میں نہ مرے گا نہ جئے گا۔ اور ایک زندگی اہل جنت کی ہے جس میں کیفیت یہ ہوگی۔ لَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِعِصْمَةِ رَبِّكَ الَّذِي وَفَّيْلًا - (۳۱) جو نفع انہیں خدا کے فضل سے ملتی ہیں وہ ان سے بہت خوش ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ واضح ہے کہ مقتولین فی سبیل اللہ کی وہ زندگی یہاں کی طبعی زندگی جیسی نہیں۔ اس لئے کہ انسان کی طبعی زندگی کے متعلق ہم سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن ان کی اُس دنیا کی زندگی کے متعلق فرمایا۔ وَلَكِنْ لَا تَعْرِفُوْنَ - (۲) اس کی کئی حقیقت تمہارے عقل و شعور میں نہیں آ سکتی۔ دوسرے یہ کہ ان کا اس دنیا سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کوئی کتنا ہی مقربِ بارگاہِ خداوندی کیوں نہ ہو وہ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد نہ ہماری پکار کو سن سکتا ہے اور نہ اس کا جواب دے سکتا ہے۔ اس میں مقتولین فی سبیل اللہ کی بھی کوئی استثناء نہیں۔ (قرآن نے ایسی استثناء نہیں کی) اگر ان کی زندگی اور دوسرے مرنے والوں کی زندگی میں کوئی فرق ہے تو وہ فرق خدا کے ہاں ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ بَلْ اَحْيَاكُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ - (۳۸) وہ اپنے رب کے حضور زندہ ہیں۔ وہیں سے انہیں سامانِ نشوونما

ملتا ہے۔ وہ اس احساس سے خوش ہوتے ہیں کہ ان کی اس عظیم قربانی سے پیچھے رہ جانے والے مومنین کے لئے ایسا معاشرہ قائم ہو گیا جس میں انہیں کوئی خوف اور حزن نہیں۔ (۱۶۹)۔ اس سے زیادہ ان کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔



اب دہائیہ آخری سوال کہ ”اولیاء اللہ“ سے کرامات سرزد ہوتی ہیں۔ تو

اولیاء اللہ کی کرامات

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جس قسم کی کرامات ہم اپنے ہاں کے اولیاء اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، غیر مسلم اسی قسم کی (بلکہ بعض صورتوں میں ان سے بھی زیادہ عجیب العقول) کرامات اپنے ہاں کے بزرگوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور جس طرح ہمارے ہاں لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے ان کرامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسی طرح اچھے ہاں لوگ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اس لئے کسی سے کسی عجیب العقول بات کا سرزد ہونا، اس کے مقرب بارگاہِ خداوندی ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ انسان کے اندر بہت سی ایسی طبعی قوتیں مضمحل ہیں جن کی اگر مناسب طریق سے نشوونما (DEVELOPMENT) کر لی جائے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہو سکتی ہیں جو دوسروں کے نزدیک عجیب العقول ہوں۔ امریکہ کے ہسپتالوں میں اب روزمرہ ایسے آپریشن کئے جاتے ہیں (بالخصوص بچوں کے) جن میں مریض کو بے ہوش نہیں کیا جاتا۔ لیکن انہیں درد کا احساس مطلق نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اپنی قوتِ خیال (ہسپناٹزم) سے مریض پر ایسا اثر انداز ہوتا ہے کہ اسے درد کا احساس ہی نہیں ہونے پاتا۔ اس کی اب وہاں باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی شخص دوسرے کی طرف دیکھ کر یا ایک پھونک مار کر اس کا دروسرور کر دے تو اس کی پرستش ہوئی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن وہاں نہ ان ڈاکٹروں کی کوئی پرستش کرتا ہے نہ خود انہیں کسی ”روحانیت“ کا دعویٰ ہوتا ہے۔ وہاں یہ چیز سائنس بن چکی ہے۔ لیکن یہاں ابھی تک ”باطنی علم“ کا راز ہے۔

یاد رکھیے اسلام میں معجزہ صرف خدا کی کتاب ہے۔ جب مخالفین

معجزہ صرف قرآن ہے

نبی اکرمؐ سے معجزات طلب کرتے تو ان کی توجہ بھی اسی معجزہ کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی۔ سورہ عنکبوت میں ہے۔ وَقَالُوا آلَؤَلَا نُنَزِّلُ عَلَيْهِ آيَاتٍ مِّنْ رَبِّهِ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول پر اس کے رب کی طرف سے (محسوس) نشانات (معجزات) کیوں نہیں اتارے

گئے۔ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ ان سے کہو کہ معجزات خدا کے ہاں ہیں۔ یہ ساری کائنات اس کی خلافت کا معجزہ ہے۔ یہاں کافرہ ذرہ معجزہ ہے۔ سارے انسان مل کر بھی چاہیں تو گھاس کی ایک پتی پیدا نہیں کر سکتے۔ باقی رہیں، تو ”إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ“ میرا منصب صرف یہ ہے کہ میں تمہیں زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں۔ یہ چیزیں اس کتاب کے ذریعہ کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔ یہ کتاب سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُثْلِي عَلَيْهِمْ۔ کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے جو ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرًا لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (۵۰-۲۹) اس کتاب میں ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، خدا کی رحمت اور انسانی مقصد زندگی کی، یاد دہانی ہے۔ خدا کی یہ کتاب ایک زندہ جاوید معجزہ ہے۔ یہ آج بھی اسی طرح معجزہ ہے جس طرح نبی اکرمؐ کے زمانہ میں معجزہ تھی۔ اس پر عمل پیرا ہونے سے ایسے نتائج مرتب ہوتے ہیں جو اقوام عالم کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں۔ اس میں جو نظام حیات پیش کیا گیا ہے، ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس جیسا نظام مرتب نہیں کر سکتے۔ جب تک یہ امت اس قرآن پر عمل پیرا رہی اس سے قدم قدم پر ”معجزات“ سرزد ہوتے رہے۔ جب اس کے ہاتھ سے اس کا دامن چھوٹ گیا، یہ کرامات کی تلاش میں ماری ماری پھرنے لگی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندہ آزاد خود اک زندہ کرامات!

قرآن نے مومنین کی جماعت (امت مسلمہ) پیدا کی تھی جس میں اولیاء اللہ کا الگ گروہ کوئی نہیں تھا۔ اس جماعت کا ہر فرد ولی تھا۔ ان اولیاء اللہ کی جماعت (مومنین) کا منصب دنیا میں نظام خداوندی کا قیام تھا۔ اسے انہوں نے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا اور اس کے نتائج سے اس نظام کے بے مثل و بے نظیر ہونے کی شہادت بہم پہنچا دی۔ یہی ان کی کرامت تھی۔ جب وہ نظام باقی نہ رہا تو مختلف تصورات، مختلف گوشوں سے اسلام میں داخل شروع ہو گئے۔ ان میں ایک اہم تصور، تصوف کا تھا جو علامہ اقبالؒ کے

تصوف | الفاظ میں — ”اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے“ — اولیاء اللہ کا وہ تصور جو آج کل

طائفوں کے متعلق تفصیلی مباحث میری کتاب ”سلیم کے نام خطوط“ میں ملیں گے۔ نیز میری کتاب ”تصوف کی حقیقت“ دیکھئے

ہمارے ہاں مروج ہے، اسی تصوف کا پیدا کردہ ہے۔ عیسائی خانقاہوں میں (SAINTS) تھے۔ انہی کا منتہی اہم نے اپنے ہاں بنایا اور انہیں اولیاء اللہ کہنے لگ گئے۔ ان اولیاء اللہ کی خصوصیات وہ نہیں جو قرآن نے جماعتِ مومنین کی بنائی ہیں۔ ان کی خصوصیات عیسائی خانقاہوں کے (SAINTS) کی سی ہیں۔ — وہی ترکِ دنیا و ترکِ لذات کا بنیادی عقیدہ — مادی کائنات سے نفرت اور زندگی کا منتہی — ”روحانیت“ — وہی رسوم و مناسک خانقاہیت — چلے — دیا ضتیں — فاقہ کشیاں — وہی کشف و الہام کا عقیدہ — جس کی اسلام میں ختم نبوت کے بعد کہیں گنجائش نہ تھی۔ وہی ان کی کرامات، وہی مرنے کے بعد، ان کی قبروں کا مرجعِ انام بننا اور ان سے مرادیں مانگنا۔ غرضیکہ وہاں کی ایک ایک چیز ہمارے ہاں آئی اور رفتہ رفتہ عین اسلام بلکہ ”مغزِ دین“ بن گئی۔ اسلام ایسی اُمت پیدا کرنے کے لئے آیا تھا جو دنیا میں نظامِ عدل و احسان قائم کرے، جو دیکھے کہ دنیا میں کہیں کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں ہو رہی۔

خانقاہیت کا ضابطہ اخلاق

جہاں ظلم ہو رہا ہو وہ ظالم کی کلائی مروڑ کر اسے انصاف کی بارگاہ کے سامنے جھکا دے۔ لیکن اس تصورِ خانقاہیت نے ایک نیا ضابطہ اخلاق (CODE OF ETHICS) دیا جس میں قوت کا استعمال حرام اور عدل کا تصور گناہ قرار پا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم پر چاروں طرف سے بے کسی و بے بسی، ناتوانی و بے چارگی، افسردگی و پشیمانی کے بادل چھا گئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ۷

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید !

جس کا یہ تصوف ہودہ اسلام کرا بجاو

یہ وہ اسلام نہیں جسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے بطورِ نظامِ حیات (دین) تجویز کیا تھا اور جسے محمدؐ رسول اللہ و الذین آمنہ کے مقدس ہاتھوں نے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا تھا۔ اس اسلام میں پوری کی پوری جماعتِ مومنین، خدا کی سپاہ اور اولیاء اللہ تھے۔ اور وہ وسیع و عریض مملکت جس میں خدا کے قوانین عملاً نافذ تھے، ان کی کرامت تھی۔ اس میں اولیاء اللہ قبروں کے سرِ ہانے بیٹھے دکھائی نہیں دیتے تھے، جنگ کے میدانوں میں کفن بہ دوش اور شمشیر بکف نظر آتے تھے یا تمدن و معاشرت کی بساط پر انسانیت کے اُلجھے ہوئے مسائل سلجھانے میں منہمک۔

یا وسعتہ افلاک میں تکبیرِ مسلسل! یا خاک کی آغوش میں تسبیحِ دمنجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست

یہ مذہبِ مَلّا و جمادات و نباتات!

اس میں تمام مومنین اولیاء اللہ تھے اور یہی اولیاء اللہ کا قرآنی مفہوم ہے۔ یعنی:

خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ - تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ - (۳۰/۲۱)

بہترین اُمت جیسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، معروف کا حکم دینے والی اور منکر سے روکنے والی۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قیامت موجود

دین اور مذہب کی کش مکش

(طلوع اسلام کنونشن ۱۹۶۳ء — منعقدہ لاہور — سے خطاب)

غریبانِ من! علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سوال یہ ہے کہ چراغِ مصطفویؐ کیا ہے جس کے ساتھ، ازل سے تا امروز، شرارِ بولہبی ستیزہ کار چلا آ رہا ہے۔ یہ کون سی کش مکش ہے جس کا سلسلہ حوراز، نوری انسان کی پوری تاریخ کو محیط ہے۔ اس تماشہ گاہ میں ہزاروں قویں آئیں اور چلی گئیں۔ سیکڑوں نظام اُبھرے اور بیٹھ گئے۔ متعدد تہذیبوں کے چراغ جلے اور بجھ گئے، لیکن وہ کون سے ایسے حریقانِ ازل ہیں جن کی باہمی آویزش پر ان تمام تغیرات کا کوئی اثر نہ ہوا اور ان کی ستیزہ کاری کا سلسلہ ہر دور اور ہر مقام میں بہ دستور جاری رہا۔ اور اب تک جاری ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر جس قدر بھی غور کریں گے ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ کش مکش پیہم۔۔۔ وہ ستیزہ مسلسل۔۔۔ وہ آویزش متواتر۔۔۔

دین اور مذہب کی جنگ

ہے۔ جس دن سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی، اس جنگ کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملکیت، مراد داری وغیرہ بھی انسانیت کے کم دشمن نہیں۔ لیکن اگر آپ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ اور اس قسم کے دیگر مستبدانہ تصورات اور نظام، مذہب ہی کے

سہارے قائم رہے ہیں اور جب دین نے مذہب کو مٹایا تو اس کے ساتھ یہ خود بخود مٹ گئے۔ اس لئے اصل کشمکش دین اور مذہب ہی کی ہے۔

مذہب کی چہرہ دستیاب

مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ دوسرے انسانوں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کریں۔ اور یہ کچھ اس انداز سے کریں کہ یہ انہیں لوٹیں اور وہ انہیں دعائیں دیں۔ یہ انہیں دھتکاریں اور وہ ان کے پاؤں پٹریں۔ یہ انہیں بلا جرم و قصور گالیاں دیں اور وہ گڑ گڑا کر معافیاں مانگیں۔ یہ بھری محفل میں انہیں بے عزت کریں لیکن وہ اپنے کمرے کی تنہائیوں میں اپنے دل کے اندر بھی ان کی شان میں گستاخی کا خیال تک نہ لاسکیں۔ یہ ان سے ہر قسم کی خدمت اور بے گار لینا اپنا حق سمجھیں اور وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل، اپنی زندگی کا مقدس ترین فریضہ قرار دیں۔ ان کے ادنیٰ سے اشارے پر اپنے سینے میں خنجر گھونپ لیں، اپنے بچوں کے گلے پر چھری بھر دیں، آگ میں کود پڑیں۔ پہاڑ کی چوٹی سے سر کے بل نیچے آگریں، تختہ دار پر منہسی خوشی چڑھ جائیں، ان کی رخصتوں کے آہنی پہیوں کے نیچے آکے کچلے جائیں۔ یہ اپنے جس حریف کے خلاف چاہیں انہیں کھڑا کر دیں۔ اور وہ اتنا جانے اور پوچھے بغیر کہ ہمیں ان کے خلاف کیوں لڑا یا جا رہا ہے، ان کی جانیں لینے اور اپنی جانیں دیتے جائیں۔ وہ خود بھوکے رہیں اور ان کے خادموں کو نعمتیں کھلائیں۔ اپنے بچوں کو فاقے سے رکھیں اور ان کے گتوں کو دودھ پلائیں۔ خود ننگے رہیں اور ان کے پتھروں کو حریر و اطلس کے لباس پہنائیں۔ آپ خس و خاشاک کی جھونپڑیوں میں زندگی کے دن کاٹیں اور ان کی ٹہریوں کی رات تک پر سنگ مرمر کی ملک دوس عمارت استوار کریں۔ زندگی میں تو ایک طرف، ان کی موت کے بعد بھی ان کے دل پر ان کا خوف اس طرح طاری رہے کہ وہ ان کے تصور سے ڈرتے، کانپتے، لرزتے، سہمے رہیں۔ غرضیکہ یہ ہر وقت ان بے چاروں کے اعصاب پر پھلاوے کی طرح سوار اور ان کے ذہن پر بھوت بن کر چھائے رہیں اور وہ ان کے بچہ کی آہنی گرفت سے کبھی نکلنے نہ پائیں۔

یہ ہیں اس مذہب کے چند گوشے جسے مفاد پرست انسانوں کی عقل فریب کار نے تراشا اور جسے کمزوروں اور ناتوانوں کا خون چوسنے کے لئے ایک مؤثر ترین حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملکیت اور سرمایہ داری کا استبداد بھی کچھ کم استخوان شکن اور خون آشام واقع نہیں ہوا۔ لیکن انہیں اپنے غلبہ و تسلط کی زنجیریں مستحکم رکھنے کے لئے سینکڑوں قسم کی قوتیں فراہم اور ہزار قسم

کے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اور پھر بھی انہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب شکار اُن کے جال سے نکل جائے۔ لیکن مذہبی دسیہ کاریوں کا تو یہ عالم ہے کہ اس میں — صید خود صیاد را گوید بیگر — اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرے تو یہ غلام آگے بڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اور اگر کسی وقت کوئی زنجیر اتفاقاً ٹوٹ جائے تو یہ اس کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو اپنی

مذہب کی گرفت

مڑگان عقیدت سے اٹھا کر جو میں اور بصد عقیدت اپنے گلے میں ڈال لیں۔

مذہب نے اپنی تمام جہر بازیوں اور سحر انگیزیوں کے لئے صرف ایک بنیادی حربہ استعمال کیا اور وہ یہ کہ اس نے جو کچھ کرنا چاہا اسے خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کی ساری گرفت کا راز اسی میں ہے۔ اس کے لئے اس نے پیش بندی یہ کی کہ لوگوں کو سوچنے سمجھنے سے دُور رکھا جائے اور عقل و فکر کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ کوئی جتنی زیادہ جہالت آمیز باتیں کرے اُسے اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جائے۔ جو جس قدر زیادہ بعید از علم و عقل باتوں پر یقین ظاہر کرے،

لوگوں کو جاہل رکھا جائے

اسے اتنا ہی زیادہ پختہ ایمان والا قرار دیا جائے۔ اربابِ مذہب کی ٹیکنیک ہی یہ ہوتی ہے کہ اپنے معتقدین کو جہالت کے گڑھے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ توہم پرستیوں پر ایمان کا مدار اور عجب و پسندوں کو صداقت کا شعار قرار دیا جائے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان لایا جائے تو بلا علم و دلیل اور ان کے احکام کی تعمیل کی جائے تو یہ پوچھے بغیر کہ اس سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ مذہب کی طرف سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس کے حق میں اس کے پاس ایک ہی دلیل اور ایک ہی سند ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ایسا کچھ پہلے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہمارے اسلاف کا یہی مسک تھا۔ اگر کوئی شخص مذہب کے پیش کردہ کسی عقیدہ یا مسک پر اعتراض کرے تو عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جائے کہ یہ شخص تمہارے اسلاف کی توہین کرتا ہے — اور عوام کے جذبات کو بھڑکا کر جس قدر فتنہ و فساد برپا کیا جاسکتا ہے، مذہب کی تاریخِ خونچکاں کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر خون ریزیاں اور فساد انگیزیاں مذہب کے مقدس نام پر ہوئی ہیں، ہلاک و اور چنگیز کے حصّہ میں ان کا عشرِ عشر بھی نہیں آیا ہوگا۔ یہی وہ حربہ ہے جس سے اربابِ مذہب اپنے مخالفین کو اس طرح ڈرا دھمکا کر رکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک کہنے کی جرأت نہیں

کر سکتے۔ مذہب کا سارا مدارِ عوام کے جذبات پر ہے۔ اس کے لئے وہ اس قسم کے مواقع پیدا اور ایسی تقریبات وضع کرتے رہتے ہیں جن سے عوام کے جذبات میں شدت پیدا ہوتی رہے اور ان کی یہ آگ بجھنے نہ پائے۔

یہ ہے برادرانِ عربیز! اس مذہب کا اجمالی سا تعارف، جو پہلے دن سے آج تک انسانیت کی گردن میں پھانسی کا پھندا بن کر پڑا ہے۔ اور جس نے نوعِ انسان کی نَس نَس کو اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف ذرا سی حرکت بھی نہیں کر سکتی۔

اور یہی ہے عزیزانِ من! اس کی وہ آہنی گرفت جس سے نوعِ انسان کو چھڑانے کے لئے خدا کی طرف سے دینِ آثار ہا۔۔ دینِ خداوندی کے پیامبر، حضراتِ انبیاء کرام تھے جو مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتے تھے۔ وہ انسانوں کو اس جنگل سے آزاد ہونے کی دعوت دیتے تھے اور اربابِ مذہب اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کر کے، ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس محاذ میں اربابِ اقتدار، ان کے پشت پناہ اور سرمایہ دار طبقہ ان کا حمایتی ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خدا کا دین ان کے حق میں بھی تو موت کا پیغام تھا وہ دین کو مغلوب اور مذہب کو غالب رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے تھے، کیونکہ مذہب کے غلبہ میں خود ان کی ہستی کا راز مضمر تھا۔ دین اور مذہب کی یہی وہ کش مکش ہے جو پہلے دن سے آج تک دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے میں مسلسل اور پیہم چلی آرہی ہے اور اسی کو علامہ اقبالؒ، چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے انسانیت کے لئے بدترین لعنت اور خدا کا عذاب قرار دیتے ہیں۔ وہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں یہ

چار مرگ اندر پئے، این دیر میر سود خوار و والی و ملا و پیر

یعنی مذہب کا شجرۃ النجوم اور اس کی پروردہ شاخیں، ملوکیت اور سرمایہ داری

قرآنِ کریم، دین اور مذہب کی اس کش مکش کے متنوع گوشوں کو بار بار سامنے لا کر اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

وہ اس کش مکش کی ابتداء حضرت نوحؑ کی اس انقلابی دعوت سے کرتا ہے جس کی رو سے انہوں نے مذہب کی غیر خدائی قوتوں کی محکومیت میں جکڑی ہوئی قوم سے کہا کہ لِقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ

مَا لَكُمْ مِّنَ إِلَهِ عَتِيدٍ (۲۳) اے میری قوم کے لوگو! تم مذہب کے ان اجارہ داروں کی اطاعت اور محکومیت کی زنجیروں کو توڑ دو اور صرف ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کرو۔ یاد رکھو! اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اس آزادی کی آواز کے خلاف، اربابِ مذہب اور ان کے پشت پناہ اہل اقتدار — یعنی مترفین طبقہ کے لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے تھے، یورش کر کے آگے بڑھے۔ انہوں نے عوام کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ (۲۳) جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وہ تمہارے آباؤ اجداد کے مسدک کے خلاف ہے۔ یہ تمہیں، تمہارے بزرگوں کی روش سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ اِنَّ هٰذَا لَآ رَجُلٌ يَّكْفِيْكَ خِيٰتَةً (۲۳) یہ پاگل ہے اس کی کوئی بات نہ سنو۔

اس کے بعد قرآن کریم نے سلسلہ انبیاء کرام ؑ کی ایک ایک کڑی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی دعوت یہی تھی کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گزار بنائے۔ اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کی جا سکتی ہے جنہیں وہ (بذریعہ وحی) اپنی کتاب میں دیتا ہے۔ وہ یہ دعوت دیتے رہے اور ان کے خلاف ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر مذہبی پیشوائیت اور اربابِ ثروت و اقتدار متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہوتے رہے۔ ان کے پاس عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے ایک ہی سلوگن تھا۔ اور وہ یہ کہ مَا هٰذَا اِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ اَنْ يَّمْلِكَكُمْ مَّعَمَا كَانْتُمْ يٰ عِبَادُ ابَاؤُكُمْ (۳۴)۔ یہ شخص چاہتا ہے کہ تمہیں، تمہارے اسلاف کے مذہب سے برگشتہ کر دے۔ اس لئے اٹھو اسے پکڑو۔

اسے زندہ جلادو اور اس طرح اپنے خداؤں کا بول بالا کرو (۲۹ - ۲۱)

اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ کے

حضرت عیسیٰ ؑ کی انقلابی آواز

زمانے میں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار انتہا کو پہنچ

چکا تھا۔ بنی اسرائیل کے اجارہ ور یہاں نے ایک متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی جس میں انہیں ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے۔ صرف سزائے موت کے لئے انہیں رومی حکام سے توثیق کرنی پڑتی تھی۔ حضرت عیسیٰ ؑ کی دعوت، مظلوم اور مقہور انسانیت کو ان کے اس سچے استبداد سے چھڑانے کے لئے تھی۔ یروشلم کا ہیکل، ان مذہبی پیشواؤں کا مرکز تھا۔ داعی انقلاب آسمانی، حضرت عیسیٰ ؑ اسی ہیکل کی

سیرھبوں پر کھڑے ہو جاتے اور انہیں لٹکار کر کہتے کہ
اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔
کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ ہی داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔
اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے خشکی اور تری کا دورہ
کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔
اے ریا فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے
تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں
اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستہ دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی
سے بھرے ہوتے ہو۔
اے ساپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔

(انجیل متی ۷ باب ۲۳)

ظاہر ہے کہ مذہبی اجارہ دار جو اپنی خدائی مسندیں بچھا کر عوام کو لوٹتے اور ان پر حکومت کرتے تھے،
اس انقلابی دعوت کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ وہ اسے اپنی مفاد پرستیوں کے لئے کس طرح موت
کا پیغام سمجھتے تھے اس کا اندازہ ان کی اس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جسے انجیل برنباس میں ان الفاظ میں
بیان کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا
مخالفت کیوں؟ کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔۔۔۔۔ اس جیسے آدمی

کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے
اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے
طور پر مانگیں، حالانکہ اس وقت خدا کا شکریہ ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت
سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کچھ پروا نہیں کرتے، جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پروا
نہیں کرتے۔ اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ ہم جو چاہیں کر لیں۔ اگر ہم نے غلطی کی
تو ہمارا اللہ رحیم ہے اور قربانی اور روزے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ لیکن اگر یہ

آدمی بادشاہ ہو گیا..... تو ہرگز راضی نہ کیا جاسکے گا جب تک خدا کی عبادت (اعمالِ عبادت)

ویسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس، ص ۱۱۱)

آپ نے غور فرمایا کہ اس آسمانی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کی وجہ کیا تھی؟ — بس یہی ایک وجہ! یعنی اگر خدا کا قانون رائج ہو گیا تو ہم اپنی ان مسندوں سے الگ کر دیئے جائیں گے اور چونکہ ہمیں کوئی کام آنا نہیں جس سے ہم اپنی روٹی کما سکیں، اس لئے ہمیں اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگنی پڑے گی۔ آپ نے دیکھا کہ جسے مذہبی سوال کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت یکسر مہاشی مسئلہ ہوتا ہے۔

انجیل برنباس کے اس بیان سے آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ اس اندازِ حکومت کو پسند کرتی ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر کہتے ہیں، یعنی امورِ مملکت حکومت کے پاس رہیں اور امورِ شریعت (پرنسپل لٹ) مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ نہ مذہبی پیشوائیت، حکومت کے معاملات میں دخل دے اور نہ ہی حکومت ان کے حیطہ اقتدار میں دخل دے۔

اور آخر میں اس عظیم و جلیل داعی انقلاب کی طرف آئیے جس پر سلسلہ نبوت کا خاتمہ ہو گیا (صلی اللہ علیہ وسلم) حضورؐ کے ظہورِ قدسی کا مقصد

نبی اکرمؐ کی دعوت

یہ بتایا گیا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱۵۸) وہ نوع انسان کو ان زنجیروں سے آزاد کر دے گا جن میں وہ جکڑے چلی آرہی ہے اور ان کے سر سے وہ

بوجھ اتار دے گا جس کے نیچے وہ بُری طرح دبی اور کچل ہوئی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حضورؐ نے بھی وہی دعوت پیش کی جو حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک مسلسل و متواتر پیش ہوتی چلی آرہی تھی اور مترفین کے طبقہ کی طرف سے اس کا جواب بھی وہی ملا جو شروع سے ملتا چلا آرہا

تھا، یعنی مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ — جو بات یہ شخص کہتا ہے اسے ہم نے اسلاف کے مذہب میں کہیں نہیں سنا لہذا: إِنَّ هَذَا إِلَّا اخْتِلَافٌ (۱۵۹) یہ غلط جھوٹی

اور بنائی ہوئی بات ہے، یعنی اس کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی۔ اس کے بعد اس طبقہ کی طرف سے جو کچھ نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقا کے ساتھ ہوا، اس پر قرآن شہاد اور تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حضرات انبیاء کرامؑ، خدا
 نبی کے بعد کیا ہوتا تھا | کا سچا دین انسانوں کو دے جاتے تھے تو اس کے بعد اس دین کے
 سافق کیا بنتی تھی کہ بعد میں آنے والے نبی کے وقت، سابقہ نبی کے پیش کردہ دین کی آواز کہیں سے بھی
 سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس نبی کی اولیں مخاطب (بالعموم) وہی قوم ہوتی تھی جو اپنے آپ کو سابقہ نبی
 کی متبع کہتی تھی۔ پھر یہ کیا تھا کہ آنے والا نبی اس قوم کے مسک کو باطل قرار دیتا تھا اور یہ قوم اس نبی
 کی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کرتی تھی۔

ہوتا یہ تھا کہ جب ایک نبی دینِ خداوندی دے کر چلا جاتا تو اُس کے بعد اس قوم میں ایسے مفاد پرست
 لوگ پیدا ہو جاتے جو اس دین کو اپنے خیالات کی آمیزش سے مذہب میں تبدیل کر دیتے۔ لیکن
 لوگوں سے کبھی یہ نہ کہتے کہ یہ ہمارے خیالات ہیں۔ وہ اسی مذہب کو خدا کی سچی تعلیم کہہ کر پیش کرتے۔
 يَكْتُتِبُونَ الْكِتَابَ يَأْبُوهُمْ يُشْمُتُونَ هَلْ مِنْ عِندِ اللَّهِ - وہ شریعت
 خود وضع کرتے اور کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ ایسا کیوں کرتے۔ لَيْشْتَرَوْا بِهِ شَمَنًا
 قَلِيلًا (۲/۲۹) تاکہ اس سے کچھ پیسے کمائے جائیں۔ چنانچہ اس طرح خدا کا دین مذہب میں تبدیل
 ہو جاتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جب دین، اس طرح مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کچھ جزوی
 تبدیلیاں پیدا ہو جائیں، یا مذہب دین کی پست سطح کا نام ہو۔

مذہب اور دین کا تقابل | یہ دونوں بالکل ایک دوسرے کی ضد بن جاتے ہیں اور یکسر
 ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے مذہب اور دین کا تقابل مطالعہ کیا
 ہے وہ جانتے ہیں کہ

دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت
 ہے۔

مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرابلیٹ
 تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔

دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں
 کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل
 ہوا ہے یا نہیں؟

مذہب میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو
 جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم
 ہو گیا ہے۔

مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے

مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا، جس سے پرکھا جاسکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں؟

مذہب علم کا دشمن اور عقل کا حریف ہے۔

مذہب عقل کے دیئے ٹھل کرتا ہے کہ اُس کا چراغ جلے۔

مذہب اپنے آپ کو اندھی عقیدت کی بنا پر منواتا ہے۔

مذہب لوگوں کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ (۲۵/۲)

مذہب کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح مہرجکاٹے، آنکھیں بند کئے پا مال راستوں پر چلتے جاؤ۔

مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے

اس لئے مذہب ہر زمانے میں نئے نئے بُت تراشتا رہتا ہے تاکہ عوام کو بہلائے رکھے۔

مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ

زمانہ باتو نہ سازو تو بازمانہ ساز

دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج سامعہ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملتِ صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں؟

دین، انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب ہے۔

دین، عقل کے دیئے میں ردِ عن طائفا ہے کہ زندگی کے راستے جگمگائیں۔

دین اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

دین، انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (۲۵/۲)

دین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ

تراش از تیشہ خود جادہ خویش
براہ دیگران رفتن حرام است!

دین انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

دین تیشہ ابراہیمی سے ہر قدیم اور جدید بُت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

دین کا پیغام یہ ہے کہ

زمانہ باتو نہ سازو تو بازمانہ سنیز

مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔

مذہب انسان کو ہر بڑی چوکھٹ پر سیدہ ریزہ ہونا سکھاتا ہے۔

مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ

بدیادِ درمنافع بے شمار است !

دگر خواہی سلامت برکنار است

مذہب مادی کاٹناٹ کو قابلِ نفرت قرار دے کر اسے تیاگ دینے کی تلقین کرتا ہے۔

یعنی مذہب اس دنیا کو ترک کر دینے سے آخر کی جنت دلاتا ہے۔

مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو یکسر بے عمل بنادیتا ہے۔

مذہب کمزوروں، ناتوانوں، مظلوموں کو یہ تعلیم دے کر مطمئن رکھتا ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور راضی برضا رہنا خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔ اس سے مستبد، ظالم اور غاصب قوتیں بے لگام چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔

مذہب خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین، خوف کو مشترک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

دین اسے دنیا کے ہر آستانے سے سرفرازانہ مستانہ وار گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

دین کی پکاریہ ہے کہ

بدیہ غلط و باموجش در آویزند

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

دین مادہ کی تسخیر سے، انسان کو حدود و فراموش بندلوں تک لے جاتا ہے۔

اور دین اس دنیا کو سنوارنے سے یہاں بھی جنتِ حائل کرتا ہے اور وہاں بھی۔

دین اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے حرکت و عمل کا شعلہ جوالہ بنادیتا ہے۔

دین ظلم و استبداد، سلب و نہب کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ وہ کمزور انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر ظالم اور مستبد حق اور انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔

دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

مذہب ہر خوشی میں غم کا پہلو دیکھتا ہے اور
انسان میں ایسی مایوسانہ ذہنیت پیدا کر دیتا ہے
جس میں ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ
آئے مجھے مہسی بھی تو میں رو دیا کروں

مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ لبورنا اور
تیوریاں چڑھانا سکھاتا ہے۔

مذہب، موت کی سسکیاں ہیں۔

مذہب، ایک خواب پریشاں ہے۔

مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دیتا ہے۔

مذہب انسانی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر
دیتا ہے۔

مذہب، انسانیت کی موت ہے۔

دین ہر غم کو خوشی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے اور انسان کی
نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ نامساعد
حالات کی انتہائی تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن
دیکھتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

شب گزراں ہوگی آخر جلوۂ غورِ شید سے

دین اعلان کرتا ہے کہ مَنْ حَرَّمَ زَيْنَةَ اللَّهِ
الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ - (۲۴۳) وہ کون ہے
جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار
دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے
لئے پیدا کیا ہے۔

دین، زندگی کے قہقہے۔

دین، زندہ حقیقت۔

دین کہتا ہے کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ - (۵۵)

زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ اس
لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

دین، قبرستانوں میں صُورِ اسرافیل پھونک کر مُردوں
کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

دین ہے اصل حیاتِ موت ہے اس پر حرام

دین خدا کا رسول — دین خدا کا کلام !

دینِ فقیہِ حرم — دینِ امیرِ جنود — دین ہے ابنِ السبیل، اس کے ہزاروں مقام

دین کے مضارب سے نغمۂ تارِ حیات — دین سے نورِ حیات، دین سے نارِ حیات

یہ ہے وہ دین جو مذہب میں تبدیل ہو کر انسانیت کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں سوتے اس لئے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سچ کے نقاب میں پیش کرتا ہے۔ مذہب بھی یہی کرتا ہے۔ وہ دین کے الفاظ، اصطلاحات، رسوم و مناسک اسی شکل میں قائم رکھتا ہے لیکن ان کی روح نکال دیتا ہے۔ یہی دین کے وہ بے روح خدو خال ہیں جن سے مذہب عوام کو دھوکا دیتا ہے۔ مذہب، درحقیقت، دین کی مٹی شدہ لاش کا نام ہے۔



دین کے ساتھ برادران! جو کچھ اقوام سابقہ کے ہاتھوں ہوا تھا وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قرآن کریم میں مکمل کیا اور حضور نے یہ قرآن، اُمت کو دے دیا۔ لیکن حضور کی تشریف براری کے منظور سے عرصے بعد مفاد پرست قوتوں نے اُبھرا شروع کر دیا۔

اسلام کے ساتھ یہی کچھ ہوا | اس دفعہ پہلے ملکیت آئی۔ اس کے ساتھ سرمایہ داری۔ اور ان دونوں

نے اپنے تحفظ کے لئے دین کو مذہب میں بدلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ دین بھی آہستہ آہستہ اسی طرح مذہب میں تبدیل ہو گیا جس طرح سابقہ انبیائے کرام کا لایا ہوا دین تبدیل ہوا تھا اس فرق کے ساتھ کہ اس دین کا ضابطہ قرآن کریم — اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہا، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا تھا۔ لیکن اس کتاب کا محفوظ رہنا، مذہب کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکنا رہا۔ چنانچہ اس نے اسے قوم کی زندگی سے عملاً خارج کرنے اور اس طرح اسے ایک ضابطہ حیات کے طور پر غیر مؤثر بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ رسول اللہؐ کے بعد کسی نبی کو نہیں آنا تھا جو دین کو اس کی اصلی شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ دین قرآن کے اندر منضبط تھا اور قرآن حرفاً حرفاً محفوظ۔ اس لئے اب دین کو اسکی اصلی شکل میں پیش کرنے کی صورت یہی تھی کہ قرآن کریم کو عملی زندگی کا ضابطہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہی وہ کوشش تھی جو ہمارے زمانے میں تحریک پاکستان کی شکل میں سامنے آئی۔ جیسا کہ معلوم ہے پاکستان۔

کا تصور علامہ اقبالؒ کی بصیرت قرآنی کارہین منت ہے۔ انہوں نے اس

مطالبہ کی بنیاد ہی اس حقیقت پر رکھی تھی کہ قرآن کریم مسلمانوں کی عملی زندگی

تحریک پاکستان

کا ضابطہ اسی صورت میں بن سکتا ہے جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اصول و احکام نافذ کئے جاسکیں۔ غیروں کی حکومت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہیں رہ سکتا۔ آپ احباب کو معلوم ہے

کہ تحریکِ پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت، دین اور مذہب کی وہی کش مکش تھی جو ازل سے تا امروز باہم گہرے ستیزہ کا رچلی آرہی ہے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفت | مذہب کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت کا پورا اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ماتھے میں رہے اور حکمران طبقہ اُن کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشینری کا کام دے۔ اس انداز کو تھیا کر لسی کہتے ہیں لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو مذہبی پیشوائیت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت میں ایسا نظام قائم ہو جس میں امورِ سیاست، حکومت کی تفویض میں رہیں اور امورِ مذہب، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔ ہمارے قرنِ اول کے بعد جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو مسلمانوں کی حکومتوں کا انداز سیکولر رہا۔ اسی انداز کو انگریزوں نے ہندوستان میں قائم رکھا۔ ان کے عہدِ حکومت میں بھی پبلک لاز، حکومت کی تحویل میں تھے اور پرنسپل لازار باب مذہب کے سپرد۔ تحریکِ پاکستان سے مقصود یہ تھا کہ اس مملکت میں دین کی حکمرانی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں (ملوکیت اور سرمایہ داری کی طرح) مذہبی پیشوائیت کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ دوسری طرف ہندو نے یقین دلایا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد مملکت کا نظام بدستور سیکولر رہے گا۔ چونکہ یہ انداز مذہبی پیشوائیت کو (SUIT) کرتا تھا اس لئے انہوں نے ہندوؤں سے مفاہمت کر لی۔ مذہب اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے ہر ایک سے مفاہمت کر سکتا ہے، لیکن دین لاشرک ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ کسی سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔

عقل غیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے عشق بے چارہ نہ ناہم ہے نہ ملال نہ حکیم

اس لئے تحریکِ پاکستان جو دین کی بنیادوں پر اٹھی تھی نہ ہندو سے مفاہمت کر سکتی تھی نہ مذہبی پیشوائیت سے۔ چنانچہ جب اس تحریک نے مذہبی پیشوائیت سے مفاہمت نہ کی تو اس نے اس کی مخالفت میں اٹری چوٹی کا زور لگایا۔ انہیں نیشنلسٹ یا (قوم پرست) علماء کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ وہاں ایک مختصر سا گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو مذہب کے نام پر مملکت میں پورا اقتدار اپنے ماتھے میں رکھنا چاہتا تھا، یعنی یہ طبقہ تھیا کر لسی قائم کرنے کا متمنی تھا۔ چونکہ دین کی نظروں میں تھیا کر لسی بھی ایسی ہی باطل ہے جیسی سیکولرزم، اس لئے تحریکِ پاکستان اس طبقہ سے بھی مفاہمت نہیں کر سکتی تھی، لہذا یہ طبقہ بھی — متحدہ قومیت کے نظریہ کا مخالف ہونے

کے باوجود — تحریک پاکستان کا مخالف تھا۔ یہ طبقہ جماعت اسلامی کے نام سے معروف تھا۔ آپ نے غور فرمایا کہ تحریک پاکستان کی کش مکش، کس طرح درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کش مکش تھی جو ازل سے تا امروز ستیزہ کار چلی آرہی ہے۔

مذہبی طبقہ کی اس قدر مخالفت کے باوجود، پاکستان وجود میں آگیا اور **پاکستان بننے کے بعد** اس کے ساتھ ہی مخالفین کا یہ لشکر بھی اُٹھ آیا۔ اب وہی کش مکش پندرہ سو برس سے یہاں بھی جاری ہے۔ اس طبقہ کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پائے۔ اس کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ اولاً یہاں مذہبی تقاضا کر لیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس انداز کی سیکور حکومت قائم ہو جائے جس میں پبلک لاز حکومت کے ماتھے میں رہیں اور پرسنل لاز، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ چونکہ سیکور انداز حکومت، مغربی ذہنیت رکھنے والے طبقہ کے نزدیک بھی زیادہ پسندیدہ ہے، اس لئے اسے اس معاملہ میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ مفاہمت کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا۔ اس بناء پر یہاں اس انداز کی حکومت قائم ہو جانے کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ وہ طبقہ بھی جو یہاں تقاضا کر لیا جائے گا کرنے کا متمنی ہے، سر دست ان لوگوں کے ساتھ مفاہمت کرنے پر آمادہ ہے، اگرچہ ان کی آخری منزل تقاضا کر لیا ہی ہے۔

ان حضرات کی یہ کوشش دستور سازی کے سلسلے میں برابر جاری ہے۔ چنانچہ پہلی دستور ساز اسمبلی کے پیش نظر یہ تجویز تھی کہ قانون سازی کے آخری اختیارات **دستور پاکستان** ایک علماء بورڈ کے سپرد کر دیئے جائیں۔ یہ تقاضا کر لیا گیا تھا کہ اس لئے یہ حضرات اس پر بہت غور کریں۔ جب وہ اسمبلی ٹوٹ گئی تو ان کی کوشش سیکور انداز کی طرف منتقل ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کا دستور، جس کے منظور ہونے پر ان حضرات کی طرف سے شادیانے بجائے گئے تھے، اسی انداز حکومت کا مظہر تھا۔ اس میں پرسنل لاز کو پبلک لاز سے الگ رکھا گیا تھا اور مختلف فرقوں کے وجود کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کا آئین اس لحاظ سے ۱۹۵۶ء کے آئین سے بہتر ہے کہ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق کی گئی ہے اور نہ ہی مختلف فرقوں کے وجود کو تسلیم۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ۱۹۶۲ء کے آئین کی،

اس قدر مخالفت ہو رہی ہے اور مطالبہ یہ ہے کہ اس کی جگہ ۱۹۵۶ء کے دستور کا "اسلامی حصہ" اس دستور میں شامل کیا جائے۔

عالمی قوانین کی مخالفت

آپ نے برادرانِ عزیز! کبھی اس پر غور کیا ہے کہ یہ حضرات، ملک کے تمام قوانین کو چھوڑ کر عالمی قوانین کی تنسیخ کے لئے اس قدر شور مچا رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ملک میں اس وقت ایسے ایسے قوانین رائج ہیں جو صریحاً اسلام کے خلاف ہیں۔ مثلاً یہاں زنا کاری قانوناً جائز ہے، عصمتِ فروشی کے بازار ہر شہر میں کھلے ہیں۔ علاوہ بریں ایک بالغ لڑکے اور لڑکی کا باہمی رضامندی سے، بغیر نکاح، جنسی اختلاط قانوناً جرم نہیں۔ آپ نے کبھی سنا ہے کہ ان حضرات کی دینی غیرت نے کبھی ان قوانین کے خلاف بھی جوش کھایا ہو اور انہیں منسوخ کرنے کے لئے انہوں نے محاذ قائم کئے ہوں؟ یہ کیوں ہے کہ ان قوانین کے خلاف ان کی طرف سے کبھی جدوجہد نہیں ہوتی لیکن عالمی قوانین کے خلاف اس قدر قیامت برپا کی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، عالمی قوانین پر سنل لازتھے جو مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں چلے آ رہے تھے۔ قرنِ اول کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے حکومت ان قوانین کو مذہبی پیشوائیت کے حیطہ اقتدار سے نکال کر حکومت کے دائرہ اختیار میں لائی ہے۔ مذہبی پیشوائیت اسے اپنی حدودِ حکومت میں دخل اندازی سمجھتی ہے۔ اس لئے وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات ان قوانین کے خلاف متحرک محاذ بنا کر کھڑے ہو گئے ہیں؛ ورنہ ان قوانین میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہو۔

آپ کی دعوت

اس تمام کشمکش میں برادرانِ عزیز! دینِ فالحص کی طرف دعوت دینے والی آواز آپ کی طرف سے اُٹھ رہی ہے۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت کی ساری مخالفت کا رخ آپ کی سمت ہے۔ کس قدر خوش بخت ہیں وہ لوگ جو دین اور مذہب کی کشمکش میں اُس طرف کھڑے ہیں جہر حضرات انبیائے کرام اور قدوسیوں کی وہ جماعتیں کھڑی ہوا کرتی تھیں جنہیں خدا نے حزبِ اللہ

طائرِ شل لا (۱۹۵۸ء — ۱۹۶۲ء) کے دوران حکومت کی طرف سے چند قوانین جاری ہوئے تھے جن میں مسلمانوں کے نکاح، طلاق، تعددِ ازدواج وغیرہ سے متعلق مروجہ قوانین کو قرآنِ کریم کے قریب لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ان قوانین کی سخت مخالفت ہوئی تھی۔

کہہ کر بیکار ہے۔ یہ حضرات اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کریں کم ہے۔

چونکہ مذہب، ہر نظریہ، ہر تصور، ہر نظام اور ہر ادارہ کے ساتھ مفاہمت کر سکتا ہے۔ اور سرمایہ دار طبقہ اس کا پشت بناتا ہے، اس لئے ان لوگوں کے پاس نہ روپے پیسے کی کمی ہوتی ہے نہ اسباب و ذرائع کی محتاجی۔ روپے کے زور پر یہ لوگ پراپیگنڈہ کی مشینری پر قابو پالیتے ہیں اور جھوٹ کو سچ کر کے دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ دین، ان قوتوں میں سے کسی سامان و ذرائع کی فراوانی کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے جو لوگ اس کی دعوت کو لے کر اٹھتے ہیں ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔

فقر جنگاہ میں بے ساند و یراق آتا ہے

پھر مذہب اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر حربے کا استعمال جائز سمجھتا ہے۔ وہ جھوٹ بولنے میں کوئی باک نہیں محسوس کرتا وہ سینٹ پال کے الفاظ میں بڑے فخر سے کہتا ہے کہ

اور مختلف حربے

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے، خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر مجھ پر گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے۔ (رومیوں کے نام، ۳)

وہ بڑے طمطراق سے فتویٰ دیتا ہے کہ

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، مئی ۱۹۵۸ء)

وہ تعلیم یہ دیتا ہے کہ

دنیا کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے بڑے مقدس اور زریں اصول پیش کرو، لیکن جب اس طرح قوت حاصل ہو جائے تو تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر عملاً وہ کچھ کرو جس میں اپنا مفاد سمجھو۔ (ترجمان القرآن، مئی ۱۹۵۸ء)

اپنے مقصد کے حصول کے لئے اگر رشوت تک بھی دینی پڑے تو اسے کارِ ثواب سمجھو، البتہ اس کا

نامِ تالیفِ قلبِ رکھو۔

مذہب ہمیشہ سے یہی کچھ کرتا چلا آرہا ہے اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اپنی فریب کاریوں سے دین کو شکست دے سکتا ہے۔ دین خدا کے اُل قوانین کا نام ہے اور ان قوانین کا آخر الامر غالب آنا خدائی پروگرام ہے۔ خدا کے پروگرام کو دنیا **دین کا غلبہ** کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن (جیسا کہ آپ احباب کو اچھی طرح

معلوم ہے) حق آہستہ آہستہ باطل کے نظام پر غالب آتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس لئے کہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال، بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے جن اربابِ نظر کی نگاہیں ان انقلابات پر ہیں جو اس وقت دنیا کے ہر گوشے میں رونما ہو رہے ہیں (اور جنہیں علامہ اقبالؒ قیامتِ موجود سے تعبیر کیا ہے) انہیں نظر آرہا ہے کہ اب مشیت کے پروگرام کے مطابق باطل کے نظام ہائے زندگی کے مٹنے کا وقت بڑی تیزی سے آرہا ہے۔ دنیا سے ملوکیت کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے۔ ہرنئے سورج کے ساتھ کوئی نہ کوئی تاج فضا میں اڑتا دکھائی دیتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری (جاگیرداری، زمینداری) حرفِ غلط کی طرح مٹ رہا ہے اور ان کے ساتھ ہی مذہب کی سحر کاریاں بھی انحراف کی طرح ہوا میں اڑتی چلی جا رہی ہیں۔ آپ ذرا غور کریں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی قلوب و اذان پر مذہب کی جو گرفت آج سے پچاس سال پہلے تھی، وہ بڑی حد تک ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ ہندوستان سے

مذہب کا انجام سناٹن دھرم بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ بدھ مت کا مامن و مسکن چین تھا

اسے وہاں سے دیس نکال لیا چکا ہے۔ تبت ان کے خداؤں (لاماؤں) کا پایۂ تخت تھا۔ وہ وہاں سے بیک بینی دو گوشہ نکالے جا چکے ہیں۔ اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہودیت، مذہب کو چھوڑ کر، سیاست میں بدل چکی ہے۔ عیسائیت کی قدیم عمارت کا وسطی ستون پوپ ہے اس نے ابھی پچھلے دنوں جس نئی پالیسی کا اعلان کیا ہے وہ اس حقیقت کی غماز

صاحبِ عبد الرحیم اشرف صاحب نے اپنے اخبار "المیزان" بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا کہ مودودی صاحب نے انہیں ملتان جیل میں کہا تھا کہ کراچی جاؤ اور طلوعِ اسلام کے دفتر کے کسی شخص کی تالیفِ قلب کر کے اس سے طلوعِ اسلام کے پتے حاصل کر لو۔

ہے کہ اس کا اقتدار بھی خطرہ میں ہے۔ غرضیکہ مذہب کی دنیا میں آپ جہاں بھی دیکھیں گے آپ کو نظر آجائے گا کہ

مے خانہ کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

جب ساری دنیا میں مذہب کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے تو آپ سمجھتے ہیں کہ وہ مذہب (دین نہیں، مذہب) جو ہمارے ہاں رائج ہے باقی رہ جائے گا؟ اس وقت سوال اُس مذہب یا اس مذہب کا نہیں سوال نفس مذہب کا ہے خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ کہنا کہ دوسروں کا مذہب باطل ہے اور اُس مذہب حق، اس لئے یہ فنا نہیں ہو سکتا، خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ دنیا میں ہر مذہب کے علمبردار یہی کہتے ہیں۔ لیکن مذہب حق پر ہوتا ہی نہیں۔ حق پر تو خدا کا دین ہوتا ہے۔ اب مذہب کا دور ختم ہو رہا ہے، اس لئے مذہبی مفاد پرستوں کی ہزار کوششوں اور مقدس آرزوں کے باوجود یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ علامہ اقبالؒ نے عرصہ ہوا، لیگ آف نیشنز (آنجہانی) کے متعلق کہا تھا کہ

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے ڈر ہے خبر بد نہ میرے منہ سے نکل جائے

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے!

ممکن ہے کہ یہ واسطہ پیر کا فرنگ ابلتیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

جو کچھ انہوں نے لیگ آف نیشنز کے متعلق کہا تھا وہی کچھ اب انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے متعلق نظر آتا ہے۔ اس وقت اگر بابِ مذہب کے ہاں جذبات کی جو شدت نظر آتی ہے وہ ان کی حرکتِ مذہبی ہے۔ اس سے یہ کچھ وقت کے لئے فضا میں انتشار اور معاشرہ میں خلفشار تو پیدا کر سکتے ہیں، اپنی سندا کو گرنے سے بچا نہیں سکتے۔ زمانے کے تقاضے انہیں ختم کر کے رہیں گے۔

لیکن برادرانِ عزیز! جب باطل، زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں مٹتا ہے تو اس میں ایک

لَاوَالَا

نقص رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ تقاضے صرف باطل کو مٹاتے ہیں، اس کی جگہ، حق کا

نظام ساتھ کے ساتھ قائم نہیں ہوتا۔ ان دونوں کے درمیان ایک خلا رہ جاتا ہے جسے قانونِ خداوندی

کی کائناتی رفتار کے مطابق چمک کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں زمانے کے

تقاضے "اللہ کے نشتر" ہوتے ہیں جو فصمہ کھول کر کثیف خون باہر نکال دیتے ہیں، لیکن اس کی جگہ صالح

خون ساتھ کے ساتھ پیدا نہیں کرتے۔ یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہوتا ہے جو دین کا نظام قائم کرنے کا دلولہ

اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ وہ وقت، جب زمانے کے تقاضے باطل کے کسی نظام کو مٹا رہے ہوں ان لوگوں کے لئے بڑا سانگہ کار بھی ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی بڑا صعوبت انگیز بھی۔ سانگہ کار تو اس لئے کہ ان کا آدھا کام — یعنی لالہ کا مرحلہ — زمانے کے تقاضے یا اللہ کے نشتر پورا کر دیتے ہیں۔ انہیں اس ہموار شدہ زمین پر لالہ اللہ کی غارت استوار کرنی ہوتی ہے لیکن پُراز صعوبات اس لئے کہ جس طرح ایک ”مبصوت“ نکلنے وقت ٹہری دہشت انگیز نشانی پیچھے چھوڑتا ہے، باطل کی قوتیں نزع کی حالت میں بڑی سخت لکڑ کوئی کرتی ہیں — بدروٹین کے میدان باطل کی قوتوں کے اسی رقصِ بسل کی یادگار ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس آئینی دور میں کم از کم پاکستان میں ان رزم گاہوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ تقابلی کر لسی قائم کرنے والوں کے عزائم کچھ اور ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بہت پہلے اس پروگرام کا اعلان کر دیا تھا، جب کہا تھا کہ

اسلام جب اس طرح اپنے آدمیوں کو تیار کر لیتا ہے تب وہ ان سے کہتا ہے کہ ہاں! اب تم روئے زمین پر سب سے زیادہ صالح بندے بنو لہذا آگے بڑھو اور لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔

(خطباتِ مودودی، ص ۲۳۵)

طلوعِ اسلام کا پروگرام | طلوعِ اسلام کا پروگرام اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم نہایت پُر امن اور آئینی طریق سے قرآنی فکر کو عام کرتے جانا چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہمارے پیشِ نظر کوئی پروگرام نہیں — حتیٰ کہ ہم ملک کی عام عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں کسی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جس قدر سامان و ذرائع کی ضرورت ہے، ہمارے پاس ان کی بے حد کمی ہے لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ تم دین کی آواز بلند کرنے کے لئے اٹھو تو خدا کی کائناتی قوتیں تمہارا ساتھ دیں گی، کچھ اس کا اثر ہے کہ سامان و ذرائع کی اس قدر کمی کے باوجود قرآن کی آواز جس تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ آپ فرادس بیس برس پہلے ادھر کا نقشہ سامنے لائیے اور پھر آج کی فضا پر غور کیجئے۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ یہ آواز کس طرح، خاموشی ہی خاموشی سے ہر گوشے کو متاثر کئے جا رہی ہے اور یہ حقیقت کس طرح ایک واقعہ بن کر سامنے آرہی ہے کہ

حسن کے راز نہاں، شرحِ دہیاں تک پہنچے آنکھ سے دل میں گئے دل سے زبان تک پہنچے
دل نے آنکھوں سے کہی آنکھ نے دل سے کہی بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے
یہ بات کے چل نکلنے کا نتیجہ ہی تو ہے کہ قرآن کی عظمت و صداقت کے معترف تو ایک طرف، اس آواز کے
شہید ترین مخالف بھی اپنے مواعظ اور تقاریر میں، قرآن کی آیات، دین کی اصطلاحات اور نظام
خداوندی کے استعارات استعمال کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

جناب شیخ وضو کے لئے سہی، لیکن کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں
اسے بھی ٹبرہ کر خوشی کا مقام یہ ہے کہ یہ آواز اب پاکستان کی حدود سے نکل کر آگے، مغربی ممالک میں بھی
پھیلتی جا رہی ہے۔ پچھلے سال میں نے آپ احباب سے ذکر کیا تھا کہ کس طرح ایک جرمن مصنف نے
اپنی پاکستانی سیاحت کی روداد کے سلسلہ میں یہ لکھا تھا کہ
مغربی ممالک میں آواز
یہاں ایک ہی تحریک قابلِ ذکر ہے اور وہ طلوعِ اسلام کی
تحریک ہے۔ اب حال ہی میں ایک کتاب ہالینڈ سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا نام ہے :

اور مصنف کا نام

(MODERN MUSLIM QURAN INTERPRETATION)

اس میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام
(J.M.S. BALJON)
میں قرآن کی جدید تعبیرات کی کوششیں کہاں کہاں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے پاکستان
سے صرف دو مصنفوں کو منتخب کیا ہے ایک علامہ مشرقی اور دوسرے آپ کا یہ رفیق — اس
نے سلسلہ معارف القرآن اور سلیم کے نام خطوط وغیرہ کا براہِ راست (اردو سے) مطالعہ کیا ہے اور
اپنی کتاب میں ان کے اقتباس پر اقتباس دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ میری زندگی کے مختصر حالات بیان کرنے
کے بعد لکھتا ہے کہ

پر دین کی خوبی یہی نہیں کہ اس نے قرآنی حقائق کی ایسی عمدہ تشریح کی ہے یا انہیں اس قدر
پایہ ادبیانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ درحقیقت ایک عمدہ معلم ہے جسے فطرت نے اعلیٰ
صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ان نوجوانوں کے لئے جو مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں
اور ان کی زندگی کی کشتی کو لنگر کی ضرورت ہے، ایک مشفق دوست ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں
سمجھئے کہ وہ جس موضوع پر بھی گفتگو کرتا ہے اس کے متعلق نہایت محکم اور آوازدار لکھتا ہے

اور نہایت معقول نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں پر طبری گہری نگاہ رکھتا ہے۔ اس لئے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس کا اثر بڑھتا جائے گا۔ (ص ۱۵)

مصر سے آواز مصر کے علامہ سیّد احمد السیّفی کے مضامین کے تراجم، طلوعِ اسلام کی گذشتہ اشاعتوں میں آپ کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔ ان مضامین کی کیفیت یہ ہے کہ اگر ان پر علامہ موصوف کا نام نہ لکھا ہو تو پہچانا نہ جاسکے کہ یہ مضامین خود طلوعِ اسلام کے ہیں یا ان کا لکھنے والا کوئی اور ہے۔ علامہ سیّفی کے علاوہ مصر میں اور علماء بھی ہیں جو اسی ہنج سے قرآن پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ان ممالک نیز، یورپ اور امریکہ سے مطالبات موصول ہو رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر انہیں بھیجا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جب قرآن اپنی اصلی شکل میں ان ممالک کے اربابِ فکر و نظر کے سامنے آیا، تو وہ اس کا استقبال آگے بڑھ کر کریں گے وہ اپنے غلط تصورات اور باطل نظامِ زندگی سے سخت تنگ آئے ہوئے ہیں اور کسی جدید نظام کے لئے بے حد مضطرب و بے قرار نظر آتے ہیں۔ مذہب ان کی تسکین نہیں کر سکتا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو وہ مذہب کے ہاں محض تنگ آکر ہی زندگی کی کسی نئی شاہراہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اور یہ شاہراہ قرآن کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتی۔ کیا عجب ہے کہ اگر ان کے سامنے خدا کا دین اپنی حقیقی شکل میں آجائے تو جس آدمِ نو کے انتظار میں زمانے کی آنکھ بار بار اُمٹ رہی ہے اس کی نمود وہیں سے ہو جائے۔ میری تو کیفیت یہ ہے کہ

اسی اُمید پہ بیٹھا ہوں سرِ راہِ گذر ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہوگی

برادرانِ من! آپ نے قرآن کی آواز کو آگے بڑھانے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس

قرآن کا مطالبہ کا میرے دل پر خاص اثر ہے۔ آپ نے سخت نامساعد حالات میں اپنی بے بضاعتی

اور کم مائیگی کے باوجود اس دیئے کو اپنے خونِ جگر سے روش رکھا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ قرآنِ کریم ہم سے جو توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے ہم انہیں کماحقہ پورا نہیں کر رہے۔ یہ تو اس کی کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف ہے جو وہ ہمیں اپنے دامن سے جھٹک نہیں دیتا۔ ورنہ حتیٰ بات یہی ہے کہ ہم اس کے معیار پر پورے نہیں اتر رہے۔ قرآن کو ہم سے بہت سے شکوے ہیں اور بالکل بجا شکوے۔

نہ جانے کتنے رگلے اس میں مضطرب ہیں نیم وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں
 اس کے وابستگانِ دامن کو تو جان اور مال دونوں اس کے ہاتھوں بیچ دینے پڑتے ہیں۔ ہم اس سودے کا
 بیانا تک بھی ادا نہیں کر سکے۔ اس لئے میں آپ احباب سے درخواست
عالمگیر انقلاب کروں گا کہ آپ اس باب میں مزید جہمت کیجئے۔ انسانی تاریخ میں یہ
 وقت بڑا نازک آیا ہے۔ جیسا کہ پہلے میں کہ چکا ہوں قدیم تصوراتِ حیات اور نظامِ ہائے زندگی کا دور دورہ
 ختم ہو رہا ہے۔ ملوکیت، سرمایہ داری، مذہب، سب ایک ایک کر کے اٹھتے اور ٹٹتے جا رہے
 ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے !
 پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطان سے بیزار ہے
 گیا دور سرمایہ داری گیا ! تماشا دکھا کر مکاری گیا !
 زمانے میں انقلابات اس تیزی سے آرہے ہیں یا کرڈیں بدل رہے ہیں۔ لیکن جس اُمت نے ایسے مقام پر
 کاروانِ انسانیت کی صحیح راستے کی طرف راہ نائی کر لی تھی اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ
 مسلمان ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنا پر پوش
 تمدن، تصوف، شریعت، کلام بقا، عجبم کے پجاری تمام
 حقیقتِ خرافات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی
 بچھی عشق کی آگ اندھیر ہے
 مسلمان نہیں راگ کا ڈھیر ہے

اس وقت لا کی طوفانی فتنیں (کمبوزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں مگر اللہ کا تصور اس
 وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد ان کے مقام سے ہٹانے یا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا
 وقت لگ جائے۔ اور انسانیت کو کتنا عرصہ اور اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے
 پڑی جھلس رہی ہے اس لئے

ایکہ آسودہ نشینی لبِ ساحلِ برخیز کہ ترا کار بگردابِ دہنگ است ہنوز
 قرآن کی نو کیفیت یہ ہے کہ جب اس کی عظمت انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو یہ اس میں

عجیب و غریب انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ حالات کی ناسازگاری اور زمانے کی مخالفت اس کے جذبہ سرشاری کو تیز تر کر دیتی ہے۔ **اَلَّذِیْنَ** **قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ۔ (۳۱)** یہ وہ صاحبانِ عزم و یقین ہیں کہ جب ان سے لوگ کہتے ہیں کہ دشمن نے تمہارے خلاف لشکرِ جرار جمع کر رکھا ہے اس لئے تمہیں اس سے ڈرنا چاہیئے تو اس سے ان کے ایمان میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کرے تمہارے ساتھ اللہ کی تائید و نصرت ہے اور یہ وہ قوت ہے جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے قرآن سے شیفتگی انسان کو کسی مقام پر بھی دل گرفتہ نہیں ہونے دیتی۔ وہاں تو حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

محمد کو اداس کر گیا جبکہ سلوکِ انجمن اٹھ کے نگاہِ دلِ بدمی ہاتھ میرا دبا گئی

اس لئے برادرانِ گرامی قدر! وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی کوششوں کو تیز کر دیجئے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے پہلے سے بھی زیادہ جوش و انہماک کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جائیئے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے آپ احباب نے اس وقت تک میرے پروگرام کی تکمیل کے لئے جس مخلصانہ رفاقت کا ثبوت دیا ہے اس کا گہرا نقش میرے دل پر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ جیسے رفقاء **میری آرزو** سفرِ رہبر و حیات کے نصیب کرے۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ اس پیغام کو مغربی ممالک تک پہنچانے کے بعد ایک ایسی درس گاہ قائم کی جائے جس میں نو نہالانِ ملت کی تعلیم و تربیت خالص قرآنی خطوط پر ہو۔ اور وہ اس قابل ہو سکیں کہ اس چراغ کو بدستور روشن رکھیں اور میں مرتے وقت ان سے کہہ سکوں کہ

بگیراں ہمہ سرمایہ بہارِ ازمین! کہ گل بدستِ تو از شاخِ تازہ ترماند

کس قدر پرسکون ہوگی ایسی موت جس پر ہر دیکھنے والا بے ساختہ پکار اٹھے کہ

قسمت نگر کہ کشتہ شمشیرِ عشق یافت مرگے کہ زندگیاں بدعا آرزو کنند



آخر میں عزیزانِ گرامی قدر! میں ایک ایسے نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں جسے اچھی طرح نہ سمجھنے

سے کئی ذہنوں میں پریشانی اور بعض دلوں میں افسردگی تک پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہم اتنے عرصے سے اس آواز کو بلند کر رہے ہیں لیکن لوگ اس طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسری جماعتوں کو دیکھئے تو ان کے پیچھے لاکھوں افراد نظر آتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے۔ ہماری برسوں کی ٹنگ و تاز سے، گنتی کے افراد ہمارے شریکِ سفر ہوئے ہیں اور مذہب پرست طبقہ کی ایک آواز پر لاکھوں افراد ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس کی بین وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتے ہیں اور آپ اس کے چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں۔ وہ لوگ عوام کو انہی باتوں کی دعوت دیتے ہیں جنہیں وہ پہلے سے مان رہے ہوتے ہیں، اور آپ انہیں ان راستوں پر چلنے سے روکتے ہیں۔ جن پر صدیوں سے آنکھیں بند کر کے چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ آپ ذرا غور کیجئے کہ بنی اسرائیل کی طرف خدا کے دو جلیل القدر نبی — حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ مبعوث ہوئے ہیں۔ وہ برسوں

تک ان کی تعلیم و تربیت میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ صرف اس قدر نکلتا ہے کہ **فَمَا أَمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّتَهُ يَتَمَنَّىٰ قَوْمًا**۔ (دین) ان پر قوم کے

گوسالہ سامری

چند نوجوانوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ اس کے برعکس سامری انہیں ایک بُت تراش کر دیتا ہے اور ساری قوم اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ اس میں سامری کی کارِ بیگماری اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اس نے قوم کی نفسیات کا مطالعہ کیا اور گوسالہ پرستی کے جو جذبات ان کے دل کی گہرائیوں میں پہلے سے موجود تھے ان کی تسکین کا سامان فراہم کر دیا۔ یہی ہر زمانے کا سامری کرتا ہے۔ وہ قوم کی خوئے بُت پرستی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کے ذوقِ عبودیت کی تسکین کے لئے ایک نیا بُت تراش کر دے دیتا ہے اور خود اس بُت کے کا پجاری (مہنت) بن جاتا ہے۔ وہ اس بُت تراشی میں بھی ایک پائی اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتا۔ وہ قوم ہی کے زیوروں کو ڈھال کر انہیں ایک بُت بنا کر دے دیتا ہے۔ جب تک قوم میں خوئے بُت پرستی موجود ہے کسی بُت ساز کو بھی پکار لیں۔ کی کمی کی شکایت نہیں ہو سکتی۔ ہر تکرار آباد ہوگا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ جس بُت خانے کا مہنت زیادہ شاطر اور چالاک ہوگا اس میں چڑھاؤ زیادہ چڑھے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے ہاں پہلے سے اس قدر خانقاہوں، درگاہوں اور مقبروں کی موجودگی کے باوجود ہر نئی قبر پر کس دھوم دھام سے میلہ لگتا ہے۔ اس میلے کی رونق کا راز اس قبر کی جاذبیت میں نہیں بلکہ قوم کی خوئے بُت پرستی میں مضمر ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو شخص قوم کے دل سے بت پرستی کے جذبات نکالنا چاہتا ہے اس کی منزل بڑی کمٹن اور اس کے راستے بڑے پُر خار ہوتے ہیں۔ دین اور مذہب کی مہی وہ کش مکش ہے جس میں صاحبِ ضربِ کلیم کا ساتھ قوم کے چند افراد دیتے ہیں اور سامری کے پیچھے ساری قوم لگ جاتی ہے۔ یہی چار ہزار سال پیشتر ہوتا تھا اور یہی آج ہو رہا ہے۔ اس لئے برادرانِ من! آپ نہ تو اپنے دعوت کے نتائج کی مستِ روی سے گھبرائیے اور نہ ہی سامریانِ عصرِ حاضر کی کامیابی کو ان کے مسلک کی صداقت کی علامت سمجھئے۔ آپ صرف یہ دیکھئے کہ آپ کی دعوت، اس پیام کی نقیب ہے یا نہیں جسے خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اسے قدم قدم پر جانچتے رہیے اور اس کی خاص احتیاط برتئے کہ اس دعوت کی کامیابی کے لئے کوئی طریق ایسا اختیار نہ کیا جائے جو ضابطہ خداوندی کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو۔ یاد رکھیے اس تحریک کی کامیابی کے لئے اگر آپ کا ایک قدم بھی غلط اٹھ گیا تو وہی آپ کی شکست اور ناکامی کا مقام ہوگا۔ اور اسے بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس راستہ میں سب سے زیادہ گراں بہا متاعِ سفر اور محکم ترین سامانِ حفاظت، آپ کی سیرت کی بندی اور کیریکٹر کی پختگی ہے۔ آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز، آپ کی اپنی ذات کے ساتھ دیانت اور دوسروں کے ساتھ حسنِ معاملہ میں پوشیدہ ہے۔ اگر آپ نے اپنے اندر یہ جو ہر پیدا کر لئے تو پھر آپ کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی کہ

جہاں زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت مسیحؑ کی انقلاب آفریں تسلیم

(ایک درس قرآن کا ملخص)

(مارچ ۱۹۶۲ء)

عیسائیت کی مروجہ تعلیمات کی رو سے حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ کچھ اس نوعیت کا ہے کہ خدا کے اس جلیل القدر پیغمبر کی زندگی ایک تادک الدنیا اور عاجز و ناتواں زاهد گوشہ نشین کی سی تھی اور انہوں نے قدوسیوں کی جو جماعت پیدا کی وہ بھی در بدر پھرنے والے مفلوک الحال فقیروں کا سا ایک گروہ تھا جو مسکینی، عاجزی اور بے چارگی میں بڑے معصوم کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ کچھ اس قسم کی تعلیمات آپ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال آگے بڑھا دو۔ جو کوئی گرتا لینا چاہے اُسے از خود چٹہ اُٹا کر دے دو۔ جو ایک کو س بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کو س تک چلے جاؤ۔ دشمن سے بھی محبت کرو۔ شریہ کا مقابلہ نہ کرو ظلم کا انتقام نہ لو۔ مظلومی، عاجزی اور انکساری کی زندگی بسر کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ الفاظ بظاہر بڑے خوش آئند اور نگاہ فریب نظر آتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ انہیں معلوم ہے کہ تمام انبیائے کرام اس دنیا میں ایک انقلابِ عظیم کی دعوت لے کر آئے تھے۔ ان کی بعثت کا مقصد اولیٰ ظلم و جبر کی قوتوں کے بچے توڑ کر مظلوم و مقہور نوعِ انسانی کو آزادی اور سر بلندی عطا کرنا تھا۔ ان کی حیاتِ طیبہ اس مقدس فریضہ کی امین تھی کہ انسانوں کو بے بسی اور بے چارگی کے بندھنوں سے نجات دلا کر کشادہ زندگی

سے بہرہ ور کیا جائے۔ ان سب کی دعوتِ انقلاب اس نصب العین کی نفی تھی کہ اولادِ آدم کو ملوث، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت اور اسی قسم کی دوسری زنجیروں میں مقید نہیں رکھا جاسکتا۔

مسیح علیہ السلام اسی انقلاب آفریں اور جہاد انگیز پیغام کے داعی تھے اور انہوں نے اولوالعزم قذوسیوں کی جو جماعت تیار کی تھی ان میں ہر دھڑ کی باندی لگانے کے دلوے اسی شدتِ آرزو اور بے تابیِ تمنا کے ساتھ موجود تھے جو دیگر انبیائے کرام کے رفقاء جلیل کے قلوب میں موجزن ہوتے تھے جس طرح صاحبِ ضربِ کلیمؑ نے اپنی دعوتِ انقلاب کی لرزہ خیز قوتوں کے زور پر فرعون کی ملوکیت، قارون کی سرمایہ داری اور ہامان کی مذہبی پیشوائیت کی مہیب قہرمانیوں سے ٹکری، بعینہ اسی عزم و جلال سے مسیح علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کو رومی شہنشاہیت، سرمایہ داری اور یہودی علماء و مشائخ کے استبداد سے نجات دلانے آئے تھے، بلکہ سچ پوچھئے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی راہ میں جو مشکلات حائل تھیں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ چڑھ کر تھیں اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ خود بنی اسرائیل اپنے احبار و رہبان کی قیادت میں ان کے خون کے پیاسے اور جان کے لاگو تھے ان یہودی احبار و رہبان کو صاف نظر آ رہا تھا کہ جس مسلکِ حیات کی طرف خدا کا یہ اولوالعزم نبی دعوت دے رہا ہے اس سے ان کی مذہبی سیادت اور پیشوائیت کی مسدیں ہمیشہ کے لئے چھن جائیں گی۔

مصائب و مشکلات کے اس نامساعد ماحول میں مسیح علیہ السلام کی دعوتِ انقلاب کا آغاز ہوا۔ بد قسمتی یہ ہے کہ صدیوں کی تحریفات سے حضرت عیسیٰؑ کی صحیح تعلیم اناجیل سے بہ مشکل سامنے آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس طب و یالس میں پھولوں کی بکھری ہوئی پتیوں کی طرح کہیں کہیں اس آسمانی دعوت کی جھلک موجود ہے جو حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام نے پیش کی۔ چونکہ نہربی کی تعلیم (اپنے بنیادی مقاصد کے اعتبار سے) ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد اور قہرمانیوں کے خلاف کھلا چیلنج ہوتی ہے اس لئے اس پیغام میں بھی اسی اعلانِ جنگ کی صدا ئے باز گشت سنائی دے گی۔

اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے مشہور مؤرخ (CECIL ROTH) کی مشہور کتاب

کایہ اقتباس سامنے لے آئیے کہ (A SHORT HISTORY OF THE JEWISH PEOPLE)

حضرت مسیحؑ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی اربابِ حکومت نے اس جرم کی پاداش میں حوالہ دار و رسن کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرأت کی تھی حضرت

یہودیوں کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک طرف آپ مسیح موعود ہونے کے مدعی تھے جسے بنی اسرائیل کو غیروں کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لئے آنا تھا۔ اور دوسرے انہیں ان اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔

(صفحہ ۱۲۰)

مسیح علیہ السلام کی تعلیم عاجزی اور بے چارگی اختیار کرنے کی تعلیم نہیں تھی بلکہ یہ اعلانِ جہاد | ظلم و جبر کی مستبد قوتوں کے خلاف زندگی اور اس کی ہر متاعِ عزیز کی بازی لگا دینے کا اعلان تھا۔ مٹی کی انجیل اس دعوتِ جہاد کو یوں پیش کرتی ہے۔

یہ نہ سمجھ کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور اس آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہونگے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔

(متی ۲۴ — ۳۸)

حضرت مسیحؑ اپنے سرفروشن فدائیوں کو جب آسمانی دعوت کی اشاعت و تبلیغ کے لئے روانہ کرتے تو انہیں حسبِ ذیل ہدایات سے مستفید

رفقاءِ انقلاب کے نام

فرماتے تھے۔

ان بارہ کو یسوعؑ نے بھیجا اور انہیں حکم دے کر کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی بھٹیروں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرنا، مردوں کو جلانا — کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا، بدردھوں کو نکالنا، یتیم نے مفت پایا مفت دینا، نہ سونا اپنے کمر بند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے۔ نہ راستے کپڑے جھولی لینا۔ نہ دو، دو کرتے، نہ جوتیاں، کیونکہ مزدور اپنی خوراک کا حتی دار ہے اور جس شہر یا گاؤں میں داخل ہونا، دریافت کرنا کہ اس میں کون لائق ہے اور جب تک وہاں سے روانہ نہ ہو اسی کے ہاں رکو۔ اور گھر میں داخل ہوتے وقت

اسے دعائے خیر دو۔ اور اگر وہ گھر لائق ہو تو تمہارا سلام اسے پہنچے۔ اور اگر لائق نہ ہو تو تمہارا سلام تم پر پھر آئے اور اگر تمہیں کوئی قبول نہ کرے اور تمہاری بات نہ سنے تو اس گھر یا اس شہر سے نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عدالت کے دن اس شہر کی نسبت سدوم اور عمورہ کے علاقہ کا حال زیادہ برداشت کے لائق ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا کہ

دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ پس سانپوں کی مانند ہوشیار اور کبوتروں کے مانند بھولے بنو، مگر آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کر دیں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے۔ اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے تاکہ ان کے اور غیر قوموں کے لئے گواہی ہو۔ لیکن جب وہ تمہیں پکڑ وائیں تو فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح کہیں اور کیا کہیں۔ کیونکہ جو کچھ کہنا ہوگا اس گھڑی تمہیں بتایا جائے گا۔ کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کا روح ہے جو تم میں بولتا ہے۔ بھائی کو بھائی قتل کے لئے حوالے کرے گا۔ اور بیٹے کو باپ۔ بیٹے اپنے ماں باپ کے برخلاف کھڑے ہو کر انہیں مرد آڈالیں گے اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا لیکن جب تمہیں ایک شہر میں ستائیں تو دوسرے کو بھاگ جاؤ۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے کہ ابنِ آدم آجائے گا۔

(متی ۱۶-۲۳)

مذہبی اجارہ دار جو اپنی "خدا کی حکمت میں بھٹا کر،

خدا اور مذہب کے نام پر اپنی ہوسٹاکیوں کے لئے

یہودی پیشوائیت زلزلے میں

سامان تسکین پیدا کرتے ہیں کس طرح دینِ خداوندی کی آسانی دعوت کو اپنی پیشوائیت کی مفاد پرستیوں کے لئے سامانِ موت سمجھتے ہیں؟ اس کا اندازہ یہودی علماء و شیوخ کی اس چیخ و پکار سے لگائیے جسے انجیل برنباس میں بالفاظِ ذیل پیش کیا گیا ہے۔

"تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا، "اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا

کسریں گے۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ ہماری تقلید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہو گئے کہ اپنی روٹی غلطیہ کے طور پر مانگیں۔“

حالانکہ اس وقت یہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پردا کرنے والے نہیں، جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پروا نہیں کرتے اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کریں۔ پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی بنا لینا ممکن ہے۔ مگر جب کہ یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز راضی بنایا جاسکے گا مگر جب کہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے دیکھے جیسی کہ موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنیاس فصل صفحہ ۱۲۲)

علماء و مشائخ کے کردار کی ایک جھلک | یہ یہودی علماء و مشائخ کس خبیث باطن کے مظہر اور کس پستی و کردار کے پیکر تھے، اس کی تصویر بھی اناجیل کے اوراق میں ملے گی۔ مسیحؑ پوچھئے تو مسیح علیہ السلام کا سب سے بڑا "جرم" یہی تھا کہ انہوں نے ان احبار و رہبان کی دسیسہ کاریوں کے خلاف جو اپنے مصنوعی تقدس کے زریں نقاب میں نوعِ انسانی کی بدبخنی کا سامان بن گئے تھے، صدائے حق بلند کی تھی۔ یہ تنقید کس قدر شدت کا انداز اختیار کئے ہوئے تھی اس کا اندازہ اناجیل کے حسبِ ذیل بیانات سے بخوبی ہو سکے گا۔ سنئے متی کی انجیل میں ہے کہ

اس وقت یسوعؑ نے مجھڑے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کہیں کہ فقیہہ اور فریسی موسیٰؑ کی گدائی پر بیٹھتے ہیں۔ پس وہ جو کچھ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو۔ لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری یو جھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ مگر آپ انہیں انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں، کیونکہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی

کمرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے رتی کھلانا پسند کرتے ہیں۔ مگر تم رتی نہ کھلاؤ، کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو۔ اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو، کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے۔ اور نہ تم ہادی کھلاؤ، کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح۔ لیکن جو تم میں بڑا ہے وہ تمہارا خادم ہے۔ اور جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا۔ اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا۔ اسے ریاکار فقیہ ہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اسے ریاکار فقیہ ہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو۔ اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اسے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں۔ لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اسے احمقو! اور اندھو! کون سا بڑا ہے سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں۔ لیکن جو نذر اس پر پڑھی ہو اگر اس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اسے اندھو! کونسی چیز بڑی ہے؟ نذر یا قربان گاہ۔ جو نذر کو مقدس کرتی ہے۔ پس جو قربان گاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور سب چیزوں کی، جو اس پر ہیں قسم کھاتا ہے۔ اور جو مقدس کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور اس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے جو آسمان کی قسم کھاتا ہے وہ خدا کے تخت کی اور اس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا ہے۔ اسے ریاکار فقیہ ہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پردہ کی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اسے اندھے راہ بتانے والو! جو پتھر کو تو چھاتے ہو اور اونٹ کو

نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیانا نہ بھردو۔ اے سانپو! اے افخی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔ اس لئے دیکھو۔ میں نبیوں اور دانائوں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہائیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور طرح کی نجاست بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔

(متی ۲۲/۳۶)

یہ ہے ایک دھندلا سا عکس اس برگزیدہ نبی کی انقلابی تعلیم کا جو اپنی آسمانی دعوت انقلاب اور عظمت بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھڑول کو نجات دلانے اور مقام انسانیت پر فائز کرنے آیا تھا۔ لیکن ملوکیت اور پیشوائیت کی مخصوص مصلحتوں اور مفاد پرستیوں نے اس تعلیم کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور اپنی پرفریب تحریفات سے اس انقلاب آفرین شخصیت کے مقام و پیام پر ایسے پردے ڈال دیے کہ اب عیسائیت اپنی مروجہ تعلیمات کی رو سے خانقاہ نشین زاهدوں، مسکینوں، عاجزوں اور بے بسوں کا مذہب نظر آتی ہے یا دیکھئے! مسیح علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت جو گوشے ہم نے ان صفات میں گھس گئے ہیں وہ کسی ایک دور سے وابستہ نہیں۔ ملوکیت، سرمایہ داری اور پیشوائیت ہر دور میں اسی کردار کا مرقع نظر آئے گی جس کی تصویر ان اقتباسات میں جھلک رہی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضورِ سالتما تب کی کہانی — خدائے بڑی کی زبانی

(عیدِ میلادِ النبی پر تقسیم)

(اکتوبر ۱۹۶۰ء)

غالبِ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دالِ محمد است

خدا نے مخلوق کو پیدا کیا تو اس کی پرورش کا ذمہ بھی خود ہی لیا۔ اسے خدا کی ربوبیت کہتے ہیں۔ حیوانیات تک پرورش محض طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کی ہوتی ہے۔ اس کے لئے خدا نے صفحہٴ ارض پر سامانِ رزق کو پھیلا دیا اور ساتھ ہی ہر نوع (SPECIES) کو وہ ہدایات (DIRECTIONS) دے دیں جن کے مطابق وہ سامانِ رزق سے مستفید ہو سکتی ہے۔ یہ ہدایات، ہر نوع کے ہر فرد کے اندر پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی جاتی ہیں انہیں جبلت (INSTINCT) کہتے ہیں۔ یہی وہ جبلت ہے جس کی رو سے (مثلاً) بطخ کا بچہ انڈے سے نکلنے ہی پانی کی طرف لپکتا ہے اور مرغی کا چوزہ خشکی کی طرف دوڑتا ہے، یا بکری گھاس کھاتی ہے، گوشت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ اور شیر گوشت کھاتا ہے گھاس کی طرف تکتا نہیں خواہ وہ بھوکوں کیوں نہ مر جائے۔

انسانی ہدایت کا سرچشمہ | انسان کو دوسری زندگی ملی ہے۔ ایک تو وہی طبعی زندگی (اس کے جسم کی زندگی) جو ہر حیوان کو ملی ہے اور دوسری انسانی زندگی جو کسی حیوان کو نہیں ملی۔ جہاں تک اس کی طبعی زندگی کا تعلق ہے انسانی بچے کو بھی اس امر کی ہدایت پیدائش کے ساتھ ہی مل جاتی ہے کہ وہ بھوک کے وقت کس طرح اپنے رزق (دودھ) کے چشموں سے فائدہ اٹھائے۔ اس چیز کے لئے اسے کسی خارجی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں تک اس کی انسانی زندگی کا تعلق ہے، اس کے لئے انسان کے اندر کوئی ہدایت نہیں ہوتی۔ یہ ہدایت اُسے خارج سے ملتی ہے۔ اس ہدایت کا طریق یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو یہ ہدایت بذریعہ وحی عطا کرتا تھا۔ (اسے خدا کا نبی یا رسول کہتے ہیں) اور وہ اس ہدایت کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ انسانوں کے لئے اس طریق ہدایت کو اختیار کرنے میں ایک خاص مصلحت تھی۔ جو ہدایت کسی کے اندر پیدائشی طور پر رکھ دی جاتی ہے، وہ اس ہدایت کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بکری گھاس کے کھانے پر اور مچھلی پانی میں تیرنے پر مجبور ہے۔ وہ اس کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی۔

لیکن انسان کو خدا نے صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے یہ حیوانات سے ممتاز ہے۔ اگر یہ ہدایت اس کے اندر رکھ دی جاتی تو یہ بھی (حیوانات کی طرح) اس پر چلنے کے لئے مجبور ہوتا اور اس طرح اس کا اختیار و ارادہ باقی نہ رہتا۔ یعنی یہ بھی حیوانات کی سطح پر آ جاتا۔ اس لئے اس کی صورت میں، خدا نے یہ کیا کہ اس کی طرف ہدایت (بذریعہ انبیاء کرامؑ) خارج سے بھیجی اور اس سے کہہ دیا کہ یہ چاہئے تو اسے اختیار کرے اور چاہئے اس سے انکار کر دے۔ مگر یہ اسے اختیار کر لے گا تو اس کے ثواب انبیت کی نشوونما ہو جائے گی۔ اگر یہ اس سے انکار کر دے گا تو حیوانی سطح پر رہ جائے گا اور اس کی زندگی جہنمی ہو جائے گی۔

آخری ہدایت | جن حضرات (انبیاء کرامؑ) کی وساطت سے خدا کی ہدایت دوسرے انسانوں تک پہنچی تھی وہ پہلے خود اس ہدایت پر عمل کرتے تھے اور ان کا یہ عمل دوسروں کے لئے نمونہ بن جاتا تھا۔ آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ حضرت نوحؑ سے شروع ہوا اور نبی آخر الزماںؑ محمد رسول اللہؐ پر جا کر ختم ہو گیا۔ یعنی خدا نے جو ہدایت نوعِ انسانی کو دینی تھی وہ قرآن کریم میں تکمیل

تک پہنچ گئی جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اس لئے اس کے بعد کسی مزید آسمانی ہدایت کی ضرورت نہ رہی اور جب کسی مزید ہدایت کی ضرورت نہ رہی تو کسی ہدایت لانے والے (نبی یا رسول) کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور نبی اکرم خدا کے آخری نبی ہیں۔

قرآن کریم نے جہاں یہ بتایا ہے کہ جو ہدایت اس میں دی گئی ہے اصولی طور پر وہی ہدایت پہلے انبیائے کرام کو بھی دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سابقہ انبیائے کرام کی زندگی کے احوال و کوائف بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ انہوں نے اس ہدایت کو کس طرح پیش کیا اس پر کس طرح عمل کر کے دکھایا اور ان کی قوم کی طرف سے ان کی دعوت کا کیا جواب ملا۔ جس طرح اس نے انبیائے سابقہ کے متعلق یہ کچھ بتایا ہے اسی طرح اس نے خود نبی آخر الزماں (ص) کے متعلق بھی یہ کچھ بیان کیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ کچھ اس شرح و بسط سے بیان ہوا ہے کہ ان درخشندہ موتیوں کو

قرآنی سیرت

ایک لڑی میں پرو لیا جائے تو اس سے سیرت نبی اکرم کی سبک گہوار نہایت آب و تاب سے مرتب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ میں نے اپنی کتاب (معراج انسانیت) میں جو بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، حضور کی سیرت کو قرآنی آیات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی تفصیل کو سمٹائی ہوئی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اپنی اس کوشش نام کو عید میلاد النبی کی تقریب سعید پر تحفہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ آسان زبان میں پیش کیا جائے، کیونکہ احباب کا تقاضا ہے کہ حضور کی سیرت طیبہ کے قرآنی خط و خال سلیس زبان میں سامنے لانے چاہئیں تاکہ اس ہمارا کم تعلیم یافتہ طبقہ بھی مستفید ہو سکے۔



نبوت کوئی ایسی چیز نہیں جسے انسان اپنے کسب و ہنر سے محنت کر کے حاصل کر لے۔ یہ خدا کی طرف سے وہی طور پر ملتی تھی۔ جس ہستی کو یہ خصوصیت عطا کی جانی مقصود ہوتی تھی اس کی شروع سے تربیت

(حاشیہ فقہ ۲۴۴) خدا کا رسول نہ آیا ہو لیکن اس نے تفصیلی طور پر صرف سامی اقوام کے انبیائے کرام ہی کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی اولین مخاطب قوم، ان انبیائے کرام سے واقف تھی اور وہ خود بھی سامی اقوام سے تھی۔

خود اللہ تعالیٰ کی زیرِ نگرانی ہوتی تھی۔ اس شخص کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا تھا کہ اسے نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے زمانے کی غلط باتوں سے متنفر ہو جاتا تھا۔ اسے حقیقت کا علم تو نہیں ہوتا تھا لیکن باطل کی باتوں میں تلاش حقیقت میں سرگرداں رہتا تھا۔ یہی وہ کیفیت ہے جس سے قرآن کریم نے سب سے پہلے نبی اکرمؐ کا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ - (۹۳)

ہم نے تجھے (تلاش حقیقت میں) سرگرداں پایا تو راستہ دکھادیا۔

اس کیفیت تک پہنچنے کے لئے ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ سرزمینِ حجاز کا سب سے بڑا اور مشہور شہر مکہ، اپنی تمام جاذبیوں کے ساتھ، وہاں کے باشندوں اور باہر والوں کے لئے مرکزِ توجہ بن رہا ہے۔ اس توجہ کی بنیادی وجہ خانہ کعبہ ہے جس کا حقیقی مقصد توان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے، لیکن اس کی عقیدت لوگوں کو دور دور سے اس کی طرف کھینچنے لئے آتی ہے۔ یہ لوگ فرطِ عقیدت میں اس کے گرد جمع ہیں۔ کوئی تالیاں پٹیتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی جذب و کیف کے عالم میں اس کے گرد گھومتا ہے۔ کوئی ناچتا ہے کوئی کودتا ہے۔ کوئی بتوں کے استخوان پر جانور ذبح کر کے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا مصروفِ بادہ پرستی ہے۔ کاهنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو ان سے اپنے فسانہ، عشق و محبت کا انجام معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے سننے والوں کی ناک میں نکیل ڈالے جس وادی میں چاہے لئے لئے پھرتے ہیں۔ وہ کسی کے دل میں افسوںِ محبت پھونکتے ہیں اور کہیں آتشِ انتقام کے شعلے بلند کرتے ہیں۔

لیکن مکہ کی انہی گلیوں میں ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان کا نظر نہیں آتا۔ اسے حیرت کعبہ کی ان ہنگامہ آرائیوں میں کوئی جاذبیت دکھائی دیتی ہے نہ عکاظ کی رستاخیزوں میں کوئی کشش۔ وہ ان پڑھ ہے لیکن عیسائی راہبوں اور یہودی عالموں کے پاس جاتا ہے کہ شاید انہی سے حقیقت کا سراغ مل جائے۔ وہ وہاں سے دل برداشتہ اٹھتا ہے تو صحرا کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا

عروسِ حقیقت کی بے نقابی | ہے اور کائنات کی نیرنگیوں پر غور و فکر کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کی ہر مجلس میں جاتا اور کائنات کے ہر گوشے میں گھومتا ہے کہ کہیں اسے وہ شے مل جائے جس کا اُسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے لیکن ہر مقام سے یہ کہتا ہوا ناکام لوٹتا ہے کہ

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

وہ اسی طرح مضطرب و بے قرار پھرتا ہے کہ ایک شب لیلائے حقیقت یک بیک اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے اور اپنے حسین چہرے سے یوں نقاب اٹھاتی ہے کہ اس کے تبسم سے کائنات جگمگا اٹھتی ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا (۲۸/۵) اور ایسی مبارک رات جس میں خدا کی حکمت بالغہ سے حق و باطل نکھر کر الگ الگ ہو گئے اور نوحِ انسانی کو زندگی کی نئی اقدار مل گئیں۔ (۲۴/۳۴ ز ۹۷)۔

یوں خدا کی وحی اس پر نازل ہوئی جو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے۔

عطا ئے وحی | وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِئُ مَا أَكْتُابٌ وَلَا إِلَٰهَ إِلَّا يَمَانٌ - وَلَٰكِنِّي جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِيهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۲۲/۵۲)۔

نہ وہ جانتا تھا اور نہ ہی اسے اس کی کوئی توقع تھی۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُو أَن يُبَلِّغَ إِلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ (۲۸/۲۸)۔
وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ (۲۸/۸۹)

یوں اس متلاشی حقیقت کو نبوت عطا ہو گئی اور اسے وہ کچھ سکھادیا گیا جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔

یہ حاملِ نبوت یتیم بھی تھا اور غریب بھی۔ (الْمَرْحُومُونَ يَتِيمًا فَالْوٰی وَجَدَكَ

ط شہرِ رمضان الذی اُنزل فیہ القرآن۔ (۲/۱۸۵)
مَا اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِی لَیْلَةِ مَّبَارَاکَةٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ - فِیْهَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ (۲۲/۲۲) اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِی لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷)۔

بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْكِتَابِ وَلَا تَخْطِئُ يَمِينُكَ..... (۹۲)۔ نیز نبوت سے پہلے، اُن پڑھ بھی (فَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِّن قَبْلِهِ مِّنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطِئُ يَمِينُكَ..... (۲۹)۔
یوں اس بے یار و مددگار، یتیم، عزیز اور نادار، اُن پڑھ، صحرا نشین کو تمام عالم انسانیت کا سب سے بڑا معلم بننے کے لئے منتخب کیا گیا۔



عام طور پر خیال کیا جائے گا کہ جب اس شخص نے وہ کچھ پایا جس کی اُسے تلاش تھی تو پھر وہ زندگی کے باقی دن آرام و سکون سے بیٹھ رہا ہوگا۔ اس لئے کہ جب مقصد حاصل ہو جائے تو پھر جدوجہد ختم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے۔ لیکن نبی کی کیفیت عام لوگوں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ اسے نبوت تو بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے لیکن اس پر ذمہ داریاں اس قدر عائد کی جاتی ہیں جن سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ (وَدَوَّعْنَا

نبوت کی ذمہ داریاں

عَنَّاكَ وَدَّرَكَ الذِّنِّىَ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ (۹۷) چنانچہ منصب نبوت پر سرفراز کئے جانے کے بعد نبی اکرم سے کہا گیا کہ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ اِذْ اَعْلَمَ كَيْفَ يَكْفُرُوْنَ اَعْمٰى۔ (۱۰۰) اور لوگوں کو غلط نظام زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

حکماں ہے اک وہی باقی بتاں آذری!

ظاہر ہے کہ جس دعوت سے مراد یہ ہو کہ انسانوں کے نظامِ کہن کی بساط اُلٹ کر اس کی جگہ ایک جدید نظام قائم کیا جائے اس دعوت کی مخالفت ہر طرف سے ہوگی۔

دنیا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص غیروں کی مخالفت مول لیتا ہے وہ اپنوں کو اپنے ساتھ ضرور

رکھتا ہے۔ اس کا اپنا قبیلہ اور خاندان ہوتا ہے جو دوسروں کی مخالفت میں اس کا پشت پناہ

بنتا ہے۔ وہ انہی کی مدد اور حمایت کے بھروسہ پر دوسروں کے خلاف اٹھتا ہے۔ لیکن آسمانی انقلاب

کے داعی کا انداز، اس باب میں بھی دنیا جہان سے نرالا ہوتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ اس دعوت کا

آغاز ہی اپنے خاندان اور قبیلے سے کرو۔

وَ اَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْاَقْرَبِينَ (۲۶)

سلسلہ دعوت

اے رسول! اپنے قریبی رشتہ داروں کو، ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرو۔ اس کے بعد آگے بڑھو اور سارے اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح کی آبادیوں تک اس دعوت کو پہنچاؤ۔ (وَ كَذَلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرْىٰ وَ مَن حَوْلَهَا..... (۲۷) اس کے بعد اس سلسلہ کو وسیع کرو اور پوری کی پوری عرب قوم کو اس کے دامن تلے لے آؤ۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنَاكَ فِيْ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا اُمَمٌ لِّتَنْتٰهُنَّ عَلٰیٰهِمُ النَّارُ اَوْ حَيٰتُنَا اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (۲۸) اور اسی طرح ہم نے تجھے ایک ایسی قوم کی طرف بھیجا ہے جس سے پہلے بہت قومیں ہو گزری ہیں۔ (بھیجا اس لئے ہے) تاکہ جو بات تجھ پر وحی کی گئی ہے تو اسے ان کے سامنے پیش کرو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدائے رحمن کا انکار کرتے ہیں (تو انہیں اس پر ایمان کی دعوت دے)۔

اور اس کے بعد اس سلسلے کو ایسا حد و فراہم کر دے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کو اپنے آغوش میں لے آئے۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيعًا (۲۹)۔ تو عالمِ انسانیت کو پکار کر کہہ دے کہ میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

یہ تھیں وہ عظیم ذمہ داریاں جو نبوت عطا ہونے پر اس ذاتِ گرامی پر عائد کی گئیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ

دعوت کیا تھی جسے اس طرح عام کرنے کے لئے اس قدر تاکید کی جا رہی

یہ دعوت کیا تھی؟

تھی؟ یہ دعوت کوئی نئی دعوت نہیں تھی یہ وہی دعوت تھی جو ہر آسمانی

انقلاب لانے والے (نبی) کے ذریعہ انسانوں تک پہنچائی گئی تھی یعنی يٰٓهٰٓؤُمْ اٰعْبُدُوْا اللّٰهَ

مَا تَكْمَدُوْنَ اِلٰهَ غَيْرًا (۳۰) محکومیت صرف خدا کے قوانین کی اختیار کرو۔ اس کے

سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے۔ یعنی

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

دیکھنے میں تو یہ چار لفظ ہیں لیکن ان میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آگئے ہیں۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ** (۱۳) خدا کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسانوں پر اپنا حکم چلائے۔ دنیا میں اقتدار صرف قوانین خداوندی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار و اختیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت تھی محکوموں کو حاکموں کے استبداد سے نجات دلانے کی۔ یہ دعوت تھی مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے رہائی دلانے کی۔ یہ دعوت تھی ان زنجیروں کو توڑنے کی جن میں ناتواں انسانیت جکڑے چلی آرہی تھی اور اس کے سر سے اس بوجھ کو اتارنے کی جس کے نیچے وہ بُری طرح کچلی جا رہی تھی۔ (وَقَضَعُمْ عَنْهُمْ أُمُورَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ)۔ (۱۴)

اعلانِ جنگ

اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ دعوت، دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار و ذی اختیار کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ اس لئے ان کا اس دعوت کے خلاف محاذ پر اُٹھ کھڑے ہونا بالکل فطری تھا۔ اس میں ایک طرف ایسا ہیابِ حکومت تھے تو دوسری طرف مذہبی پیشوا نیت کے علمبردار۔ دائیں کو سرمایہ داروں کا گروہ تھا، تو بائیں طرف فریب کاروں کا۔ (وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا قَائِمًا) (۲۵) اور اس طرح انسانیت کی عدالت کے بحر میں آسمانی دعوت لانے والے نبی کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ یہ سرکشی اور مخالفت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے پاس بڑی دولت ہے اور ہمارا جتنہ بھی بہت بھاری ہے اس لئے ہم پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے؟ (وَقَالُوا لَنُحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ) (۲۶)۔ قرآن انہیں مترفین کا گروہ کہہ کر پکارتا ہے، یعنی وہ تن آسان جو دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ آسان انقلاب کی دعوت جب اور جہاں بھی بلند ہوئی اس طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ (وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا قَالَ مُتَرَفُّوهُمْ إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَاذِبُونَ) (۲۷) ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا کہ وہاں کے تن آسان

مخالفت

خوشحال طبقہ کی طرف سے اس کے پیغام کی مخالفت نہ ہوئی ہو۔ یہی وہ طبقہ تھا جس کی طرف سے نبی اکرم کی دعوت کی مخالفت ہوئی۔ اسی طبقہ کا وہ نمائندہ تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ **وَجَعَلْتُ لَهُ مَا لَمْ مَمْدُودًا قَبِيحِينَ شُهُودًا** (۲۸) ہم نے اسے فراواں دولت اور (کثیر) بیٹے دیئے تھے جو دہاں موجود تھے۔ (وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا) (۲۹) اور میں نے اس کے تمام معاملات درست کر رکھے تھے بڑا ساز و سامان دے رکھا تھا۔ یہی تھا

جس نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا کہ فَقَالَ اِنَّ هَذَا اِلَّا سِحْرٌ يُوشِرُۢ لَ اِنَّ هَذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۲۵-۲۴) یعنی رسول اللہؐ کا یہ دعویٰ کہ انہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے، غلط ہے۔ یہ (معاذ اللہ) جھوٹ ہے جو یونہی چلا آ رہا ہے۔ یہ صرف انسانی کلام ہے۔ چنانچہ کبھی آپ کو ساحر کہا گیا اور کبھی کذاب، کبھی شاعر کبھی مجنوں۔ وہ اس کی مخالفت دلیل و برہان کی رو سے نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ عوام کو یہ کہہ کر مہر کا تے تھے کہ یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے مسلک سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ یہی ان کی دلیل تھی اور یہی بُرہان۔ وَكَذٰلِكَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قُرْآنٍ مِّنْ نَّذِيرٍ اِلَّا قَالُ مُتَرَفُّوْهَا اِنَّا وَاٰبَاؤُنَا عَلٰى اُمَمٍ وَّاِنَّا عَلٰى اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔ (۲۳-۲۴) ”اے رسول! جس طرح آج مکہ کے سردار تمہاری مخالفت میں سرگرم ہیں، اسی طرح تجھ سے پہلے بھی بدتمیز رہے۔ چنانچہ ہم نے جس آبادی کی طرف اپنا رسول بھیجا تو وہاں کے مترنین نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم اس نئی دعوت کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے اور ہم اُنہی... کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتے چلے جائیں گے۔ لیکن انہیں اس دلیل کی کمزوری کا احساس تھا اور اس امر کا یقین تھا کہ جس شخص نے ایک مرتبہ بھی قرآن کو قوجہ سے سن لیا تو وہ مزور اس پر ایمان لے آئے گا۔ اس لئے وہ اپنے لوگوں کو تاکید کرتے تھے کہ لَا تَتَّبِعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْخَوَافِ فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَبُوْنَ۔ (۲۴-۲۴) اس قرآن کو مت سنو۔ جہاں اس کی تعلیم دی جا رہی ہو وہاں شور مچا دو۔ یہی ایک طریق ہے جس سے شاید تم اس شتم تحریک پر غالب آ سکو۔

قرآن مت سنو

قرآن کے متعلق تو وہ یہ کہتے اور خود رسول اللہؐ کے متعلق لوگوں کو یہ کہہ کر بہکاتے کہ ذرا دیکھو تو سہی یہ کس قسم کا رسول ہے کہ يٰۤاَكُلُ الْبَطْخَامَ وَيَمْسِشُنِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔ عام لوگوں کی طرح کھانا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ رسول کو عام انسانوں سے الگ قسم کا ہونا چاہیے۔ اس کے پاس فوق الفطرت قوتیں ہونی چاہئیں۔ اگر اس پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے تو تَوَلَّوْا اَنْزَلَ اِلَيْهِ مَلٰٓئِكٌ فَيَكُوْنُ مَعَهُ نٰذِرًا۔ (۲۵-۲۵) ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ آتا اور وہ اس کے ساتھ لوگوں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتا۔ اس طرح ساری دنیا دیکھ لیتی کہ واقعی اس کی طرف فرشتے خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں؟

وہ تو ہم پرستی کا زمانہ تھا۔ اس لئے لوگوں کا ان کے اس بہکادے میں آجانا لازمی تھا۔ چنانچہ لوگ حضورؐ کے پاس آتے اور آپؐ سے کہتے کہ آپؐ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں۔ آپؐ ان کی ان باتوں کو صبر و سکون سے سنتے اور ایک تبسمِ جاں نواز سے ان سے کہتے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا

سب سے بڑا معجزہ

تَعْقِلُونَ۔ (۱۱)۔ میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تمہیں میرے متعلق کچھ علم نہ ہو۔ میں نے اس دعویِٰ نبوت سے پہلے ایک عمر تمہیں لوگوں میں گزاری ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ کیا میری زندگی تمہیں یہی بتاتی ہے کہ میں جھوٹا اور فریب کار ہوں؟ تم ذرا عقل و فکر سے کام لو اور سوچو کہ جھوٹے کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے؟

اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ وہ معجزہ تھا جس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ لیکن مفاد پرست گروہ کے دل میں اس سے مخالفت کی آگ اور بھی زیادہ تیز سو جاتی تھی۔ چنانچہ اب انہوں نے، الزام تراشی اور تہمت بافی سے آگے بڑھ کر، دست درازمی بھی شروع کر دی۔ قرآن کریم نے اس مخالفت کی تفصیل کو چار لفظوں کے اجمال میں یوں سٹھا دیا ہے کہ وَآتَهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا۔ (۱۲)۔ اور جب اللہ کا یہ بندہ خدا کو پکارنے کے لئے اٹھا تو قریب تھا کہ مخالفین چاروں طرف سے پوش کر کے اس سے لپٹ جائیں۔

جوں جوں ادھر سے مخالفت کی شدت بڑھتی جاتی تھی، خدا کی طرف سے آپؐ کو استقامت اور استقلال کی تاکید زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کبھی کہا جاتا اُمِرَ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ۔ (۱۳) جو کچھ یہ تم سے کہتے ہیں

اس پر استقلال و استقامت کو ہمت سے نہ جانے دو۔ فَاٰمُرُ اِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفُّكَ السَّيِّئِينَ لَا يُؤْقِنُونَ

استقامت کی تلقین

(۱۴)۔ تم اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں مستقل مزاجی سے کام لو اور اس حقیقت پر یقین رکھو کہ خدا نے تم سے جو وعدہ کر رکھا ہے کہ آخر الامر تمہارا مشن کامیاب ہوگا وہ بالکل سچا ہے اور یاد رکھو تم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے تم ان مخالفین کی نظروں میں ہلکے ہو جاؤ۔ استقامت سے کام لو اور ان کی حرکات سے دل برداشتہ ہو کر اپنے کوششوں میں کمی نہ ہونے دو جن سے تم ان لوگوں کو تباہی سے بچانا چاہتے ہو۔ وَذَكِّرْ بِهِ اِنَّ تُبَسِّلَ نَفْسٌ يَّهْمًا كَسَبَتْ (۱۵)۔ اور قرآن کے ذریعہ

لوگوں کو نصیحت کرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بد عملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے۔
 فَلِذَا لَيْكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ (۴۲)۔ ترا کی طرح
 انہیں صمیم نظامِ زندگی کی طرف دعوت دیتا رہو اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے استقامت و عزیمت سے اس
 راہ پر چارہ اور ان مخالفین کی خواہشات کا اتباع مت کر۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ ۖ وَاصْبِرْ (۴۳)۔
 جو کچھ تجھے پر وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کئے جاؤ اور اپنی راہ پر استقامت سے قائم رہو، تم بھی اور
 وہ لوگ بھی جو اپنی غلط روش کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہوئے ہیں۔ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ
 مَعَكَ (۴۴)۔ ثابت قدم رہو اور اپنی تنگ و تاز کو تیز تر کرتے جاؤ۔ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ
 وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ آنَايِ اللَّيْلِ
 فَسَبِّحْ ۖ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ ۚ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ (۴۵)۔ جو کچھ تیرے خلاف کہتے (اور کرتے) ہیں
 تم اس پر ہمت نہ ہارو۔ ثابت قدم رہو اور اپنے نشوونما دینے والے کے پر و گرام کو وجہِ حمد و ستائش
 بنا کر دکھانے میں پوری تنگ و تاز سے کام لو، صبح شام، راتوں کے اوقات میں، اطرافِ نہار میں، غرضیکہ
 دن رات اس پر و گرام کی تکمیل میں مصروفِ جدوجہد رہو، تاکہ اس طرح تم اس کے خوشگوار نتائج کو
 اپنے سامنے دیکھ کر خوش ہو جاؤ۔

جب مخالفین نے دیکھا کہ اتنی شدید مخالفت کے باوجود، اس جماعت کی تنگ و تاز میں کوئی فرق
 نہیں آتا اور یہ تحریک آگے ہی بڑھتی جا رہی ہے تو جیسا کہ بساطِ سیاست کے مہرہ بازوں کا قاعدہ ہے،

انہوں نے چاہا کہ آپ سے مفاہمت (COMPROMISE)

مفاہمت کی کوشش

کر لی جائے۔ وَذُوقُوا لَوُثَّةَ هِنٍ فَيَذَرُوهُنَّ (۶۸)۔ ان
 کی یہ خواہش ہے کہ اگر تم کچھ مہانت برنؤ، اپنے مقام سے تھوڑا سا پھسل جاؤ، تو یہ بھی مہانت سے
 کام لیں۔ ظاہر ہے کہ قرآنی نظام میں ان لوگوں کی مفاد پرستیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ
 یا تو باہمی مفاہمت سے اس نظام کی جگہ کوئی دوسرا نظام قائم کر لیا جائے، یا قرآنی نظام میں ایسی تبدیلی
 کر دی جائے جس سے ان کی مفاد پرستیوں کے لئے کچھ گنجائش نکل آئے۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا
 بَيِّنَاتٍ لَّا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ۖ إِنَّا نُبَيِّنُ لِقَاءَنَا غَيْرِ هَٰذَا ۖ أَوْ يَدَّيْنَاهُ (۶۹)۔ جب ان
 کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی امید نہیں رکھتے، وہ کہتے

خال الذہن ہو کر سوچنے کی کوشش کی تو تم خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ مَا بِصَا حِسْمُ
سوچو | مِّنْ حِثَّةٍ (۳۴)۔ تمہارا یہ ساتھی پاگل نہیں ہے۔ یہ جو کچھ کہتا ہے یہ بڑی سمجھ بوجھ
 کی بات کہتا ہے۔ اس کے ماننے میں تمہارا ہی بھلا ہے۔ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ (۳۵)
 میں تو تم سے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگتا۔

اس سے بہت سے سعادت مند افراد نے، رفتہ رفتہ ادھر آنا شروع کر دیا اور اس جماعت
 میں ترقی ہونی شروع ہو گئی۔ ان کے سامنے بہت بڑا پروگرام تھا۔ غلط معاشرہ کی جگہ ایک جدید معا
 کا قیام، جس میں مفاد پرستوں کی ہوس رانیوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ کوئی چھوٹا کام نہ تھا۔ قذو سیوں
 کا یہ مختصر سا گروہ دن رات اسی فکر میں غلطاں و بیچاں اور اسی مقصد کے حصول کے لئے جنباں و
 کوشاں رہتا تھا۔ اس باب میں اس کی شدتِ شوق خود فراموشی تک پہنچ جاتی تھی جسے روکنے کے
 لئے خود دستِ قدرت کو اس قافلہٴ ارشد و ہدایت کے بدی خواں
دن رات کا پروگرام | کی دامن کشی یہ کہہ کر کرنی پڑی تھی کہ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ اَلَمْ يَكُنْ
 اَللَّيْلُ اِلَّا قَلِيلًا نِّصْفُهَا اَوْ اَنْقَضَ مِنْهُ قَلِيلًا (۳۳) راتوں کو مختوڑا جاگا کر نصف
 شب تک یا اس سے کم و بیش اس لئے کہ ابھی تو آغازِ سفر ہے۔ اِنَّا سَنُلْقِيْكَ عَلَيْهِ قَوْلًا
 ثَقِيْلًا (۳۴)۔ تجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈالی جائے والی ہے۔ اور اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا
 طَوِيْلًا (۳۵)۔ تجھے دن کو کون سا آرام کا وقت مل جاتا ہے۔ اس میں بھی تمہارا پروگرام لمبا
 چوڑا ہوتا ہے۔

جوں جوں یہ پروگرام قرار گیر ہوتا جا رہا تھا مخالفین کی ایذا رسانیاں شدید تر ہوتی جا رہی
 تھیں۔ عام لوگوں کو مخالفین پر غصہ آتا ہے اور ان کے خلاف آتشِ انتقام تیز ہوتی جاتی ہے۔ لیکن
 نبی کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

جیسے ایک طبیبِ مشفق کو نادان مریض کی بے احتیاطی اور بد پرہیزی سے دکھ ہوتا ہے اسی طرح
 ان مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر نبی اکرمؐ کا جی کڑھتا تھا اور اس تصور سے آپ کا دل خون ہو جاتا
 تھا کہ یہ نادان محض تعصب اور جہالت کی وجہ سے کس طرح اپنے آپ کو تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم
 کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہے ہیں۔ حضورؐ کی شدتِ احساس کی یہ کیفیت تھی کہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ

کہنا پڑا کہ تَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ

منا لفین سے ہمدردی

(۲۶) ایسا نظر آتا ہے کہ تم اس غم میں کہ یہ لوگ حق و صداقت

کی راہ کو تسلیم نہیں کرتے، اپنی جان ہلاک کر لو گے۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَاتٍ

(۲۷) ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کی حالت پر غم کھانے سے تم اپنی جان گنوا بیٹھو۔ فَإِنْ أَعْرَضُوا

فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنَّ عَذَابَكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (۲۸) اگر یہ لوگ اس

راہ سے اعراض برتتے ہیں تو ہم نے تجھے اُن کا محافظ بنا کر نہیں بھیجا۔ تمہارے ذمہ بس اتنا ہی ہے کہ

تم اس پیغام کو ان تک پہنچا دو۔ ہم نے انہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور اپنا راستہ

آپ اختیار کرنے کی استعداد بخشی ہے۔ مَا نُنَاذِرُكَ إِلَّا بِمَا نَاكَ ۚ فَتَذَكِّرُ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّطٍ (۲۹) تم انہیں حقیقت کی یاد دہانی کراتے رہو۔ تمہارا

فریضہ یاد دہانی کرنا ہے۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر کئے گئے۔

یہ سلسلہ جاری رہتا آئے کہ وہ وقت آ پہنچا جب دیکھ لیا گیا کہ ان میں سے جن لوگوں نے عقل و فکر

اور دلیل و برہان کی رُو سے صحیح راستہ اختیار کرنا تھا وہ اس جماعت میں شامل ہو گئے اور باقی وہ

رہ گئے ہیں جن پر پند و نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۳۰) انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج

سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے ان کے لئے یکساں ہے۔ جو شخص خود کشی کرنے پر تیار بیٹھا

ہو، اس سے یہ کہنا کہ دیکھنا راستے میں کھائی ہے، بے کار ہے۔ جو شخص حیوانی سطح زندگی.....

.....

ہی کو زندگی سمجھتا ہے اور انسانی زندگی کو تسلیم نہیں کرتا اور باہر دہر

(PHYSICAL LIFE)

طرح سمجھانے کے اپنی منہ نہیں چھوڑتا، اسے انسانی سطح زندگی کے اصول و قوانین کی تلقین کیا

فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ لہذا اس مقام پر حضورؐ سے کہا گیا کہ فَاغْرِضْ عَنْ مَّن تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا

وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (۵۳) سو جو شخص ہمارے قوانین سے رُو گردان کر رہا ہے اور طبعی

زندگی کے سوا اور کچھ ارادہ ہی نہیں رکھتا اُس سے تم اعراض بر تو۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ

سَلَامٌ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۵۴) ان سے الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ میرا اب سلام ہے۔ عنقریب

انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ تم کہتے تھے وہ کس طرح حراً خفا ٹھیک تھا۔

لیکن ان مخالفین کا جوشِ انتقام اس کے باوجود ٹھنڈا نہ ہوا اور وہ حضورؐ کے خلاف طرح طرح کی سازشیں

کرنے لگے۔ **حضورؐ کے خلاف سازشیں** | **وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ**
أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۖ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُونَ

اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَبِيرٌ الْمَاكِرِينَ۔ (پہ)۔ (اور اے رسول! وہ وقت یاد کر دیجیے) مخالفین میرے خلاف اپنی خفیہ تدبیروں میں لگے ہوئے تھے تاکہ تجھے گرفتار کر لیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے تھے اور خدا اپنی تدبیر کر رہا تھا اور (یہ ظاہر ہے کہ) خدا بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ چنانچہ اس تدبیر کے مطابق حضورؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی جہاں کی فضا کے متعلق علم تھا

کہ وہ نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ ہجرت سے یہی مقصود ہوتا ہے، **ہجرت** | اسی لئے مکہ چھوڑتے وقت حضورؐ کے لب پر یہ دعائیں تھیں کہ (وَقُلْ) رَبِّ اَدْخِلْنِيْ

مَدْخَلَ مِثْلِيْ وَ اَخْرِجْنِيْ مَخْرَجَ مِثْلِيْ وَ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا۔ (۱)۔ اے میرے نشوونما دینے والے! تو مجھے جہاں کہیں پہنچا سچائی کے ساتھ پہنچا اور جہاں سے نکال سچائی کے ساتھ نکال اور مجھے اپنے ہاں سے ایسی قوت عطا فرما جو ہر حال میں مدد کرنے والی ہو۔

آپؐ اس حالت میں مکہ سے نکلے کہ صرف ایک رفیق ہمراہ تھا۔ لیکن اس (بظاہر) بکیسی اور بے بسی کے عالم میں بھی اپنے مشن کی صداقت اور کامیابی پر ایسا یقین محکم تھا کہ اپنے ساتھی کو تلقین فرما رہے تھے کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ (پہ)۔ مت گھبراؤ۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

مدینہ کے مسلمانوں نے، مکہ سے آنے والے مسلمانوں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اور یوں ایک ایسی برادری کا وجود عمل میں آیا جو خون، رنگ، وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر محض آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر متشکل ہوئی تھی اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نصیرین عطا ہوئے کہ اِنَّ السَّيِّئِيْنَ اَمْثُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جَآهَدُوْا بَاْمَوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ السَّيِّئِيْنَ اَوْوَا وَ نَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاُ بَعْضٍ (پہ) جو لوگ

ایک نئی برادری | ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) جگہ دی، اور ان کی مدد کی، تو یہی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔

اب (نظر بظاہر) مخالفین کی مخالفت ختم ہو جانی چاہیے تھی لیکن انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ نظام جس کی طرف نبی اکرمؐ دعوت دیتے تھے، کسی ایک مقام میں بھی متشکل ہو گیا تو اس کے حیات بخش نتائج کو دیکھ کر دوسرے مقامات کے لوگ اس کی طرف ہلکے بڑھیں گے اور یوں ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے اس جماعت کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور لڑائی کے لئے اُٹھ آئے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کیا جائے۔ چنانچہ اس مختصر سی جماعت کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَنَّهُمْ ظِلْمٌ مِّنَّا وَآيَاتِ اللَّهِ عَلَى تَحْقِيقِهِمْ تَقْدِيرٌ۔ ان مظلوموں کو (جنگ کی) اجازت دی جاتی ہے جن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے دشمن اُمنڈ آئے ہیں۔ اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے، اِنَّ السَّيِّئِينَ اُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَتٍّ اِلَّا اَن يَّقُولُوا رَبَّنَا اللّٰهُمَّ يَرَوْهُ مَظْلُومٌ ہوں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں

جنگ کی اجازت

جہاں کی اجازت

تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ انہیں جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ وَتَوَلَّوْا دِفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضُكُمْ يَبْعُضٍ لِّهَدِيَّتٍ مَّتَّ صَوَامِعُ وَبَيْعُ - وَصَلَوْتُ وَمَسْجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔ اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے کہ (جو لوگ دوسروں پر زیادتی کرنے کی غرض سے چڑھ دوڑتے ہیں) ان کی مدافعت دوسرے انسان کریں تو اس دھاندلی کا نتیجہ یہ ہو کہ دنیا میں مذہب کی آزادی ختم ہو جائے اور نہ راہبوں کی کوٹھڑیاں باقی رہیں نہ عیسائی کے گرجے نہ یہودیوں کے معبد سلامت رہیں نہ مسجدیں جن میں خدا کا ذکر اس کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ ہے خدا کا پروگرام وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنْصُرُهُ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ سو جو شخص اس پروگرام کی تکمیل میں خدا کی مدد کرے گا، خدا اس کی ضرور مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا طاقتور اور غالب ہے۔ اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ مظلوم جنہیں جنگ کی اجازت دی گئی ہے اگر غالب آگئے اور انہوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تو ان کی حکومت دوسرے اربابِ اقتدار سے کس طرح مختلف ہوگی۔

اسلامی مملکت کا مقصد

قَالَ لِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۳۹-۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جب انہیں ملک میں تمکّن حاصل ہو گا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے، نوعِ انسان کی پرورش کا انتظام کریں گے، لوگوں کو قوائینِ خداوندی کی اطاعت کا حکم

دیں گے اور غیر خداوندی قوانین کی اطاعت سے روکیں گے۔ غرضیکہ اس میں تمام امور آخر الامر خدا کے پروگرام کے مطابق طے پائیں گے۔

اس مقصد کے لئے انہیں جنگ کی اجازت دی گئی۔ دونوں جماعتوں کا آمنہ سامنا بدر کے مقام پر ہوا۔ (۳۱۲)۔ مسلمانوں کے لشکر کی کمان خود نبی اکرم کر رہے تھے۔ مخالفین کو شکست ہوئی اور مظلومین کی یہ جماعت جو ابھی محظوظ اسی عرصہ پہلے اپنے گھروں سے نکالی گئی تھی، فاتح و منصور واپس لوٹی۔

شکست خوردہ مخالفین نے اپنی ذلت اور رسوائی کا بدلہ اُن بے گناہ مسلمانوں سے لینا شروع کر دیا جو مکہ میں رہ گئے تھے اور ہجرت کر کے مدینہ نہیں آنے پائے تھے۔ یہ مظلوم اپنی مدد کے لئے مسلمانوں کے سوا اور کسے پکار سکتے تھے۔ ان کی اُن پر لازم تھی اور اگر اس کے لئے جنگ ناگزیر ہو جائے تو جنگ بھی کی جاسکتی تھی، یعنی ظلم کی روک تھام کے لئے جنگ خواہ وہ ظلم کہیں ہو رہا ہو۔ اس لئے کہا گیا کہ وَمَا لَكُمْ

لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ

وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ

هَذِهِ الْقَرْيَةِ الْظَالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا۔ (۳۱۳)۔ (مسلمانوں)

تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کرو، ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے جو (چیخ چیخ کر) پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نجات دے، اللہ جس کے رہنے والے اس قدر ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی پشت پناہ بنا اور اپنے حضور سے ہمارا کوئی مددگار بھیج۔

ٹرائیوں کا یہ سلسلہ سات آٹھ سال تک مسلسل رہا تا آنکہ (آخر الامر) مکہ فتح

ہو گیا اور یوں ہر طرف دین خداوندی غالب آگیا۔ اس دوران میں آپ اس نظام نو

کی تشکیل اور اس کے مختلف گوشوں کی تعمیر و تحسین کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ اس پروگرام کی متعدد شقیں تھیں۔ مثلاً

۱۔ سب سے پہلی شق یہ ہے کہ جو کچھ آپ پر خدا کی طرف سے نازل ہوا اسے دوسروں تک پہنچایا جائے،

اس کے لئے ارشاد خداوندی تھا کہ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ

(۳۱۴) اے رسول! جو کچھ تیری طرف سے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے اُسے دوسروں تک پہنچا دے۔

۲۔ لوگوں کو قوانین اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دینا اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲)۔ یہ رسولِ لوگوں
کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کرتا ہے، ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے، انہیں قوانینِ الہیہ
اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔

۳۔ خود قرآنِ کریم کا اتباع کرنا (۶۳) اور اپنی جماعت کو حکم دینا کہ اَتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ
وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ اَوْ لِيَاۤءٍ (۶۴) جو کچھ اللہ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع
کرو اور اس کے علاوہ دوسرے کار سازوں کا اتباع مت کرو۔

۴۔ لوگوں کے متنازعہ معاملات کا فیصلہ قرآنِ کریم کے مطابق کرنا۔ اس کے لئے ارشادِ خداوندی تھا: اِنَّا اَحْكَمُ
بَيْنَهُمْ يَمَّا اُنْزِلَ اِلَيْهِ (۶۵) جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق اُن میں فیصلہ کرو۔
اس لئے کہ مَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ فَاولئك هم الكافرون (۶۶) جو اس
کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

۵۔ امورِ مملکت کے فیصلے اپنی جماعت کے مشورے کے ساتھ سرانجام دینا۔ اس کے لئے حکمِ خداوندی تھا۔
وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۶۷) اے رسول! تو معاملات
میں اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا کر اور جب اس کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو پھر تانوں
خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کر کے معاملہ پیشِ نظر کی سرانجام دہی کے لئے عمل پیرا ہو جا۔ اس جماعت
کی اہمیت اور قدر و منزلت کو خدا نے بزرگ و برتر نے ان وجدِ آفریں الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ

رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكْعًا سَجِدًا اِيْبَتَّغُونَ فَضْلًا

جماعتِ مومنین

مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السَّجْدَةِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ

فِي السُّورَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْطُهُ فَازَرَّاهُ

تَسْتَخْلَظُ فَاَسْتَوٰى عَلَى سُوْقِهِ يَعْجِبُ الزُّرَّاعُ لِيَّغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ

وَعَدَ اللّٰهُ السَّيِّئَاتِ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَاتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا

عَظِيمًا (۶۸)۔

محمدؐ اللہ کے رسول اور اُن کے ساتھ (قدوسیوں کی جماعت) جن کی خصوصیت یہ ہے کہ حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت لیکن باہمہرگہ سرتاپا رافت و محبت ہیں۔ وہ دنیا میں کسی طاغوتی طاقت کے سامنے نہیں جھکتے، جھکتے ہیں تو فقط ایک اللہ کے سامنے۔ اسی سے وہ فضل و عنایات کے خواہاں اور اسی کی رضا جوئی کے طالبِ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے سے ان کے دل میں اطمینان و سکون اور شادابی و شگفتگی کی جو جنت پیدا ہوتی ہے، اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ یہی ہے قدوسیوں کی وہ جماعت جس کے تذکرے تورات و انجیل میں آچکے ہیں۔ یہ جماعت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ حق و صداقت کی لہلہاتی کھیتی ہے۔ شروع میں اس کی کیفیت یہ تھی کہ ایمان کی زمیں صالح سے اعمال کا تخمِ حسنہ نرم و نازک پٹی کی شکل میں نمودار ہوا۔ پھر اس میں تقویت پیدا ہوئی تو وہ ایک شاخِ نودمیدہ کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر اس میں اور توانائی پیدا ہوئی تو وہ دیکھو وہ ایک سرسبز و شاداب کھیتی بن گیا جسے دیکھ کر کسان کا چہرہ خوشی سے تہمتا اٹھا اور حاسدوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ یہ کھتے حفاظت اور اجرِ عظیم کے وہ درخشندہ وعدے جو اللہ نے ایمان و اعمالِ صالحہ کے بدلے میں اس جماعت کے ساتھ کئے تھے اور جنہیں اس کی شانِ ربوبیت نے اس حسن و رعنائی سے پورا کیا۔

فراجماعتِ مومنین کی اس خصوصیتِ کبریٰ پر ایک بار پھر نگاہ ڈالیے کہ اَشِدَّاءٌ عَلٰی الْكُفَّارِ رَحَمَاءٌ بَيْنَهُمْ۔

اقبال کے الفاظ میں ۷

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر شبستانِ محبت میں حریرِ دیرنیاں ہو جا !
 گذر جا بن کے سیلِ تند کوہِ دیباہاں سے گلستاںِ راہ میں آئے تو جوئےِ نغمہ خواں ہو جا
 حضورؐ کو اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان امور میں خدا کی طرف سے وحی نہیں آتی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ جو امور وحی کی رو سے طے پا جائیں ان میں انسانوں سے مشورہ کیا معنی؟ یہ امور وحی کے قوانین کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق عقل و فکر کی رو سے طے کئے جاتے تھے جس میں غلطی کا امکان بھی تھا۔ اس کے لئے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ —

قُلْ إِنْ مَنَلْتُ فَأَمَلْتُ عَلَى نَفْسِي ۖ وَإِنْ اهْتَدَيْتُ فَمَا يُؤْتِي إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ - (۳۴) - ان سے کہہ دو کہ میں اگر کبھی غلطی کر جاتا ہوں تو غلطی میری ہی دوسری ہوتی ہے اور جب میں صیح راستہ پر ہوتا ہوں تو وہ اس وحی کی بنا پر جو میرا رب

غلطی کا امکان

میری طرف بھیجتا ہے وہ سب کچھ سننے والا اور ہر ایک قریب جو کچھ وحی کی رو سے طے ہوتا تھا اس میں نہ رسول اللہ کو کسی قسم کا اختیار ہوتا تھا اور نہ جماعتِ مومنین کو۔ لیکن جو امور ذاتی رائے پر چھوڑ دیئے جاتے تھے ان میں لوگوں کو ایسی آزادی رہی اور حریتِ فکر و عمل حاصل تھی جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اسی آزادی نے نیکو آراء کا نتیجہ تھا کہ ایک عام عورت تک اپنے معاملہ میں حضور کے ساتھ پوری جرأت کے ساتھ جھگڑ سکتی تھی، ایسی جرأت جس کی شہادت خود

اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دی کہ قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ تَحَاوَرَكُمَا - إِنَّ اللَّهَ

آزادی منکر

سَمِيعٌ كَصِيبٍ - (۵۸) - اللہ نے اس عورت کی بات کو سن لیا جو تمہارے (اے رسول) اپنے خاوند کے پاس میں جھگڑتی تھی اور اللہ کے حضور شکایت کرتی تھی۔ وہ تم دونوں کی گفتگو کو سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور جب آپ اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید سے کہا کہ آمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳) اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ، اسے طلاق مت دے، تو انہوں نے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور بیوی کو طلاق دے دی۔ اس سے نہ مشورہ دینے والے کے دل میں کوئی ملال پیدا ہوا نہ مشورہ سے انکار کر دینے والے کے دل میں کسی قسم کا خیال۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور کا مشن ہی یہ تھا کہ فروعِ انسان کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے سوا ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے نجات دلائی جائے۔ وَ لَيَضَعَنَّ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ - (۲۴۵) - اس رسول کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ یہ انسانوں کے سر سے وہ بوجھ آوار دے جس میں وہ دبے ہوئے تھے اور انہیں ان زنجیروں سے آزاد کرادے جن میں وہ جکڑے چلے آ رہے ہیں۔ تیس سال کی مسلسل جدوجہد سے آپ نے وہ فضا پیدا کر دی جس میں ہر انسان پوری طرح آزادی کا سانس لے رہا تھا اور علی وجہ البصیرت محسوس کرتا تھا کہ وہ سوائے قوانینِ خداوندی کے کسی کا محکوم اور غلام نہیں۔ اس طرح یہ حقیقت ہر ایک کے سامنے اُبھر کر آگئی کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ - وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّاءَ بَيْنَ يَدَيْهِمْ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ وَيَسْتَحْسِنُونَ تَذَرُونَ

کسی انسان کو اس کا خلیہ نہیں کہ خدا اسے کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکم بن جاؤ۔ (اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم اس کتابِ خداوندی کی رو سے جس کی تم تعلیم دیتے ہو اور جس کے مطالب کو تم اپنے دلوں میں نقش کرتے ہو، اپنے رب کے بندے بن جاؤ۔ اسی حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے آپ بار بار اس کا اعلان فرماتے تھے کہ (قُلْ) اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ اِلَيَّ (۱۸) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں فرق یہ ہے کہ میری طرف خدا کی جانب سے وحی آتی ہے اور میں خود اس وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ (۱۹)۔

بشریت

اس طرح رفتہ رفتہ دین کی تکمیل ہو گئی اور خدا نے اعلان کر دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَ وَعْدًا لَا يَأْتِي بِكَلِمَةٍ اَوْ يَكْمِلُهَا اَوْ يَجْزِيهَا اَوْ يَجْزِيهَا اَوْ يَكْمِلُهَا اَوْ يَجْزِيهَا (۲۰)۔ اور تیرے رب کی باتیں صدق و وعدہ کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب انہیں کوئی بدلنے والا نہیں اور وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ خدا کی یہ باتیں جو اس نے نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے دینی تھیں قرآنِ کریم میں جمع ہو گئیں جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۲۱) یقیناً ہم نے اس ضابطہ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہمیں اس کے محافظ ہیں۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ قانونِ فطرت کے مطابق آپ کی حیاتِ طبعی بھی ایک دن ختم ہو جانے والی ہے۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاَنْتُمْ مَّيِّتُونَ (۲۲) اور جماعتِ مومنین سے کہہ دیا کہ حضورؐ کی وفات سے اس نظام میں قطعاً کوئی فرق نہیں آسکتا جسے آپؐ نے وحیِ خداوندی کی روشنی میں

حضور کے بعد

تشکیل فرمایا ہے۔ یاد رکھو وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ۔ محمدؐ بجز اس نیست کہ خدا کے ایک پیغمبر ہیں۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ آپؐ سے پہلے بھی خدا کے کئی رسول آئے اور گزر گئے۔ اَخٰیْنُ مَاتَ اَوْ قُتِلَ اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ۔ سو اگر وہ مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم ریمہ بھڑک کر یہ سلسلہ صرف آپؐ کی ذات تک محدود تھا) اپنے پچھلے نظام کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ وَمَنْ يَّقْلِبْ عَلٰی عَقْبَيْهِ فَلَنُيَصِّرَنَّ اللّٰهُ شَيْئًا۔ (۲۳) جو تم میں سے اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

رسول کا فریضہ یہ تھا کہ يٰۤاَمْرُؤُھُمَا بِالسَّمْعٰوٰتِ وَبِالنَّارِ الْمُنٰوٰرِ۔ (۲۴) وہ لوگوں کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے جنہیں قرآن نے صحیح تسلیم کیا ہے اور ان سے روکتا ہے جنہیں قرآن نے ناپسندیدہ

ٹھہرایا ہے۔ رسول اکرمؐ کے بعد یہی فریضہ تمہارا ہوگا۔ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۳۹) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انہیں منکر سے روکو۔ یہ معروف و منکر اس کتاب کے اندر ہے جس کا تمہیں وارث بنایا جا رہا ہے۔ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا... (۴۰)۔ لیکن اس کے لئے ایک بنیادی شرط ہے اور وہ یہ کہ تمہارے رسولؐ نے یہ کچھ اس لئے کر کے دکھادیا تھا کہ وہ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ۔ (۶۸) اس لئے تمہیں بھی بلند ترین اخلاق کا حامل ہونا ہوگا۔ اس باب میں رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (۳۳)۔ اس کا

علیٰ خلق عظیم (TEST) اور معیار یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہؐ پھرے مجمع میں مخالفین سے کہتے تھے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ (۲۶) میں نے تمہارے اندر اس سے پہلے اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں! اسی طرح تم میں سے بھی جو کوئی اپنے مخالفین کے سامنے سینہ تان کر اس کا دعویٰ کر سکے گا: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ۔ وہی رسول اللہؐ کے نقش قدم پر چلنے والا ہوگا اور اسی قسم کے لوگوں کے ہاتھوں یہ نظام آگے بڑھے گا۔ نبی اکرمؐ کے خلقِ عظیم کا اعتراف صرف آپؐ کے مخاطبین ہی نے نہیں کیا، دنیا کے بڑے بڑے مؤرخین اور مفکرین اس باب میں رطب اللسان ہیں اور (LAMARTINE) کے الفاظ میں باورِ بلند کہتے ہیں کہ

ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ناپا اور پرکھا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد ہمارے اس سوال کا جواب دو کہ — کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی پیدا ہوا ہے؟ (مہراج انسانیت من ۳۶ ایڈیشن ۱۹۶۶ء)

یہ ہیں نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے وہ نمایاں خط و خال جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بیان کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس زریں داستان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن ہم نے اس مقام پر اختصار سے کام لیا ہے۔ یہی حضورؐ کی وہ سیرتِ مقدسہ ہے جس کے حرناً و قریباً سچا ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ذَا الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ (۲)۔ باقی رہے تاریخی واقعات، سوظاہر ہے کہ ان میں وہی

سچے قرار پا سکتے ہیں جو حضور کی سیرتِ قرآنیہ کے مطابق ہوں۔ یہی وہ حسنِ سیرت اور رعنائیِ کردار ہے جس کے پیش نظر، خدا اور اس کے فرشتے اس ذاتِ گرامی پر تبریکِ دہنیت کے پھول برساتے ہیں۔
 اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ يُصَلُّوْنَ عَلٰی النَّبِیِّؐ ۖ یَاٰیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۳۳/۵۶)

صرف حضور پر ہی نہیں بلکہ اس جماعتِ مومنین پر بھی جو حضور کے اتباع میں نظامِ خداوندی کے قیام کا باعث بنتی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ يُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لَیْخْرِجَنَّكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَیَّ النُّوْرِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۔ (۳۳/۴۳)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی فہماریاں

(تقریر بتقریب سعید جشنِ عیدِ میلاد النبیؐ ۱۹۶۳ء)

برادرانِ عزیز! سلام و رحمت!

یہ امر موجبِ ہزار برکات و مسرت ہے کہ ہم آج کی تقریبِ سعید اس ذاتِ اقدس و اعظم کی حسین و شاد یاد میں منارہے ہیں جسے خود خدا تعالیٰ نے رحمتِ تعالین قرار دیا ہے اور جس کے متعلق یہ کہہ کر کہ اِنَّكَ لَعَلٰی خَلَقْتَ عَظِيْمًا اس آفتابِ جہاں تاب کو شرف و تکریم انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر جلوہ بارد کھایا ہے۔ میں اپنی اس خوش بختی اور فیروز مندی پر جس قدر بھی فخر و ناز کروں کم ہے کہ مجھے اس بارگاہِ رسالت مآب میں نذرِ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے جس پر خدا اور اس کے فرشتے تبریک و تہنیت کے پھول برسائے اور نوا میں فطرت جس کی حمد و ستائش کے گیت گاتے ہیں۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی وہ معنی کونین وہ جانِ حسنِ انزل، وہ بہارِ صبحِ وجود

وہ آفتابِ حرم، نازِ نبینِ کینجِ حرا وہ دلِ کافور، وہ اربابِ درد کا مقصود

وہ سرورِ ڈھماں وہ محسنِ عربی!

بروجِ اعظم و پاکش و ردِ لا محدود

عزیزانِ من!

اللہ تعالیٰ نے انسانی راہ نمائی کے لئے تعلیم بھیجی تو اس کے ساتھ اپنے رسولوں کو بھی بھیجا۔ رسول کا کام اتنا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک ڈاکہ کی طرح خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دیتا اور بس۔ اگر مقصود

تہیہ

صرف خدا کی کتاب کو انسانوں تک پہنچا دینا ہوتا تو خدا آسمان سے لکھی لکھائی کتاب کیوں نہ نازل کر دیتا؟ کتاب کے ساتھ رسول کے بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ رسول اس کتاب کی تعلیم کو عملاً جاری کر کے یہ دکھا دے کہ وہ تعلیم محض نظری حقائق کا مجموعہ یا ناممکن العمل اصولوں کا مرقع نہیں۔ وہ ایک ایسا قالب ہے جس میں انسانی معاشرہ ڈھلتا ہے۔ خدا کی طرف سے یہ راہ نمائی اپنی آخری اور مکمل شکل میں حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے قرآن کریم میں دی گئی۔ آپؐ نے اس آسمانی تعلیم کے مطابق ایک مملکت قائم کی جس نے دنیا کو دکھا دیا کہ جب انسانی معاشرہ کی تشکیل وحی کی روشنی میں کی جاتی ہے تو وہ کس طرح نوری انسان کے لئے صدر ہزار بركات و سعادت کا موجب بن جاتا ہے، لیکن اس مملکت کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ اس کا سربراہ خود اپنی سیرت و کردار کو قرآن کے قالب میں ڈھالے۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ اپنی سیرت کو قرآن کے پیکر میں ڈھالتا ہے اور مملکت اس کے حسن سیرت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے جس مملکت کی بنیاد حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں نے رکھی اور جسے آپؐ کے سچے جانشینوں نے پروان چڑھایا، ظاہر ہے کہ اس کے متعدد گوشے تھے اور ان گوشوں میں سے ہر ایک میں اس مملکت کے سربراہ کی سیرت جھل جھل کرتی نظر آتی تھی۔ یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ میں اس مملکت کے تمام گوشوں کو ایک نشست میں آپ کے سامنے لاسکوں۔ اس لئے میں اس وقت اس کے صرف ایک گوشے کی نقاب کشائی کروں گا۔ اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ اس مملکت کے سربراہوں، یعنی نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے سچے جانشینوں کی عملی مثال نے اس گوشے کو کس طرح تاریخ انسانیت کا درخشندہ باب بنا دیا تھا اور آنے والوں کو بتا دیا تھا کہ جس مملکت کو نوری انسان کے لئے آئینہ رحمت بننا ہو اس کے سربراہ کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہیئے۔ واللہ المستعان علیہ توفیلت والیہ انیب۔

عصر حاضر کا ایک ماہر سیاسیات پروفیسر مینکن (H.J. MENCKEN) دنیا کی سیاسی تاریخ کا

جائزہ لینے کے بعد بصد حسرت و یاس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

انسانی عجز کا اعتراف

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی طرح حکومت کہا جاسکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جوفی الواقعہ غیر العقول ہیں اور بہت

سی ایسی جو بڑی جرأت آزما ہیں۔ لیکن جب ان کے عملی نفاذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پیسہ کے خادم ہیں۔ لیکن جب حکومت کو عملاً قائم کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد عوام کی خدمت کے بجائے انہیں ٹوٹنا کھٹونا ہوتا ہے۔

(TREATISE ON RIGHT AND WRONG)

اس مؤرخ نے بے شک اقوامِ عالم کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن نظر آتا ہے کہ تاریخ کا ایک باب یا تو اس کی نگاہوں سے اوجھل رہا اور یا اس نے اسے عملاً نظر انداز کر دیا۔ اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ باب ایک بغیر جانبدار مؤرخ کے سامنے آئے اور وہ اس نظامِ حکومت کی کامیابی کا تذکرہ نہ کرے جس کی رو سے دنیا نے دیکھ لیا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جاسکتا ہے جس میں حکومت کا فریضہ، عوام کے خدام کی حیثیت سے ان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہو اور یہ فریضہ محض نظری طور پر اس کے سامنے نہ ہو۔ بلکہ وہ حکومت اسے عملاً پورا کر کے دکھا دے۔ یہ نظام قائم ہوا تھا، آج سے قریب چودہ سو سال پہلے محمد رسول اللہ والذین معہ کے انسانیت ساز ہاتھوں سے جس سے

ایک استثناء

دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ انسان اگر وحی کی راہ نمائی میں اپنا معاشرہ متشکل کر لے تو کس طرح اس کی ناکامیاں، کامیابیوں میں بدل جاتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، اس نظام کے متعدد گوشے ہیں جن میں سے ہر گوشہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ جو حکومت مستقیلاً اقدار کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، اس کا ہر قدم کس طرح تعمیرِ انسانیت کے لئے اٹھتا ہے۔ لیکن چونکہ پروفیسر مینکن نے ان میں سے سب سے زیادہ اہمیت اس گوشے کو دی ہے جس کا تعلق عوام کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے سے ہے، اس لئے میں آج کی تقریب سعید پر اسی گوشے کی ایک ہلکی سی جھلک آپ احباب کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آ جائے گی کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے وہ کس طرح اپنی زندگی کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی حکومت بھی عمدہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی جب تک اس کے سربراہ ان اصولوں پر خود عمل کر کے نہ دکھائیں جنہیں اس حکومت کی اساس قرار دیا جاتا ہو۔

اسلامی حکومت کا بنیادی اصول

اسلامی مملکت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (ہلال)۔ جوئے زمین

پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ اسلامی حکومت جو خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔ اس لئے وہ افراد مملکت سے اعلانیہ کہتی ہے کہ تَحْتَ نَزْدِكُمْ وَإِيَّاكُمْ نَبِّ (۶۶) ہم تمہاری ضروریات زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔ وہ ان میں سے ہر فرد کو اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ إِنَّ ذَلِكَ لَآتٍ جُوعًا يَبِئْهَا وَلَا تَعْرَىٰ۔ وَأَنْتَ لَا تَخْلَعُ غُؤًا فِيْهَا وَلَا تَضْحَىٰ۔ (۲۰) ہم ایسا جتنی معاشرہ منسلک کریں گے جس میں تمہیں نہ بھوک کی پریشانی ہوگی نہ لباس کی و نہ پیاس کی تکلیف ہوگی، نہ سردی گرمی سے بچنے کی۔ اس میں روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ تمام افراد کو میسر ہوگا۔ اس کی ذمہ داری ہمارے سر پر ہوگی۔

آپ غور کیجئے کہ غنی عظیم ذمہ داری ہے جسے یہ مملکت اپنے سر پر لیتی ہے۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ اس گرانبار ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس مملکت کا سربراہ، اپنی زندگی کس قسم کی بسر کرتا ہے۔ اس مملکت کے سب سے پہلے سربراہ خود نبی اکرم تھے۔ آپ کی حیات طیبہ کے دو حصے ہیں: ایک مکئی زندگی دوسری مدنی زندگی۔ مکہ کی زندگی میں یہ مملکت قائم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن حضور اس جماعت کی تشکیل و تربیت میں مصروف تھے جس کی رفاقت سے یہ مملکت قائم ہوئی تھی۔ عام طور پر یہ

حضور کی مکئی زندگی

سمجھا جاتا ہے کہ آپ کی مکئی زندگی بڑی عسرت اور تنگدستی کی تھی لیکن یہ درست نہیں۔ قرآن کریم حضور کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ وَقَدْ جَدَلْنَا عَائِلًا خَائِفًا غَنِيًّا۔ (۹۳) ”ہم نے تجھے تنگدست پایا تو غنی کر دیا۔“ اس سے ظاہر ہے کہ حضور کی وہ زندگی ایک غنی کی زندگی تھی۔ یعنی ایسی زندگی جس میں آپ کو اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑتا تھا۔ لیکن وہاں جماعت کے افراد کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں اس وقت حضور کا اسلوب زیست کیا تھا اس کا اندازہ صحیحین کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا خضوارہ جاتا، یا ایسے کے ہاں بال بچوں پر ویسے فاقہ کی نوبت آجاتی

تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں حضورؐ اور جماعتِ مومنین کا اندازِ زیست ایسا تھا کہ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو سب اکٹھا کر لیتے اور پھر اس میں سے حصہ رسد کی کھا لیتے۔ چونکہ اس وقت جماعت میں اکثریت محتاجوں اور ناداروں کی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ اس مساواتی تقسیم میں ہر ایک کے حصے میں کس قدر آتا ہوگا۔ جو کچھ دوسروں کے حصے میں آتا ہوگا وہی حضورؐ کے حصے میں آتا ہوگا، بلکہ اس سے بھی کم۔ اس لئے کہ قرآن نے مومنین کا اندازِ زیست یہ بھی تو بتایا ہے کہ یُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَقَدْ كَانَتْ بِهِمْ حَصَاصَةٌ (۵۹) وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خودنگی ہی میں گزار کر ناپڑے۔

مدنی زندگی حضورؐ کی مدنی زندگی میں ایک مملکت وجود میں آگئی تھی۔ آپؐ، قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ تھے۔ مولانا شبلی کے الفاظ میں :-

یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عرب، حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا اور مدینہ کی سرزمین میں زروسیم کا سیلاب آچکا تھا۔ سیرۃ النبیؐ، جلد اول، ۵۲-۳۲۹

لیکن اس کے باوجود آپؐ نے جس انداز کی زندگی بسر کی، اس کے متعلق کتب تاریخ دسیر میں ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ کا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جڑا ہوتا تھا اور وہا نہیں پہنا تھا جو تہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگنے ہوئے تھے۔ گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو اکثر آپؐ اور سارا گھر بھوکا رہتا تھا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مدینہ کے قیام سے وفات تک آپؐ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ (ایضاً)

اس پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس قدر وسیع علاقہ آپؐ کے زیرِ نگیں تھا، اتنی بڑی سلطنت کے آپؐ سربراہ تھے، مدینہ میں زروسیم کا سیلاب آچکا تھا، تو پھر آپؐ عسرت کی زندگی کیوں؟ اس قدر عسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے۔ اس کا جواب بالعموم یہ دیا جاتا ہے کہ خدا نے حضورؐ کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا تھا۔ آپؐ نے آخرت کو ترجیح دی اور

سب کچھ میسر ہونے کے باوجود آپؐ نے نہایت تنگدستی اور عسرت کی زندگی بسر فرمائی۔ لیکن یہ توجہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ دنیاوی آسائش و لذائذ کو قابلِ نفرت سمجھ کر ترک کر دینا، رہبانیت ہے جسے قرآن، عیسائی راہبوں کا خود ساختہ مسلک قرار دیتا ہے۔ جب کہتا ہے کہ وَرَهْبَانِيَّةٍ ابْتَدَعُوا مَا كَتَبَ لَهَا عَلَيْهِمْ سَمًّا (۵۷) ”اس مسلک رہبانیت کو انہوں نے خود وضع کر لیا تھا۔ اسے ہم نے ان پر واجب نہیں ٹھہرایا تھا۔“ اس کے برعکس قرآن دنیاوی آرائش و زیبائش کی چیزوں کو حرجِ جاذبت قرار دیتا ہے اور پوری تمدنی سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالْقَنَاطِثَ مِنِّ الرِّزْقِ (۳۳) ”ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیتا ہے۔ اور نبی اکرمؐ سے تو خاص طور پر کہا گیا کہ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تَحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ..... (۶۶) اے نبی! جس چیز کو خدا نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اسے کیوں حرام کرتا ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ نبی اکرمؐ اس لئے تنگدستی اور عسرت کی زندگی بسر نہیں کرتے تھے کہ آپؐ نے دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزوں کو قابلِ نفرت قرار دے کر ترک کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مملکت کے وجود میں آ جانے سے حضورؐ کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ ملک میں خوشحال لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ باقی سب مفلوک الحال، ضرورت مند، مفلس اور نادار تھے جن کی کفالت مملکت کے ذمہ تھی۔ ناداری کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لئے سواری تک نہیں ہوتی تھی اور مملکت کے ذرائع اس قدر محدود تھے کہ ان کے لئے سواری کا انتظام کرنا، اس کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ یہی وہ حالت تھی جس کا نقشہ سورہ توبہ میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ

اکثریت غریبوں کی تھی

وَلَا عَلَى السَّيِّئِينَ إِذَا مَا آتَوْا لِيُخْصِلَهُمْ قُلْتُ لَا أَحِبُّهُمَا مَا أَحْبَبْتُكُمْ عَلَيْهِ
تَوَكَّدُوا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضٌ مِّنَ الدِّمَاجِ خَرْنَا إِلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ — (۹۲)

نہ ہی ان لوگوں پر جہاد میں عدم شرکت کی وجہ سے کوئی الزام ہے جن کی حالت ہے کہ وہ تیرے پاس درخت لے کر آئے کہ ان کے پاس سواریاں نہیں۔ تم سواری کا کچھ انتظام کر دو، تو تم نے کہا کہ سواری کا تو میرے پاس بھی کوئی انتظام نہیں۔ چنانچہ وہ بصد حسرت و یاس واپس چلے گئے، اس حالت میں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور دل اس غم میں ڈوبا جا رہا تھا کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں جس سے ہم

سواری کا انتظام کر لیتے اور جہاد میں شریک ہو سکتے۔

یہ بھی افرادِ مملکت کی عام حالت، ان حالات میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس مملکت کے سربراہ کو جس کی ذمہ داریوں کا وہ عالم ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، کس قسم کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ دنیا کی عام مملکتوں میں رئیسِ مملکت یا دیگر اربابِ حکومت کے اخراجات کے لئے سب سے پہلے روپیہ الگ کر لیا جاتا ہے اور جو باقی بچتا ہے اس میں سے دیگر مذاات پر صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت میں صورت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس میں سربراہِ مملکت اپنی ضروریات کو سب سے مؤخر رکھتا ہے۔ وہ اس وقت کھاتا ہے جب سب کھا چکے ہیں۔ وہ اس وقت پہنتا ہے جب سب پہن چکے ہیں۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ

سربراہ سب سے پیچھے

حضورؐ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔ (ابوداؤد، کتاب الخراج)

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے:-

حضورؐ نے فرمایا کہ جو اہم ضرورت مندوں، محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔ (ترمذی، کتاب الاحکام)

اسی تفصیل کو حضورؐ نے چند الفاظ میں سٹما کر یوں بیان فرمادیا:-

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا فائدہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ کسی فرد کو محسوس تک نہ ہونے دے کہ

کوئی فرد تنہا نہ رہے پائے

وہ تنہا یا لا وارث ہے۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو، اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔

(ترمذی، باب الفرائض)

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں وفات پا جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو، تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے

ذمہ ہوگی حضورؐ نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ

میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سوال میں سے جو مقروض وفات پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے فرائض سے ہے۔ (ابو عبیدہ، کتاب الاموال)

مقروض کا قرض بھی مملکت ادا کرے گی اور اگر وہ اپنے اہل و عیال کو بے سہارا چھوڑ جائے گا تو ان کی ذمہ داری بھی مملکت کے سر پر ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص کچھ ترکہ چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھروالوں کے لئے ہے، لیکن جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری میرے سر پر ہوگی۔ (ترمذی، باب الفرائض)

مملکت کی یہ ذمہ داریاں صرف انسانوں تک محدود نہیں۔ چونکہ قرآن نے کہا ہے کہ ”زمین پر کوئی ذمی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو“ اس لئے اسلامی مملکت کے حدود میں رہنے والے ہر متنفّس کے رزق کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے — جو اسلامی مملکت کے تیسرے سربراہ اور حضورؐ کے جانشین تھے —

ہر متنفّس کے رزق کی ذمہ داری فرمایا تھا کہ

اگر درجہ کے کنارے کوئی گنا بھی جھوک سے مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

(توفیق الرحمان، مطبوعہ مصر)

اس مملکت کی ذمہ داری کی انتہا وہ تھی جسے حضرت عمرؓ نے اُن الفاظ میں بیان کر دیا جن سے زیادہ جامع

الفاظ اس باب میں کہیں نہیں مل سکتے۔ آپ نے ایک خطبہ عام میں فرمایا:۔

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری

ایک جامع حقیقت

دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔ (قواعد الاحکام فی مصالح الانام، ابو محمد عز الدین)

یہ بات طبری بلند اور لطیف ہے اس لئے ذرا وضاحت طلب ہے۔ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کسی فرد کی کوئی ضرورت رُک نہ رہے تاکہ اسے اپنی اس ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرنی نہ پڑے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی کوئی ضرورت رُک نہ رہے گی تو اسے اپنی ضرورت کے لئے خدا کو پکارنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بالفاظِ دیگر اگر کسی شخص کو اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے کچھ مانگنے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ گویا مملکت کے خلاف شکایت ہوگی کہ وہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے تاصرہ لگئی ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل میں طبری

میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ

تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں ہوں اور میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی نہیں۔
اللہ نے میرے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ میں اس کے حضور جانے والی دعاؤں کو روکوں۔ لہذا تم
لوگ اپنی شکایتیں میرے پاس بھیجو۔ جو خود ایسا نہ کر سکے وہ کسی دوسرے آدمی تک اپنی بات پہنچا دے
تاکہ وہ اسے مجھ تک پہنچا دے۔ اس کی شکایت پہنچنے پر ہم اس کا حق بغیر کسی تامل و تذبذب کے
وصول کرا دیں گے۔ (طبری، حوادث ۱۲۷ھ)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی مملکت کا رقبہ ساڑھے ۲۲ لاکھ مربع میل پر پھیل چکا تھا اور ایک عراق کی
مال گزاری ساڑھے گیارہ کروڑ درہم تھی۔ لیکن اسی نسبت سے افرادِ مملکت کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور
مملکت کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ انہی ذمہ داریوں کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ سے ایک دن کسی نے پوچھا کہ
مملکت کی آمدنی میں سے آپ کے لئے کس قدر لینا جائز ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ

پکڑوں کے دو جوڑے، ایک جاڑے کا دوسرا گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے
خلیفہ کا حصہ لئے ایک احرام اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا
کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے، نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں
کا ایک فرد ہوں، جو ان کا حال سو میرا حال۔ (عمر فاروق، از محمد حسینی بیگلر)
وہ فرمایا کرتے تھے کہ

اللہ کا مال میرے لئے ایسا ہے جیسے کسی یتیم کا مال۔ ضرورت نہیں ہوتی تو اسے ہاتھ نہیں لگانا اور
حاجتمند ہوتا ہوں تو بقدر احتیاج لے لیتا ہوں۔ (ایضاً)

اس مقام پر میں اس حقیقت کو پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ یہ دو جوڑے کپڑے اور
ترک دنیا نہیں روکھا سوکھا کھانا اس لئے نہیں تھا کہ آپ ایک تارک الدنیا زاہد کی زندگی بسر کرنا
چاہتے تھے۔ اس قسم کے زہد و توہم کے متعلق تو ان کا ردِ عمل یہ تھا کہ

ایک دن انہوں نے کسی زاہد متراض کو دیکھا۔ اس کے پاس گئے اور ایک درہ مار کر بولے: "خدا
تجھے موت دے، ہمارے دین کا کیوں گلا گھونٹتا ہے۔" (ایضاً)

اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنا اصول یہ بنالیا تھا کہ مملکت کا سربراہ اپنا معیار زندگی ایسا رکھے جو امت کے

ہر فرد کو میسر آسکتا ہو۔ جوں جوں اُمّت کے عام معیار کی سطح بلند ہوتی جائے سربراہ مملکت کا معیار بھی اونچا ہوتا چلا جائے۔ چنانچہ تاریخ میں ہمیں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک دفعہ مصر کا گورنر آیا تو حضرت عمرؓ نے کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کھانے میں جو کی روٹی ہے۔

اس نے کہا کہ اب تو مصر سے کافی مقدار

جو کی روٹی کیوں؟

میں گیہوں آ رہا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے فرمایا کہ اس کا مجھے یقین ہے کہ اس وقت مملکت میں ہر فرد کو جو کی روٹی میسر آ رہی ہے۔ جس دن آپ مجھے اس کا یقین دلا دیں گے کہ ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے اس دن میں بھی گیہوں کی روٹی کھاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مملکت میں ایک فرد بھی ایسا ہو جسے گیہوں کی روٹی میسر نہ آتی ہو اور سربراہ مملکت گیہوں کی روٹی کھائے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ آپ اس قدر عسرت کی زندگی بسر کر کے اپنے آپ کو مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں تو آپ نے اس کا جو جواب دیا وہ ایک اسلامی مملکت کے سربراہ کے احساسِ ذمہ داری کا صحیح آئینہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

میں رعایا کی دیکھ بھال کیسے کر سکتا ہوں جب تک مجھ پر وہی کچھ نہ بیتے جو رعایا پر بنتی ہے۔

(ہیکل)

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب ملک میں قحط پڑا تو ارد گرد کی تمام آبادی قحط کے زمانے میں ہجوم کر کے مدینہ میں جمع ہو گئی۔ آپ نے سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ مدینہ میں کسی کے گھر میں الگ الگ کھانا نہیں پکے گا۔ سب کچھ شہر سے باہر ایک جگہ جمع ہو گا اور اسے سب مل کر بانٹ کھائیں گے۔ چنانچہ خود رئیس مملکت حضرت عمرؓ بھی سب کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانے میں شریک ہوتے تھے۔ ایک دن آپ کے سامنے گھی میں چوری ہوئی روٹی آئی ایک بدوی آپ کے ساتھ شریکِ طعام تھا جس طرف گھی زیادہ تھا وہ بدوی اس طرف سے بڑے بڑے لقمے مارنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی گھی نہیں کھایا۔ اس نے کہا ہاں! میں نے فلاں دن سے آج تک گھی پانیل نہیں چکھا اور ایک میں ہی کیا کسی کو بھی یہ کچھ میسر نہیں آیا۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت قسم کھائی کہ جب تک لوگ قحط میں مبتلا ہیں وہ گوشت اور گھی کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔

چنانچہ انہوں نے گوشت اور گھی جو ان کی معمول کی غذا تھی چھوڑ دیئے اس سے ان کی صحت پر سخت مضر اثر پڑا۔

رنگت سیاہ پڑ گئی۔ پیٹ میں شکایت پیدا ہو گئی۔ لیکن انہوں نے گوشت اور گھی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پاس بیٹھنے والے اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ لوگوں کو خشک روٹی تک میسر نہیں آتی۔ اور تم کہتے ہو کہ عمر گھی اور گوشت کھائے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے آپ کی یہ حالت دیکھی تھی وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ اس قحط کو دور نہ کر دیتا تو ہمیں اندیشہ تھا کہ حضرت عمرؓ لوگوں کے غم میں جان دے دیتے۔

اسی قحط کا ذکر ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کا پوتا گکڑی یا خر بوزہ کھا رہا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ یہ کیا ہے کہ لوگوں کے بچوں کو سوکھی روٹی نہیں ملتی اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے۔ یہ اسے کیسے مل گیا۔ بیٹے نے کہا کہ صبح تمام بچوں کو کھجور کے ستوناشتے میں ملے تھے اس نے اپنے حصے کے ستونا ایک بڑوٹکے کو دے کر اس کے بدلے میں گکڑی لے لی ہے۔ یہ ہے وہ پھل جو حضرت عمرؓ کا پوتا کھا رہا ہے۔ اسے دوسرے بچوں کے مقابلے میں کچھ بھی زیادہ نہیں ملتا۔ آپ مطمئن رہ گئے۔

یہ تو پھر بھی قحط کا زمانہ تھا۔ ان کے لئے نئی نئی فتوحات کی خبریں بھی محض

خلافت سے مفہوم

اس لئے مسرت کا باعث ہوتی تھیں کہ اس سے لوگوں کا معیار زندگی اور بلند ہو

جائے گا۔ چنانچہ قادیسیہ کی فتح کی خوشخبری سننے کے بعد آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں کہا کہ

مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کسی کو ضرورت مند دیکھوں اس کی ضرورت پوری کر دوں۔ جب تک ایک دوسرے کی (الفرادی طور پر) مدد کرنے سے ایسا ہو سکے ہمیں ایسا کرنا چاہیئے۔ جب معاملہ اس سے آگے بڑھ جائے تو ہمیں سب کو مل کر گزارا دنا کرنا چاہیئے، یہاں تک کہ سب کا معیار زندگی ایک جیسا ہو جائے۔ کاش! تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کس قدر خیال ہے۔ لیکن یہ چیز میرے زبانی سمجھانے کی نہیں، عمل سے کر کے دکھانے کی ہے۔ خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں کہ تم لوگوں کو اپنا محکوم اور غلام بنا کر رکھوں۔ میں تو خود خدا کا محکوم اور غلام ہوں۔ حکمرانی کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اسے اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھ لوں بلکہ تمہاری چیز تمہاری طرف لوٹا دوں اور تمہارے پیچھے تمہاری خدمت کے لئے چلوں، یہاں تک کہ تم اپنے اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھاپی سکو تو یہ وہ سعادت ہوگی جو تمہارے ذریعہ مجھے میسر آ جائے گی۔ لیکن اگر میں اس امانت کو اپنالوں

اور تمہیں اپنے پیچھے چلنے اور اپنے گھر پر آنے کے لئے مجبور کر دوں تو یہ وہ بد بختی ہوگی جو تمہارے ذریعہ میرے سر پر مسلط ہو جائے گی۔ (خدا مجھے اس سے محفوظ رکھے)۔

”مملکت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ سب کا معیارِ زیست ایک ہو جائے۔“ یہ تھا وہ نصب العین جو ان حضرات کے سامنے رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں دیکھتے کہ افسر اور ماتحت کے معیار میں فرق آنے لگا ہے اس کا فوراً

تدارک کر دیتے۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب عراق کے **سب کا معیار ایک** بعض جاگیرداروں نے حضرت ابو عبیدہ سے صلح کی تو اس خوشی میں طرح طرح کے لذیذ اور پُر تکلف ایرانی کھانے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت ابو عبیدہ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمام لشکر کے لئے ایسے ہی کھانوں کا انتظام کیا گیا ہے یا یہ امیرِ لشکر کی خصوصی دعوت ہے۔ جب انہوں نے کہا کہ یہ صرف آپ کے لئے ہیں تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا اور ان سے کہا کہ جب تک سارے لشکر کے لئے اسی قسم کے کھانے کا انتظام نہیں ہوگا میں اسے کبھی نہیں کھاؤں گا۔

اسلامی مملکت کے سربراہ کی ان ذمہ داریوں کو سامنے رکھیے اور پھر اس حقیقت پر غور کیجئے کہ نبی اکرمؐ اس قدر فقر و فاقے اور عسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے۔ بات نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ عوام کا معیارِ زیست بہت پست تھا۔ ان کی ضروریات زیادہ اور سامانِ رزق نسبتاً کم جب تک ان کی ضروریات پوری نہ ہو جاتیں حضورؐ کس طرح مرفہ الحالی کی زندگی بسر **ضرورت کے زائد سب کچھ دے دے** کر سکتے تھے۔ اس وقت تو ضروریات کا تقاضا یہ تھا کہ

ہر شخص کم از کم اپنے پاس رکھے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ اور یہ قرآنِ کریم کے اس ارشاد کے عین مطابق ہے کہ **يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْغَفْوَةُ** (۳۱۹) ”تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے وہ سب ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔“

یہ روایت اسی ارشادِ خداوندی کی عملی تفسیر ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور

وائس ہائیں دیکھنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو کو دے دے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔

مسلم کی ایک اور روایت ہے:-

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ، میرا مال، میرا مال کہتا رہتا ہے، حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ (۱) جو کچھ وہ کھا کر مفہم کر لیتا ہے۔ (۲) جسے وہ پہن کر پُرانا کر دیتا ہے۔ اور (۳) جو کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرہ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے یا دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جو مال و دولت جمع کرنے کو سختی سے روکا ہے تو یہ اصول اسلامی مملکت کے نظام میں کس طرح فِٹ بیٹھتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:-

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُوا
نَسَافًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹۴)

جو لوگ چاندی، سونا (مال و دولت) جمع کر کے رکھتے ہیں اور

مال و دولت جمع نہیں کئے جاسکتے

اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں (ضرورت مندوں کی ضروریات رفع کرنے کے لئے) کھلا نہیں رکھتے تو انہیں الم انگیز عذاب سے آگاہ کر دے۔

اسلامی مملکت میں:-

- ۱۔ تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔
- ۲۔ مملکت کا یہ فریضہ اس طرح پورا ہوتا ہے کہ ہر فرد کا سب (یعنی جو کمانے کے قابل ہو) پوری پوری محنت سے کمائے اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر باقی مملکت کے لئے کھلا چھوڑ دے تاکہ وہ اُسے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے کام میں لائے۔
- ۳۔ اس اصول پر سب سے پہلے خود رئیسِ مملکت کا رہنا ہوتا ہے اور اس کا طرزِ عمل دوسروں کے لئے

نمونہ بنتا ہے۔

ان ضروریات کا تعین کس طرح ہوتا ہے اس کا اندازہ حضرت ابوبکر صدیق کے ایک واقعہ سے لگائیے۔ ایک دن آپ نے کھانے کے بعد بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز ہو تو دیکھئے۔ اس نے کہا کہ بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز شامل نہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی ہفتہ عشرہ کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ تھوڑا سا حلوہ بھی ہے۔ آپ نے بیوی سے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ راشن میں میٹھی چیز نہیں آتی یہ حلوہ کیسے پک گیا؟ اس نے کہا کہ میں ان دنوں میٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ جب وہ کافی ہو گیا تو اس کے عوض بازار سے کھجور کا شیرہ منگا لیا اور حلوہ پکا لیا۔ آپ کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے بیت المال میں گئے اور راشن بانٹنے والے سے کہا کہ ہمارے ہاں جس قدر روزانہ آتا جاتا ہے اس میں ایک میٹھی کی کمی کر دی جائے، کیونکہ تجربے نے بتایا ہے کہ آٹے کی موجودہ مقدار ہماری روزانہ ضرورت سے بقدر ایک میٹھی کے زیادہ ہے۔

ہمیں یہ باتیں آج افسانہ سی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ افسانے نہیں حقیقتیں ہیں۔ جو شخص متارع ملت کو امانت سمجھے اور اپنے آپ کو اس کا امین اور اس کا ایمان ہو کہ اسے اس امانت کے ایک ایک ذرے کا حساب دینا ہوگا، وہ اپنی ضروریات کے تعین میں ایسا ہی محتاط ہوگا۔ اسی احتیاط کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت بیٹے سے کہا تھا کہ معلوم نہیں کہ میں نے قوم کے مال میں سے جس قدر اپنی ضروریات کے لئے لیا ہے، اتنا قوم کا کام کر سکا ہوں یا نہیں؟ بہتر یہی ہے کہ تم حساب کر کے اتنا روپیہ قرض لے کر بیت المال میں داخل کر دو تاکہ میں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر خدا کے حضور جاؤں۔ چنانچہ ایسا کر دیا گیا۔

اسی سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب اصول یہ بھڑا حضورؐ کا ترکہ کہ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زیادہ اپنے پاس رکھ نہیں سکتا تو ایسے معاشرہ میں جائیدادیں کھڑی کرنے اور انہیں ترکہ میں چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسی لئے حضورؐ نے واضح الفاظ میں فرما دیا تھا کہ

میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بھی بچے صدقہ ہوگا۔ (بخاری)

اسی سلسلہ کی اگلی کڑی وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مرض الموت کے ایام میں حضورؐ کے پاس سات دینار تھے اور حضورؐ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو۔ لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپؐ کی تیارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا، وہ دینار لے آؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا جبکہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا۔

مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آنحضرتؐ نے درہم چھوڑا نہ دینا نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔ اسی طرح بخاریؒ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ غلام نہ لونڈی نہ کوئی اور چیز سوائے ایک حجر کے اور اپنے ہتھیار کے اور اس زمین کے جسے آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔ مولانا شبلی نے سیرۃ النبیؐ میں ”مترکات“ کے عنوان کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے۔ آنحضرتؐ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات اور جائیداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپؐ اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو مرنے کے بعد چھوڑ جائے۔ اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے کہ لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَاتٍ۔ ہمارا کوئی وارث نہیں جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔

”صدقہ“ کا لفظ ہمارے ہاں تو خیرات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے (جب دین صدقہ کے معنی) اجتماعی نظام کے بجائے انفرادی رہ جائے۔ جسے مذہب کہتے ہیں۔ تو اس میں ”خیرات“ سے بند کوئی تصور ہو نہیں سکتا۔ لیکن دین میں اس اصطلاح سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ شے کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہے بلکہ ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ ہم نے بخاریؒ کی روایت میں (اوپر) دیکھا ہے کہ حضورؐ کے پاس وفات کے وقت کچھ زمین بھی تھی جس کے متعلق آپؐ

نے فرمادیا کہ وہ بھی صدقہ ہے۔ قرآنی نظام میں زمین کی یہی پوزیشن ہوتی ہے۔ جن چیزوں پر نوع انسانی کی زندگی کا بنیادی طور پر دار و مدار ہے، وہ اللہ کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا ہوتی ہیں۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی، وغیرہ، ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

زمین کی پوزیشن

یہی پوزیشن زمین کی ہے۔ یہ تمام نوع انسان کی پرورش کا ذریعہ ہے اور خدا کی طرف سے مفت ملی ہے۔ وَالْأَرْضُ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (۵۵) ”اور ہم نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔“ اس لئے اسے سَوَاءٌ لِّسَائِلِیْنِ۔ (۴۱) رہنا چاہیئے، یعنی تمام ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوئی ہے۔ (AVAILABLE) حضور نے دین کا جو نظام قائم کیا تھا اور جس کی عمل تکمیل رفتہ رفتہ حضور کے سچے شاگرد

کے دور میں ہوئی تھی اس میں رزق کے اس اولین سرچشمہ کی یہی پوزیشن تھی۔ ”زمینداری“ کا رواج دنیا میں بہت قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ یعنی زمین کو ذاتی ملکیت سمجھنا اور اسے کاشتکاروں کو کرائے پر دے دینا۔ عربوں کی بنیادی معیشت زراعت نہیں تھی۔ لیکن جہاں جہاں یہ کیفیت تھی وہاں زمینداری کا بھی رواج تھا حضور نے اس سے منع فرمادیا۔ چنانچہ مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

حضرت رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ کے زمانے میں زراعت کے لئے تہائی، چوتھائی یا غلہ کی کوئی خاص مقدار متعین کر کے زمینیں طبائی پر دیتے تھے۔ ایک روز میرے ایک چچا میرے پاس آئے اور کہا کہ رسول اللہؐ نے ہمیں ایک ایسے کام سے روکا ہے جو ہمارے لئے نفع بخش تھا۔ مگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرماں برداری زیادہ نفع بخش ہے۔ حضورؐ نے ہمیں اس بات سے منع کر دیا ہے کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں، یعنی تہائی، چوتھائی یا مقررہ مقدار کے غلہ کے عوض زمین کو کرایہ پر دے دیں۔ آپؐ نے حکم دیا ہے کہ مالک زمین خود کاشت کرے یا کسی دوسرے بھائی کو کاشت پر دے دے اور آپؐ نے زمین کے کرائے کو اور اس کے علاوہ دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے۔

یہ عملی حکم اس اصول کی تشریح تھا جسے حضورؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین، اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔

(ابوداؤد)

اور جب آپؐ نے اس قطعہ زمین کے متعلق جو آپؐ کے ذاتی اخراجات کے لئے آپؐ کی تحویل میں تھا فرمایا کہ وہ صدقہ

ہے تو وہ بھی اسی اصول کی عملی تفسیر تھی۔ اس لئے کہ رسول سب سے پہلے خود احکامِ خداوندی پر عمل کرتا ہے اور اس طرح اس کا عمل دوسروں کے لئے نمونہ بنتا ہے۔ یہی حیثیت اسلامی مملکت کے سربراہ کی ہوتی ہے۔ وہ خود ان قوانین پر عمل کر کے دوسروں کے لئے مثال بنتا ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی میں چونکہ یہ دونوں حیثیتیں یکجا تھیں، اس لئے حضورؐ نے دنیا کو دکھا دیا کہ قرآن کا پیش کردہ نظام کس طرح قابلِ عمل ہے اور اسلامی مملکت کے سربراہ کا زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔

زمین، مملکت کی تحویل میں زمین کے متعلق قاعدہ یہ تھا کہ مفتوحہ علاقوں کی زرعی زمینیں مالِ غنیمت کی طرح فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں شروع

شروع میں یہ زمینیں کچھ زیادہ نہ تھیں۔ لیکن جب عراق فتح ہوا تو زرعی زمینوں کا وسیع رقبہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس وقت اس سوال نے اہمیت اختیار کر لی کہ ان زمینوں کی تقسیم کس طرح کی جائے۔ پہلے حضرت عمرؓ بعض صحابہؓ کے مشورہ سے اس پر آمادہ ہو گئے کہ یہ زمینیں حسبِ معمول فوجیوں میں تقسیم کر دی جائیں لیکن جب اس سوال پر مزید غور کیا گیا تو آپؐ نے یہ رائے بدل دی۔ چنانچہ کتاب الاموال (ابو عبیدہ) میں ہے کہ

جب حضرت عمرؓ جاہیہ آئے تو آپؐ نے زمین کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت معاذؓ نے آپؐ سے کہا کہ خدا کی قسم اس طرح تو وہی کچھ ہوگا جو آپؐ کو ناپسند ہے۔ اگر آپؐ نے زمین کو تقسیم کر دیا تو بڑے بڑے علاقے ان (موجودہ) لوگوں کو مل جائیں گے۔ پھر یہ مرجائیں گے تو یہ زمینیں (وراثت کے ذریعہ) کسی ایک آدمی یا عورت کے ہاتھ میں آ جائیں گی۔ پھر ان کے بعد دوسرے لوگ آئیں گے جو اسلام کا دفاع کریں گے تو ان کو کچھ نہیں مل سکے گا۔ آپؐ غور و فکر کے بعد کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجئے جو آج کے مسلمانوں کے لئے بھی موزوں ہو اور بعد میں آنے والوں کے لئے بھی مفید۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت معاذؓ کی بات سے اتفاق کیا، (اور زمینیں مملکت کی تحویل میں رہنے دیں)۔

اس کے بعد یہ اصول وضع فرما دیا کہ لُتار قابِ الامر فی۔ (کتاب الاموال) زمین کے رقبے انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں گے تاکہ یہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بنے رہیں۔

ہم نے شروع میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اسلامی مملکت

کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ حضورؐ کے یہ تمام ارشادات گرامی اور ان پر (خود حضورؐ کا اور حضورؐ کے سچے جانشینوں کا) عمل اس اہم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے تھا۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے الفاظ میں (خلیفۃ المسلمین) کی تعریف (DEFINITION) ہی یہ ہے کہ

خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل و عیال پر شفقت

کرتا ہے۔ (ابو عبیدہ مکتب الاسوال)

اس شفقت اور عالمگیری کا یہ عالم تھا کہ قحط کے زمانے میں جب لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا تو اس کی نگرانی حضرت عمرؓ خود کرتے تھے۔ ایک دن اسی نگرانی کے وقت آپؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہے۔ آپؓ نے اس سے کہا ”بندہ خدا! دائیں ہاتھ سے کھا۔“ اس نے کہا ”بندہ خدا، وہ ہاتھ مشغول ہے۔“ آپؓ آگے بڑھ گئے۔ دوبارہ ادھر سے گزر ہوا تو دیکھا کہ وہ پھر سے بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا۔ آپؓ نے اسے پھر کہا کہ ”دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔“ اور اس نے پھر وہی جواب دیا تو آپؓ نے پوچھا کہ وہ ہاتھ کس کام میں مشغول ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ہاتھ میدانِ جہاد میں کام آگیا تھا۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ اس کے پاس بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ اس سے پوچھنے لگے کہ تمہیں وضو کون کرتا ہے۔ تمہارا سر کون دھوتا ہے۔ کپڑے کون دھوٹا ہے۔ فلاں فلاں کام کون کرتا ہے۔

چنانچہ آپؓ نے اس کے لئے ایک ملازم کا انتظام کر دیا اور اسے سواری بھی دلوائی۔ اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس کی وجہ سے صدرِ مملکت دن بھر امورِ مملکت کی سرانجام دہی میں مصروف رہنے کے بعد راتوں کو تنہا گشت کرتا تھا اور براہِ راست یہ معلومات حاصل کرتا تھا کہ رعایا کس حال میں ہے اور کسی کو کوئی شکایت تو نہیں۔ اور شکایات کے رفع کرنے کی کیفیت یہ تھی کہ جب آدھی رات کے وقت معلوم ہوا کہ راتوں کو خبر گیری ایک خیمہ میں ایک عورت دروازہ میں مبتلا ہے اور دایہ کا کوئی انتظام نہیں تو گھر سے اپنی بیوی کو لے گئے کہ وہ تکلیف زدہ بہن کی مدد کرے۔ کیسا عجیب تھا وہ منظر کہ خیمہ کے اندر مملکت کی خاتونِ اول ”ایک دیہاتی عورت کی دایہ گیری کی خدمت سرانجام دے رہی ہے اور خیمہ کے باہر

صدرِ مملکت اس عورت کے خاوند سے مصروفِ گفتگو ہے اور ان دونوں میاں بیوی پر یہ راز (کہ یہ کون ہیں) اُس وقت کھلتا ہے جب اندر سے بے ساختہ یہ خوش خبری آتی ہے کہ امیر المؤمنین مبارک ہو آپ کے بھائی کو اللہ نے بیٹا عطا فرمایا ہے۔

افرادِ مملکت کے احوال و کوائف کی ذمہ داری کا دائرہ کہاں تک وسیع تھا اُس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جو حضرت عمرؓ کو اپنے شام کے سفر کے دوران پیش آیا تھا۔ ایک شب کسی میدان میں آپ کا قیام تھا۔ حسبِ معمول گشت کے لئے نکلے۔ دیکھا کہ ایک خیمے میں ایک ضعیف بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ مائی! کوئی شکایت تو نہیں۔ اس نے کہا کہ جب خلیفہ کو اس کا خیال نہیں کہ وہ رعایا کی شکایات رفع کرے تو کسی اور کو شکایات بتانے سے کیا حاصل ہے۔ آپ نے کہا کہ تم نے خلیفہ تک اپنی شکایات پہنچائی ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ معلوم کرے کہ رعایا کو کیا شکایات ہیں یا میرا فرض ہے کہ میں اپنی شکایات اس تک پہنچاؤں؟

حضرت عمرؓ اس واقعہ کو ہمیشہ دہرایا کرتے اور باچشمِ غم کہا کرتے تھے کہ مجھے اس بڑھیا نے بتایا کہ خلافت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ یعنی جو شخص خدا کے نام پر حکومت کرتا ہے اسے اس قدر خدائی صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں اسے ایسا خیر و علیم ہونا چاہیئے کہ اسے ہر وقت معلوم ہو کہ افرادِ مملکت کس حال میں ہیں۔ اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس کی بنا پر آپ نے کہا تھا کہ

اگر میں زندہ رہا تو ایک سال تک اپنی رعایا کے درمیان دورہ کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عوام کی بعض ضروریات ایسی ہیں جن کی مجھے تک خبر نہیں پہنچ پاتی۔ میں پہلے شام جاؤں گا اور وہاں دو ماہ ٹھہروں گا۔ پھر الجیریہ جاؤں گا وہاں دو ماہ قیام کروں گا۔ پھر بحرین جاؤں گا اور وہاں بھی دو ماہ قیام کروں گا، پھر بصرہ جاؤں گا وہاں بھی دو ماہ ٹھہروں گا۔ پھر مصر جاؤں گا اور وہاں بھی دو ماہ قیام کروں گا۔ پھر کوفہ جاؤں گا۔ اور وہاں بھی دو ماہ ٹھہروں گا۔ خدا کی قسم! یہ سال کتنا اچھا ہو گا!

لیکن آپ کی بے وقت شہادت نے آپ کو اس پروگرام پر عمل کرنے کا موقع نہ دیا۔

حضرت عثمانؓ کے متعلق حضرت موسیٰ بن طلحہؓ کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو منبر پر بیٹھ کر جب کہ مؤذن نماز کے لئے اقامت کہہ رہا تھا لوگوں سے ان کے حالات، خبریں اور اشیاء کے نرخ دریافت کرتے سنا۔

یہ حالات اس لئے دریافت کئے جاتے تھے کہ افرادِ مملکت کی ضروریات کا پورا کرنا اور ان کی شکایات کا رفع کرنا رئیسِ مملکت اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتا تھا۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کی ابتدائی شکل تو وہ تھی جس کی طرف نبی اکرمؐ نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا تھا کہ میں قبیلہ اشعری میں سے ہوں جن کا مسلک یہ ہے کہ عسرت کے زمانے میں تمام افراد اپنا اپنا کھانا ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں اور سب مل کر کھا لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب حالات بہتر ہو گئے تو افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کئے گئے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ہرنچے کا وظیفہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی لگ جایا کرے۔ نبی اکرمؐ اور ابوبکرؓ صدیق کے زمانے میں یہ وظائف ضرورت کے اعتبار سے یکساں طور پر ملتے رہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں فرق مدارج کر دیا، یعنی جن حضرات نے اسلام کی خدمت میں سہقت کی تھی انہیں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا۔ کچھ عرصے بعد حضرت عمرؓ نے خود ہی محسوس کر لیا کہ اس طرح ان لوگوں کے پاس جنہیں ان کی ضروریات سے زیادہ ملتا ہے، فاضلہ دولت جمع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر نظر ثانی کا ارادہ کر لیا۔

طبری میں ہے کہ

امیروں سے دولت لے کر | حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ”وظائف کے سلسلے میں جو امور پہلے میں

کرچکا ہوں، اگر مجھے آئندہ ان کے طے کرنے کا موقع ملا تو میں امیروں سے ان کی فاضلہ دولت لے کر ہاجرین کے ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم کر دوں گا۔“

دوسرے مقام پر ہے، آپ نے فرمایا کہ

اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو (وظائف میں) سب سے نیچے کے لوگوں کو سب سے

اوپر کے لوگوں کے ساتھ ملا دوں گا۔ (طبقات ابن سعد)

اور آپ کا یہ فیصلہ قرآن کریم کے اس حکم کے عین مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے کہ

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۖ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا
بِرَآدِئِي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۖ
أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ (۱۶)

جہاں تک روزی کمانے کا تعلق ہے، خدا نے مختلف افراد کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ سو جو لوگ زیادہ رزق کما لیتے ہیں وہ فاضلہ رزق کو ان لوگوں کی طرف لٹا کیوں نہیں دیتے جو ان کے زیر دست ہیں، تاکہ اس طرح (ضروریات پوری ہونے کی جہت سے) سب مساوی ہو جائیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ درحقیقت خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہو گئی ہوگی کہ روایات میں جو یہ آتا ہے کہ حضورؐ کس قدر فقر و فاقہ اور عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتے تھے تو اس کی وجہ کیا تھی۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کی وجہ وہ نہیں تھی جو ہماری وعظ کی مجلسوں اور

فقر و فاقہ کی وجہ

سیرت کے جلسوں میں بالعموم بیان کی جاتی ہے۔ وعظ کی محفل میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ واعظ، حضورؐ کی عسرت اور تنگدستی اور ان کی وجہ سے پیدا شدہ مصائب و آلام کی داستانیں نہایت سوز و گداز سے بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا اپنے مقرب بندوں کی اس طرح آزمائش کرتا ہے۔ ایسا کہہ کر خود بھی دوتا ہے اور سامعین کو بھی رلاتا ہے۔ لیکن حضورؐ کی سیرت طیبہ کی یہ صحیح تصویر نہیں۔ یہ فقر و فاقہ، خدا کی طرف سے ابتلا و آزمائش نہیں تھا نہ ہی یہ (معاذ اللہ) کوئی ایسی مصیبت تھی جس کے ذکر پر ہم خون کے آنسو بہائیں۔

یا (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) یہ کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں پیش کر دی گئی تھیں۔ آپؐ نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دی اور اس لئے ساری عمر عسرت اور تنگدستی میں گزار دی۔ حضورؐ کی سیرت اقدس کی یہ تعبیر بھی درست نہیں۔ آپؐ دنیا کو رہبانیت کی تعلیم دینے کے لئے نہیں آئے تھے۔ آپؐ اسلام کی تعلیم عام کرنے اور اس پر عمل کر کے دکھانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور قوتوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور پھر انہیں احکام خداوندی کے مطابق نوع انسان کی بہبود کے لئے عام کر دیا جائے۔

یاجب یہ روایات بیان کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے اپنے ترکہ میں کوئی مال و دولت نہیں چھوڑا اور اس کے

متعلق فرمادیا کہ ان کا دارث کوئی نہیں، یہ تمام مسلمانوں کے مفاد کے لئے عام ہیں تو اس کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ حضورؐ کے لئے خصوصی احکام تھے، عام مسلمانوں کے لئے نہیں تھے۔ حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ حضورؐ کے لئے دوسرے مسلمانوں سے الگ جو خصوصی احکام تھے ان کی صراحت خود قرآن نے کر دی ہے۔ (مثلاً حضورؐ کی ازواجِ مطہرات کا اُہبات المؤمنین ہونا)۔ جن احکام کے متعلق قرآن نے ایسی تصریح نہیں کی وہ سب کے لئے عام تھے۔ اس لئے حضورؐ نے جس نہج کی زندگی گزاری اور وراثت کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ اسلام کے عام منشاء کے مطابق تھا۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں وراثت وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں وہ اُس زمانے سے متعلق ہیں جب ہنوز اسلام کا مملکتی نظام اپنی اصلی شکل میں متشکل نہ ہوا ہو، یا وہ نظام بعض اشیاء کو افراد کی ملکیت میں رہنے دے۔ اسلامی نظام میں کیفیتِ دہی ہوگی جس کا نقشہ ہمارے سامنے سیرتِ محمدیہ میں آتا ہے، یعنی ہر زائد از ضرورت چیزِ ملت کی تحویل میں چلی جائے گی تاکہ اس سے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کی جائیں۔ یہ نہجِ زندگی رسول اللہؐ کے لئے خاص نہیں تھا۔ قرآن کی رو سے عام اسلامی نہجِ زندگی ایسا ہی ہے۔

اور جن لوگوں کو کوئی اور دلیل نہیں ملتی، وہ یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے اور دوسروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے

ہیں کہ بھائی! وہ تو خدا کے رسول تھے۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنا کیا میرے تمہارے بس

وہ تو رسول تھے | کی بات ہو سکتی ہے؟ وہ کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکے کہ میں حضورؐ جیسی زندگی بسر کر

سکتا ہوں۔ توبہ توبہ! معاذ اللہ! یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔

لیکن یہ کہتے ہوئے وہ اتنا نہیں سوچتے کہ اگر ایسی زندگی صرف ایک رسول ہی بسر کر سکتا تھا اور اس کے علاوہ

کسی اور انسان کے لئے ایسی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی سیرت کو تمام مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ کیوں قرار دیا؟ اسوۂ (نمونہ) تو دہی ہو سکتا ہے جس کے مطابق بن جانے والے دوسروں کے لئے ممکن ہو۔ اگر ہم زندگی

کی گزر گاہوں پر حضورؐ کے نقوشِ قدم پر چل ہی نہیں سکتے، اگر اس راستہ پر چلنا نبیؐ کے

سوا کسی اور کے لئے ممکن نہیں تو حضورؐ کی سیرتِ طیبہ ہمارے لئے نمونہ کس طرح بن سکتی ہے

اسوۂ حسنہ

اور اس کے مطالعہ اور تذکرہ سے ہمیں فائدہ کیا پہنچ سکتا ہے بجز اس کے کہ (معاف بفرمائید) اسے وعظ کی محفلوں میں

بیان کر کے سامعین سے دائرِ سخن لی جائے۔ یاد رکھیے! حضورؐ کی سیرتِ طیبہ ہمارے ہی لئے نہیں، ساری دنیا کے

انسانوں کے لئے بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ ہے) جس پر ہر زمانے میں عمل کیا جاسکتا ہے اور اس سے دہی خوشگوار

نتائج پیدا کئے جاسکتے ہیں جنہیں حضورؐ نے پیدا کر کے دکھایا تھا۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے اس اہم گوشے کے متعلق اس قسم کی تاویلات اور

توجیہات کیوں کی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ ہمارے

اربابِ شریعت ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ

یہ تاویلات کیوں؟

۱۔ اسلام کی رُو سے یہ بالکل جائز ہے کہ انسان جس قدر جی چاہے دولت کے انبار جمع کرنا رہے، حتیٰ جائداد

جی چاہے کھڑی کرے اور ان سے آمدنی پیدا کرتا جائے۔ جس قدر جی چاہے زمین خریدنا جائے اور

اسے پٹہ یا ٹٹائی پر کاشتکاروں کو دیتا جائے۔ جس کا رد بار میں جی چاہے اپنا سرمایہ لگا کر بغیر محنت کیے

نفع حاصل کرتا جائے۔ اسلام دولت جمع کرنے اور جائدادیں بنانے پر کسی قسم کی حد بندی قائم نہیں کرتا۔

۲۔ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے وہ جسے چاہے کروڑ پتی بنادے، جسے چاہے غریب و نادار

رکھے۔ امیروں کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ وہ اپنی دولت میں سے ڈھائی فی صد زکوٰۃ دیتے جائیں، یا

غریبوں اور محتاجوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے بطور خیرات ڈال دیا کریں۔ اس سے زیادہ ان

پر کوئی فریضہ عائد نہیں ہوتا۔

ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہی اسلام کا صحیح نقشہ ہے لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ اس

نقشے میں فٹ نہیں بیٹھتی تو بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ اسلام کا جو نقشہ وہ پیش کر رہے ہیں، کہیں

وہ تو غلط نہیں، وہ حضورؐ کی سیرت کی ایسی تاویلات شروع کر دیتے ہیں جس سے یہ بھی اپنے مقام پر صیح رہے اور

وہ نقشہ بھی عین مطابق اسلام سمجھا جائے جسے وہ پیش کرتے ہیں۔ یہ ہے ان کی تاویلات و توجیہات کی کوششوں

کا جذبہ محرکہ۔ اگر ہمارے سامنے اسلام کا وہ نقشہ ہوتا جسے قرآنِ کریم پیش کرتا ہے تو حضورؐ کی سیرت کے

اس گوشے کے متعلق کسی تاویل و توجیہ کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ یہ اس نقشے میں بالکل فٹ بیٹھ جاتا اور دنیا

دیکھ لیتی کہ قرآنِ کریم انسان کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا جو تصور پیش کرتا ہے، حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کس طرح

اس کی عملی تفسیر ہے۔ اُس وقت یہ حقیقت بھی دنیا کے سامنے آ جاتی کہ حضورؐ کی فقر و فاقہ کی زندگی ان ذمہ داریوں -

کا صیح عکس ہے جو نوعِ انسانی کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا بوجھ اٹھانے والے اسلامی مملکت کے سربراہ کے سر

پر عائد ہوتی ہیں اور جن کے احساس سے وہ نہ دن کو آرام کرتا ہے

کمر توڑ دینے والی ذمہ داریاں

نہ رات کو چین سے سوتا ہے تا آنکہ اسے یقین نہ ہو جائے کہ مملکت

کا ہر فرد آرام اور چین کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ انہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے — جن کے متعلق

قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے حضور کی کمر توڑ دی تھی۔ (وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ ۚ)۔ وہ اپنا معیارِ زیست ایسا رکھتا ہے جو اس مملکت کے غریب ترین فرد کا ہو۔ پھر وہ ان غریبوں کے معیار کو بلند کرنا شروع کرتا ہے تاکہ اس سے خود اس کا اپنا معیارِ زیست بلند ہو جائے۔ اس طرح پوری ملت کے معیار کی سطح بلند ہوتی چلی جاتی ہے اور اس بلندی کے سامنے کوئی روک نہیں ہوتی جہاں پہنچ کر یہ کہہ دیا جائے کہ اس سے زیادہ بلند معیار کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

سب ادنیٰ معیار | اسلامی نظام انسانی زندگی کے معیار کو تباہ کھکشاں پہنچانا چاہتا ہے لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا کہ نوع انسانی کا ایک طبقہ تو ثریا کی بلندیوں تک پہنچ رہا ہو اور دوسرا طبقہ تحت اثریٰ کی پستیوں میں رینگ رہا ہو۔ اس میں پوری کی پوری اُمت اور پورا کواٹھرتی ہے اور ان اُبھرتے والوں میں اُمت کا سربراہ سب نیچے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ پوری اُمت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوتا ہے۔ اگر وہ نیچے سے نکل کر اوپر آجائے تو یہ ساری عمارت خود اپنے بوجھ سے دب کر نیچے آگرے۔ چنانچہ جن قوموں اور ملتوں میں ذمہ دار افراد خود اوپر پہنچ جاتے ہیں اور قوم نیچے رہتی ہے وہ قومیں اور ایسا تمدن تباہی اور بربادی کے جہنم کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

سیرتِ محمدیہ | سیرتِ محمدیہ ساری دنیا کے اربابِ فکر و عمل کو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اگر تم انسانیت کی سطح کو بلند کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ تم انسانیت کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ اور اپنی سیرت و کردار کو بلند کرتے جاؤ۔ اس طرح جس قدر تم خود بلند ہوتے جاؤ گے اسی نسبت سے انسانیت اوپر کواٹھتی چلی جائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبالؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش^۱ تختِ کسریٰ زیرِ پائے اُمّتش^۲

اس شاہنشاہِ بوریا نشینؑ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک درخشندہ نقش، جہاں کشور کشائی و فرمانروائی کے اس عظیم راز کی پر وہ کشائی کرتا ہے کہ جو صاحبِ ہمت اس بارِ امانت کو اٹھائے وہ خود تخت کے اوپر نہ بیٹھے تخت کے اوپر قوم کو بٹھائے اور اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کی سطح کو بلند کرتا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن کی پیش کردہ مستقل اقدار پر انسان کا اٹل ایمان ہو اور وہ زندگی کے اس نقشہ کو اپنا نصب العین قرار دے جسے محمد رسول اللہ والذین معہ کے مقدس

ماخضوں نے عملاً مرتب کر کے دکھا دیا تھا۔ جس دن دنیا نے اس راز کو پالیا اور اس نقشے کو اپنا مقصود و مطلوب قرار دے لیا کیہ جہنم جس میں اس وقت ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے، جنت ارضی سے بدل جائے گا اور زمین سر اٹھا کر آسمان سے کہہ سکے گی کہ

دیدہ آغازم ————— انجائیم نگر!

اور عالم ملکوت کی نورپاش فضاؤں سے، تبریک و تہنیت کے یہ نغمات جاں فزا، ساکنان ارض کے لئے فردوسِ گوش بنیں گے کہ

إِنَّ اللَّهَ قَدْ مَلَكَ لَهُ يَصْلَوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ
وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا — (۳۳/۵۶)



اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی مملکت کی یہ ذمہ داری صرف اپنی مملکت کے افراد تک محدود نہیں، اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور تمام عالم انسانیت کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اپنی ”مملکت“ تو وہ عمل (لیبارٹری) ہوتی ہے جس میں سب سے پہلے اس نظام کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ جوں جوں ان افرادِ مملکت کی ضروریات پوری ہوتی چلی جاتی ہیں، عالمگیرِ ربوبیت کے اس دائرے کی حدیں آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا منتہی پوری کی پوری نوعِ انسانی کی پرورش اور نشو و نما ہے۔ اس سلسلے میں انسان اور

عالمگیرِ ربوبیت

کی لعنت کا پیدا کردہ ہے جس نے انسانوں کو خود ساختہ معیاروں کے مطابق مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دنیا کو بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کا الم انجیز جہنم بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام اس تفریق کو مٹانے کے لئے وجود میں آتا ہے جس نظام کے سربراہ کا یہ اعلان ہو کہ ”اگر وجہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمہ داری عمرض کے سر ہوگی“ کیا اس نظام میں یہ دیکھا جائے گا کہ جو شخص بھوک سے کرا رہا ہے وہ اپنی مملکت کا باشندہ ہے یا کسی دوسری مملکت کا، وہ اپنی قوم کا فرد ہے یا غیر قوم کا، وہ کالا ہے یا گورا، وہ عربی ہے یا عجمی، وہ مسلمان ہے یا کافر۔ اس نظام میں اس کی قطعاً تمیز نہیں کی جائے گی۔

نوعِ انسان کی طرف رسولؐ

اس میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے لانے والے رسولؐ کا خطاب نہ کسی خاص خطہ زمین کے لوگوں سے تھا نہ کسی خاص قبیلہ،

نسل یا قوم کے افراد سے۔ اس کا خطاب پوری نوعِ انسانی سے تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا — (۱۵۸)

اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف، خدا کا پیامبر ہوں۔

اسی جہت سے اس رسول کو بھیجے والے خدا نے اعلان کر دیا تھا کہ

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ — (۲۱)

ہم نے تجھے تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رحمت کے معنی ہیں سامانی نشوونما جو بلا مزد و معاد صند دیا جائے۔ اور نشوونما میں انسان کی جسمانی پرورش

اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی تربیت اور ارتقاء سب آجاتے ہیں۔ لہذا حضور کے ظہورِ قدسی کا مقصد یہ تھا

کہ عالمگیر انسانیت کی اس طرح نشوونما ہوتی جائے کہ صحنِ عالم میں کوئی غنی بن کھلے مَر جھا جائے۔ اسی

رحمتہ للعالمین کا تقاضا تھا جس کی وجہ سے آپ نے روم کے شاہنشاہ کو لکھا کہ

”اگر تم نے صیغہ راستہ اختیار نہ کیا تو تیری مملکت میں مظلوم کا شتمکاروں پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں

اس کا سارا بار تیری گردن پر ہو گا اور ہم پر یہ فرض ہو جائے گا کہ ان مظلوموں کو اس ظلم سے بچائیں۔“

سیرتِ محمدیہ کا ایک ایک گوشہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا

میں جہاں بھی ظلم ہو رہا ہو وہ مظلوم کی فریاد کو سنے اور اس کی مدد کو پہنچے۔

ہزار ہزار سلام و رحمت ہو نوعِ انسان کے اس محسنِ عظیم پر جس نے اپنی عظیم النظیر تعلیم اور فقیہانہ مثالِ عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ

جو شخص انسانوں کے معاملات سنانے کی ذمہ داری اپنے آپ پر لے اس کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہیے۔ یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جس کے

نقوشِ زندگی کی شاہراہ پر تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتے اور کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کا سرِ رخ دیتے

ہیں۔ زمانے کی ریگِ اُمان پر لاگ رہے نقوشِ قدم نہ ہوں تو کوئی راہِ روا اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

بہتر یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہوا چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خُم بھی نہ ہو بزمِ تو حید بھی دنیا میں نہ ہو خُم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

نبضِ ہستی تپشِ آمادہ اسی نام سے ہے



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسلامی آئین کے بنیادی اصول

قرآن کریم نے، ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض قرار دیا ہے۔ (۲۴/۵۵) —————
یعنی دنیا میں مملکت اور حکومت۔ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں راہِ نمائی عطا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس دعویٰ کے مطابق اس نے اس مملکت کے لئے بھی راہِ نمائی دی ہوگی جسے اس نے جماعتِ مومنین کے ایمان و عمل کا فطری نتیجہ کہا ہے۔ اس نے یہ راہِ نمائی دی ہے اور بڑے واضح انداز میں دی ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ وہ ان امور کے لئے اصولی راہِ نمائی دیتا ہے اور اسے جماعتِ مومنین پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے حالات کے مطابق جوئیات خود مرتب کریں۔ ذیل میں ہم اسلامی مملکت کے آئین کے متعلق وہ اصول بیان کرتے ہیں جنہیں قرآن کریم نے ہماری راہِ نمائی کے لئے عطا کیا ہے۔ جو آئین ان اصولوں کے مطابق مرتب ہوگا اسے اسلامی آئین کہا جائے گا اور جس مملکت کا وہ آئین ہوگا وہ مملکتِ اسلامی کہلائے گی۔ یہ اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ جوئیات زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہیں گی۔

باب اول

اقتدارِ اعلیٰ

۱۔ قرآنی اصطلاح

اصطلاحات ہر دور میں بدلتی رہتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں نظامِ مملکت، ضابطہ، قانون، آئین وغیرہ عام سیاسی اصطلاحات رائج ہیں۔ قرآنِ کریم میں ان سب کے لئے ایک جامع اصطلاح آئی ہے اور وہ ہے ”الدین“ یہ لفظ ان تمام قوانین و ضوابط اور نظام و آئین کو محیط ہے جو انسانی زندگی کو ایک خاص منہج پر چلاتے ہیں۔ لہذا الدین وہ آئین مملکت اور نظامِ حکومت ہے جس کے اصول خدا نے اپنی کتاب میں دیئے ہیں۔

۲۔ آئینی زندگی

قرآنِ کریم فوضیت (ANARCHY) کی زندگی پسند نہیں کرتا۔ وہ آئین و نظام کے تابع زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ وہ دور جس میں انسان خدا کے عطا کردہ (الدین) کے مطابق زندگی بسر کریں، قرآن کی اصطلاح میں ”یوم الدین“ کہلاتا ہے، یعنی وہ دور جس میں الدین (آئینِ خداوندی) کا دورِ دورہ ہوگا۔

۳۔ اقتدارِ اعلیٰ

یوں تو لفظ اللہ کے معنی بھی (جس کے پہلے الف - لام لگ کر اللہ بنا ہے) صاحبِ اقتدار و اختیار کے ہیں، یعنی اللہ کے معنی ہیں وہ ہستی جو تمام اقتدارات و اختیارات کی مالک ہے۔ لیکن اس خاص صفت کے لئے قرآنِ کریم میں لفظ مالک آیا ہے۔

قرآنِ کریم کی سب سے پہلی سورۃ (سورۃ فاتحہ) میں، خدا کی ربوبیت اور جہمیت (یعنی نشوونما دینے) کی

ط الدین کے معنی ظہورِ تبارک کے بھی ہیں یعنی وہ دور جس میں عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آجائے یا یوں کہیے کہ آخری فیصلوں کا دور۔ یہ اس دنیا میں بھی ہوگا اور آخرت میں بھی۔

صفات کے بعد کہا گیا ہے مَا لَيْكَ يَوْمَ الدِّينِ (۱۶) یعنی انسان کی صحیح آئینی زندگی میں اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہوگا۔

اس مفہوم کی وضاحت قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی کہ مَا آذَنُكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ۔ لا تجھے کیا معلوم ہے کہ یوم الدین کسے کہتے ہیں۔ ثُمَّ مَا آذَنُكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ۔ تم کیا سمجھو کہ یوم الدین سے مراد کیا ہے؟ یہ کہنے کے بعد خود ہی جواب دیا کہ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ لِنَفْسٍ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ۔ (۱۷-۱۸) ”جس دور میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر کسی قسم کا اقتدار اور اختیار نہیں رکھے گا اور اس میں حکم صرف خدا کا ہوگا۔“

اس کے معنی یہ ہیں کہ آئینِ خداوندی کی تُو سے اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ کو حاصل ہوگا۔ اسی لئے دوسری جگہ اسے مِلِكِ الْمُلْكِ (۱۹) کہا گیا ہے یعنی وہ ہستی جسے خارجی کائنات اور انسانوں کی مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو۔ وہ اپنے اس اقتدارِ مطلق میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۲۰)۔ ”وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔“ سورہ التین میں ہے کہ فَتَمَایْكَدُ بُلُکَ بَعْدُ بِالسِّدِّیْنِ۔ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِیْنِ (۲۱)۔ ”اس کے بعد وہ کونسی چیز ہے جو تجھے الدین کے بارے میں جھٹلا سکتی ہے۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟“

اسلامی آئین کی شقِ اول

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ اسلامی آئین کی شقِ اول یہ ہوگی کہ مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کو حاصل ہوگا۔ اس کے علاوہ کسی کو اقتدار و اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

۴۔ مسلم

جو شخص اسلامی آئین کی اس بنیادی شق کو تسلیم کرے گا اسے ”مسلم“ کہا جائے گا۔ اس شرط کے پورا کرنے سے وہ

حاکم کے بعد کی زندگی میں اس دور سے کیا مراد ہے۔ اس کے متعلق قرآنِ کریم نے الگ تصریحات دی ہیں۔ اس دنیا میں یہ دور قرآنی حکومت کا دور ہوگا۔

فرد اس مملکت کا شہری بن سکے گا۔ سورۃ انبیاء میں ہے:-

قُلْ إِنَّمَا يُوحِي إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُمُ إِلَهٌ وَاحِدٌ ۚ قَهْلَ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (۲۱)

ان سے کہہ دو کہ میری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا صاحبِ اقتدار صرف خدائے واحد ہے۔ (اس کے

بعد بتاؤ کہ) کیا تم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہو؟

اسی کو لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا اقرار کہتے ہیں، یعنی اس امر کا اقرار کہ اللہ کے سوا کوئی اور صاحبِ اقتدار نہیں۔

اس بنیادی اصول کو ماننے والے وہ افراد ہیں جو مَالِکِ یَوْمِ الدِّینِ کے بعد کہتے ہیں۔ اِيَّاكَ تَعْبُدُ

(۲۱) ہم صرف تیری اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے سورۃ یوسف میں ان جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا

لِلّٰهِ۔ ”حکومت اللہ کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔“ اَمَّا اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاۤلَا۔ اس نے حکم دیا ہے

کہ اس کے سوا کسی اور کی فرمانبرداری اختیار نہ کرو۔ ذٰلِكَ السِّيَرُ الْقَيِّمُ۔ یہی صحیح، سیدھا اور

توازن بدوش آئین حیات ہے۔ وَلَئِكَ اَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ — (۱۲) لیکن اکثر لوگ

اس حقیقت کو جانتے نہیں۔ اور کبھی اقتدارِ اعلیٰ کسی ایک فرد (بادشاہ یا ڈکٹیٹر) کے سپرد کر دیتے ہیں اور کبھی

عوام کے متعلق سمجھتے ہیں کہ اقتدارِ اعلیٰ انہیں حاصل ہے۔ یاد رکھیے:-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ اَنْ شَاءَ يَقُوْلَ

لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ... (۳۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکومت و نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں

سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے فرماں پذیر بن جاؤ۔

محمودیت صرف خدا کی جائز ہے۔ حکمراں ہے اک وہی، باقی تباہِ آذری۔



باب دوم

عملی اقتدار

تمریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اسلامی آئین کی جڑ سے اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے اور کسی

کو نہیں۔ لیکن خدا تو ایک بسیط حقیقت (ABSTRACT REALITY) ہے جو نہ کسی انسان کے سامنے آتا ہے نہ کسی سے بات کرتا ہے۔ نہ اسے کوئی دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے اس کے اقتدار کی عملی شکل کیا ہے؟ یعنی اس کا یہ اقتدار، مملکت کے اندر نفاذ پذیر کس طرح سے ہوتا ہے۔ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ اَتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ اَوْ لِيَا عَدُوِّكُمْ (۱۰۰)۔ جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ دیگر کار فرماؤں کا اتباع مت کرو۔ یعنی خدا کا یہ اقتدار اعلیٰ اس کتاب (قرآن کریم) کی رو سے نافذ العمل ہوتا ہے جسے اس نے نوع انسان کا راہ نمائی کے لئے نازل کیا ہے۔ اس حقیقت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا آتَاكَ
اللَّهُ..... (۱۰۱)

یقیناً ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ لوگوں میں اس کے مطابق حکومت قائم کرے جس کا اللہ نے تجھے علم دیا ہے۔

یہی چیز مومن اور کافر میں ماہہ الامتیاز ہے سورہ مائدہ میں ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا آتَاكَ اللَّهُ فَآوْ اِلَيْكَ هُمْ اَلْكَافِرُونَ (۱۰۲)۔ اور جو قوم خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتی، تو یہی لوگ کافر ہیں۔ یعنی سیکولر اور اسلامی مملکت میں فرق یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں حکومت قرآن کریم کے مطابق قائم ہوتی ہے اور سیکولر حکومت میں انسانوں کی مرضی کے مطابق۔ جو لوگ قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مسلمان نہیں ہو سکتے، کافر ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرنے کا نام الاسلام ہے۔

ان تصریحات سے یہ بھی واضح ہے کہ جس ملک کے باشندے مسلمان ہوں، اس کے لئے یہ سوال فیصلہ طلب نہیں ہوتا کہ وہاں کا آئین مملکت قرآن کریم کے مطابق ہونا چاہیے یا کوئی اور جو شخص مسلمان ہوتا ہے وہ اس بنیادی حقیقت کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی قرآن کے تابع بسر کرے گا۔ اگر وہ قرآن کے سوا کوئی اور آئین چاہتا ہے، تو اس کے لئے کھلا ہوا راستہ یہ ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے اپنے لئے غیر قرآنی آئین تجویز کرے۔ مسلم اور قرآنی آئین لازم و ملزوم ہیں۔

اسلامی آئین کی دوسری شق یہ ہوگی کہ

اس مملکت میں عملاً اقتدارِ اعلیٰ قرآنِ کریم کو حاصل ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت قرآن کے مطابق قائم کی جائے گی اور اس کے خلاف کوئی فیصلہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

۲۔ صاف اور واضح کتاب

یہ کتاب صاف اور واضح ہے، اپنے مطالب کو کھول کر بیان کرتی ہے (إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ) (۳۶/۶۹) بڑی آسان ہے۔ (وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ) (۵۲/۳۲)۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ (وَلَقَدْ يَجْعَلُ لَّهُ يَتَوَجَّاهَا) (۱۸/۱۸) اس کے منجانب اللہ سونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ - وَكَوْنًا مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ تَوَحَّدُوا فِيهِ
اِخْتِلَافًا كَثِيرًا - (۳۲/۳۲)

کیلیہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔

لہذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ قرآن کو ضابطہ مملکت بنانے سے امت میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ یہ کتاب نوعِ انسان کے اختلافات مٹانے کے لئے آئی ہے۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اِخْتَلَفُوا فِيهِ (۲۱/۲۱) تاکہ یہ لوگوں میں ان امور کا فیصلہ کرے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اس لئے اسے مملکت کا آئین تسلیم کرنے سے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔



باب سوم کتاب کی عملی تنفیذ

۱۔ وراثتِ کتاب

کتاب (خواہ کوئی بھی ہو) بہر حال حروف و الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اسے عملاً نافذ کرنے کے لئے کسی زندہ شخص کی

(نظام) کی ضرورت لائینک ہے۔ اسلامی آئین کی رُو سے، یہ اتھارٹی کسی فرد، کسی گروہ یا کسی خاص جماعت کو تفویض نہیں کی جاتی۔ یہ فریضہ پوری کی پوری اُمت کے سپرد ہوتا ہے جسے اس کتاب کا دارث مٹھرایا گیا ہے۔ ثُمَّ آدَرَشْنَا اَلْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا... (۳۵) ”پھر ہم نے اس کتاب کا دارث انہیں بنایا، جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے (اس مقصد کے لئے) چن لیا۔“ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اسلامی مملکت کا فریضہ قرآن کے اصول و قوانین کے مطابق حکومت قائم کرنا ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کہتے ہیں، یعنی جس بات کو قرآن صحیح قرار دیتا ہے اس کا حکم دنیا اور جو اس کی رُو سے ناپسندیدہ ہے اس سے روکنا۔ یہ فریضہ پوری کی پوری اُمت کا فراد یا گیا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ - (۳۰۹)

تم بہترین اُمت ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔

۲۔ مشاورت

اُمت یہ فرائض باہمی مشاورت سے سرانجام دے گی۔ وَ اَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ - (۲۲) ”اُن کے امور مملکت باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔“

واضح رہے کہ (جیسا کہ پہلے کہا چکا ہے) امور مملکت کے بارے میں قرآن اصولی (راہ نمائی) دیتا ہے، ان اصولوں کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ اس لئے اس نے یہ تو کہہ دیا کہ امور مملکت باہمی مشاورت سے طے ہوں گے، لیکن اس مشاورت کی مشیز خود متعین نہیں کی۔ اسے اُمت پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق خود تجویز کرے کہ اس مشاورت کے لئے علی اسکیم کونسی اختیار کرنی چاہیے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں اسلامی آئین کی تیسری شق یہ ہوگی۔

قرآن کریم کے مطابق حکومت کا قیام، ملتِ اسلامیہ کا مشترکہ فریضہ ہوگا اور یہ فریضہ ان کے باہمی مشورہ سے سرانجام پائے گا۔

اس اعتبار سے یہ نظام جمہوریہ شوریہ کہلا سکے گا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جمہور کے مجملہ اختیارات قرآن کریم کی حدود کے اندر ہوں گے۔ وہ نہ تو ان حدود میں کمی بیشی کر سکیں گے اور ان سے تجاوز نہ کریں۔ اس میں ”تحقیقاً کیسی“ کا شائبہ نہیں

ہوگا۔ اس لئے کہ اس ممکنیت میں کسی کو خدائی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ یہ صرف احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر ملے گی جہاں ممکنیت کے ”قانون سازی کے اختیارات پر“ بحث کی جائے گی)۔

۳۔ پارٹی سسٹم

قرآنِ کریم کی رو سے پوری امت ایک پارٹی ہے۔ اس کے اندر پارٹیوں کا وجود (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کے پیکر میں) شرک ہے۔ سورہ روم میں ہے: وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا كُلُّ جُزْءٍ يَمِئَلُهُمْ فِرَاقَ بَيْنِهِمْ (مسلمانو! دیکھنا تم خدا کے واحد پر ایمان لا کر پھر سے کہیں) مشرک ہیں سے نہ ہو جانا، یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقوں (پارٹیوں) میں تقسیم ہو گئے۔ پھر یہ فرقہ (پارٹی) اپنے اپنے منشور پر اترارہے۔ دوسرے مقام پر رسول اللہ سے کہا گیا کہ اِنَّ السَّيِّئِينَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَّسْتُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ... (۶۶) ”وہ لوگ جو اپنے دین میں فرقے پیدا کریں اور خود بھی ایک فرقہ یا پارٹی بن جائیں، اے رسول! تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں“ و حدیثِ امتِ دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ خدا کا حکم یہ ہے کہ

وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا... (۳۲)

تم سب کے سب مل کر ”حبل اللہ“ کتابِ خداوندی — کو مضبوطی سے تھامے رہو اور مذہبی فرقوں یا سیاسی پارٹیوں میں مت تقسیم ہو جاؤ۔

فرقوں اور پارٹیوں سے اختلاف پیدا ہوتا ہے اور اختلافِ خدا کا عذاب ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاُتْخَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (۳۳)

(مسلمانو!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو پارٹیوں میں بٹ گئے اور (خدا کی طرف سے) واضح احکام آ

جانے کے بعد، باہمی اختلافات کرنے لگ گئے۔ ان لوگوں کے لئے سخت عذاب ہے۔

اختلافات مٹ جانا خدا کی رحمت ہے۔ وَلَا يَزَالُ لَوْنٌ مُّخْتَلِفِينَ إِلَّا مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّكَ... (۱۱)

”لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے بجز ان کے جن پر تیرے رب کی رحمت ہو۔“

اس مملکت میں تمام افرادِ اُمت ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین کریں گے۔ (وَتَوَّاصُوا بِالْحَقِّ وَتَوَّاصُوا بِالصَّبْرِ) — (شوریہ: ۱۷۷)۔ اور ”برد تقویٰ“ کے کاموں میں سب ایک دوسرے سے تعاون کریں گے (وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ)۔

لہذا اسلامی آئین کی چوتھی شق یہ ہوگی کہ

مملکت میں پوری کی پوری ملت، ایک جماعت کی حیثیت سے حکومت کی تشکیل کرے گی اور ملک میں پارٹیوں اور فرقوں کا وجود قطعاً ممنوع ہوگا۔

چونکہ مذہبی فرقوں کا مٹانا ایک دن کا کام نہیں ہے اس لئے اس شق میں اس امر کی تصریح کی جاسکتی ہے کہ مذہبی فرقوں کا وجود عبوری دور تک مجبوراً برداشت کیا جائے گا۔ لیکن اس دوران میں ایسے قرآنی اقدامات کئے جائیں گے جن سے کچھ وقت کے بعد، پوری ملت، امتِ واحدہ بن جائے۔

باب چہارم

تقسیم کار

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، مملکت اندر بسنے والی ملتِ اسلامیہ ایک اُمت ہوگی۔ لیکن اس مملکت کی سرانجام دہی کے لئے تقسیم کار ضروری ہوگا۔ اور مختلف کاموں کے لئے مختلف صلاحیتوں کے افراد کا انتخاب عمل میں آئے گا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَنْبِيَاءِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۖ (۱۶۶)

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں حکومت عطا کی اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا تاکہ یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تمہارے سپرد کیا گیا ہے اس میں تم کیا کرتے ہو۔

قرآن کریم میں افرادِ اُمت کو مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے، مثلاً مسلمان، مومنین، صالحین، متقین وغیرہ۔

عام طور پر یہ الفاظ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن بعض مقامات میں ان میں اس قسم کا فرق کیا گیا ہے جس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اگر افرادِ اُمت کی تقسیم، جو ہر ذات اور اعمال کی رُو سے کی جائے تو یہ

ہے۔ یہ ”متقین“ کا حلقہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے:-

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تَوَلَّوْا وَجْوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ... أُولَئِكَ
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (۲۴۱)

کشادگی (نیکی) یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی سمت کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشادگی راہ اس کے لئے ہے جو اللہ کی آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لاتا ہے اور مال و دولت کو، اس کی محبت کے عل الرغم قریبیوں کو، یتیموں اور مسکینوں کو اور بے زاد سفر مسافروں کو، محتاجوں کو اور ان کو جو دوسروں کی محکومی میں جکڑے ہوں، دیتا ہے اور وہ لوگ کہ جب وہ کسی سے عہد کریں تو اس عہد کو پورا کرتے ہیں، جو ہر مشقت اور مصیبت میں اور جنگ میں (دشمن کا مقابلہ) ٹہری

ثابت قدمی سے کرتے ہیں۔ یہ ہیں وہ جو اپنے دعوائے ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ انہیں کو متقین کہتے ہیں اور جو ان میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار (یعنی قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے والا) ہو، وہ سب سے زیادہ واجب التکیم ہوتا ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ كُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (۲۴۹) تم میں سے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہو وہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ واجب التکیم ہوتا ہے۔ یہ اس مملکت کا صدر اعظم ہوگا۔

قرآن کریم کی ان آیات سے واضح ہے کہ وہ افراد امت میں عام مساوات کے ساتھ ساتھ تقسیم عمل کے اصول کے مطابق، مختلف مدارج کو تسلیم کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسلامی مملکت میں ہر کلام اس کے سپرد کیا جائے جو اس کا اہل ہو۔ ”اہلیت“ کی شرط یہ ہے کہ اس میں اس فریضہ کے سرانجام دینے کی صلاحیت ہو اور اس کی زندگی قرآن کریم کے مطابق ہو۔ لیکن اس تفریق مدارج کے یہ معنی نہیں کہ اوپر کے طبقے والوں کو نچلے طبقہ والوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اسلامی مملکت میں کسی فرد کو دوسرے فرد پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ یہ تفریق و تمیز محض ذمہ داریوں کی تقسیم کے لئے ہے۔

۲۔ امیدوار

جو شخص اپنے آپ کو کسی خاص ذمہ داری کا اہل سمجھے، وہ اس کے لئے اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کر سکتا ہے۔ قرآن کریم نے مومنین کو یہ دعا سکھائی ہے کہ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ اِمَامًا۔ (۲۵۷) تو ہمیں متقین کا امام بنا دے۔ متقین کی امامت بلند ترین مقام ہے جو اسلامی مملکت میں حاصل ہو سکتا ہے جب اس مقام کی آرزو کی

جا سکتی ہے تو دوسری ذمہ داریوں کے مقامات کی تنائیدیں نہیں کی جا سکتی؛ اور یہ ظاہر ہے کہ جس آرزو کا دل میں پیدا ہونا معیوب نہیں اس کا زبان پر لانا کس طرح معیوب ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ وہ ملک کی حالت سدھارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو انہوں نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ **قَالَ اجْعَلْنِي مَعَ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْهَا** (۱۲/۵۵) مجھے خزانہ ارضی کا انچارج بنا دو۔ میں ان کی حفاظت کر سکتا ہوں (کیونکہ میں اس (شعبہ) کا واقف کار ہوں۔

لہذا اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہوگی کہ

یوں تو افرادِ ملت میں مساوات ہوگی لیکن تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق امورِ مملکت ان لوگوں کو تفویض کئے جائیں گے جن میں ان کے سرانجام دینے کی اہلیت ہوگی۔ ”اہلیت“ کے لئے یہ دیکھا جائے گا کہ ان میں متعلقہ امور کی سرانجام دہی کی صلاحیت کس قدر ہے اور ان کی زندگی کس حد تک قرآنِ کریم کے مطابق ہے۔ اس باب میں معیارِ انتخاب جوہرِ ذاتی اور بلندیِ کوارہ ہوگا، یعنی ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام دیا جائے گا۔

باب پنجم

تشکیلِ حکومت

۱۔ مرکز

اسلامی مملکت کا پورا نظام اس محور کے گرد گھومتا ہے کہ اس میں حکومت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، جو اس کی کتاب (قرآنِ کریم) کے ذریعہ نازلِ العمل ہوتا ہے۔ اس نظام کو سب سے پہلے رسول اللہؐ نے منسقل فرمایا۔ اس لئے اسے قرآن میں ”اللہ اور رسول“ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی وہ نظامِ خداوندی جسے اس کے رسول نے قائم کیا۔ رسول اللہؐ اس نظام کی مرکزی اتھارٹی تھے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد، یہی مرکزی حیثیت آپؐ کے جانشینوں کو حاصل ہوگئی، یعنی امورِ مملکت کے متعلق جو فرائض رسول اللہؐ سرانجام دیتے تھے وہی فرائض آپؐ کی وفات کے بعد، (مثلاً) حضرت ابوبکر صدیقؓ سرانجام دیتے تھے۔

۲- اولوالامر (عمالِ حکومت - افسرانِ ماتحت)

نظم و نسقِ حکومت کے لئے، مرکز اپنے ماتحتِ عمال مقرر کرے گا۔ انہیں قرآنِ کریم نے اولوالامر (یعنی صاحبانِ حکم) کہہ کر پکارا ہے۔ ان "صاحبانِ حکم" کے فیصلوں کے خلاف مرکز میں اپیل ہو سکتی ہے، لیکن مرکز کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔ سو ردِ نثار میں ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ
فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ..... (۲۴/۵)

اے ایمان والو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے "صاحبِ حکم" لوگوں کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تمہارا باہمی تنازعہ ہو جائے تو اسے "اللہ اور رسول" (مرکز) کی طرف لے جاؤ۔ مرکز، اس متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قرآنِ کریم کے مطابق کرے گا۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ط۔ (۲۴/۵) جس بات میں تم اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے "یعنی یوں تو افسرانِ ماتحت بھی تمام امور کے فیصلے قرآنی احکام کے مطابق کریں گے لیکن اگر کسی معاملے میں کسی کو ان کی تعبیر سے اختلاف ہو تو اس کی اپیل مرکز کے پاس جائے گی اور مرکز کی تعبیر آخری اور قطعی سمجھی جائے گی۔ مرکز بھی کسی ایک فرد کا نام نہیں ہوگا بلکہ صدرِ مملکت کی ایک مشاورتی کونسل ہوگی۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ

وَمَشَاوِرُهُمْ فِي الْأُمُورِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ط۔ (۳۱/۱۵۸)

اور امورِ مملکت میں ان سے مشورہ کیا کرو۔ پھر جب تم کسی معاملہ میں (پختہ فیصلہ کر لو تو پھر قانونِ خداوندی کی حکمت کے بھر دے پر) (اسے استقامت سے نافذ کر دیا کرو)۔

۳- عمال کے لئے شرائط

عمالِ حکومت کے لئے بھی سب سے پہلی شرط "اہلیت" ہے۔ اِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا... (۲۵/۵) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو اختیارات تمہیں بطور امانت دیئے گئے ہیں انہیں ان کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہوں۔

دوسری شرط علم اور صحت کی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت طاووسؑ کو بنی اسرائیل کا کمانڈر مقرر کیا تو اس

انکاب کی وجہ یہ بتائی تھی کہ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَیْكُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَہٗ فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط (۲۴۴) اللہ نے اسے تم پر (کمان کرنے کے لئے) منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسمانی صحت سے حصّہ دیا ہے۔

تیسری شرط عاقل اور بالغ ہونے کی ہے۔ سورہ نسا میں ہے کہ تم یتیموں کے مال کی نگرانی کیا کرو حتیٰ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ۔ فَإِنْ اَنْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (۲۴۵) ”یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر تک پہنچ جائیں اور تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دیا کرو۔“ اہم فرائض کی سرانجام دہی کے لئے چالیس سال کی عمر کی شرط بھی عائد کی جاسکتی ہے فقہان میں ہے: حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشَدُّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَہٗ (۲۴۶) ”حتیٰ کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچتا ہے اور چالیس سال کی عمر کا ہو جاتا ہے۔“ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ انسان میں صلاحیتوں کی پختگی بڑی عمر میں جا کر آتی ہے۔

چوتھی اور سب سے اہم شرط یہ ہے کہ جو لوگ

(i) تو انہیں خداوندی سے بے خبر ہوں۔

(ii) اپنے جذبات (الفرادی مفاد پرستیوں) کے پیچھے لگ جائیں۔ اور

(iii) جن کے معاملات حد سے گزر جائیں۔

اُن کے سپرد امورِ مملکت کبھی نہیں کرنے چاہئیں۔ قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ ایسے لوگوں کا حکم کبھی نہیں مانا جائیگا۔ وَلَا تَطْعَمَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰیہٗ۔ وَكَانَ اَمُوًّا خُرطًا (۲۴۷) اور تو اس کا حکم مت مان جس کا دل تو انہیں خداوندی سے بے خبر ہے اور جو اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے اور جس کا معاملہ حد سے گزر چکا ہے۔

۴۔ نااہلی

جس ”صاحبِ حکم“ کے اعمال (کام، معاملات) ”غیر صالح“ ہو جائیں، اس سے اختیارات واپس لے لینے ہوں گے، کیونکہ وہ نااہل نہیں رہتا۔ حضرت نوحؑ کے بیٹے کو اس کے ”غیر صالح“ اعمال کی وجہ سے حضرت نوحؑ کے اہل میں سے نکال دیا گیا تھا۔ (اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اٰہْلِکَ۔ اِنَّہٗ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا) (۲۴۸)۔

واضح رہے کہ یہ شرائط، یا کسی کو نااہل قرار دینے کی وجوہات، عمالِ حکومت (افسرانِ ماتحت) تک محدود

نہیں۔ ان کا اطلاق ان تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہوگا جو کاروبارِ مملکت سے کسی نہج سے بھی متعلق ہوں۔ مثلاً رائے دہندگی، پارلیمان یا مجلسِ شوریٰ کی رکنیت، کابینہ کی وزارت، ہجرتی کہ مملکت کی صدارت عظمیٰ۔ یہ تمام مناصب، اہلیت اور صلاحیت کی شرائط سے مشروط ہوں گے۔

لہذا، اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہوگی کہ

امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے صدرِ مملکت اور اس کی مجلسِ شوریٰ پر مشتمل مرکز ہوگا۔ اس مرکز کے ماتحت عمال ہوں گے، جنہیں مرکز کی طرف سے اختیارات تفویض کئے جائیں گے۔ ماتحت عمال کے فیصلوں کے خلاف افرادِ ملت کو اپیل کا حق ہوگا۔ لیکن مرکز کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جائیگا۔

صدرِ مملکت، اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان (یعنی وزراء کابینہ) ارکانِ مجلسِ مقننہ (پارلیمان) متعلقینِ ہیئتِ اجرائیہ (اریابِ حکومت) اور افسرانِ ماتحت پر اور ان دیگر افراد پر جو کسی نہ کسی انداز سے امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے متعلق ہوں بحسب ذیل شرائط کا اطلاق ہوگا۔

(۱) قرآنِ کریم کے اصول و احکام سے واقفیت۔

(۲) متعلقہ امور کے سرانجام دینے کی اہلیت۔ اس میں علومِ حاضرہ بھی شامل ہیں۔

(۳) صلاحیت، یعنی سیرت و کردار کی پاکیزگی۔

(۴) ذاتی جذبات و مفاد سے بلند ہو کر، معاملات کی سرانجام دہی کی صلاحیت۔

(۵) عاقل، بالغ اور مندرست ہونا۔

اگر کوئی شخص کسی وقت ان شرائط میں سے کسی شرط پر پورا نہ اترے تو جس طریق سے اس کا انتخاب یا تقرر عمل میں آیا تھا، اسی طریق سے اسے معطل یا برطرف کیا جاسکتا ہے۔

باب ششم

مقننہ کے اختیارات

اسے پھر دہرایا جائے کہ قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کے لئے اصولی راہ نمائی دی ہے اور (بجز چند مستثنیات)

ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ جس کتابِ عظیم کو سر زمانے کے انسانوں کے لئے ضابطہٴ حیات بننا ہوا سے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ انسانی زندگی سے متعلق اصول تو غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن ان کی جزئیات غیر متبدل نہیں رہ سکتیں۔ انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق قابلِ تغیر و تبدل ہونا چاہیے جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا، بعض لوگوں نے چاہا کہ قرآنی اصولوں کی جزئی تفصیل بھی قرآن میں بیان کر دی جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے سوالات سے سختی سے روک دیا اور کہا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِن تُبَدَّلَ لَكُمْ
تَسْؤُكُمْ ؕ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلَ الْقُرْآنُ تُبَدَّلَ لَكُمْ
عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (۱۰۶-۱۰۷) نیز (۱۰۸)

اے ایمان والو! ان چیزوں کے متعلق (جو قرآن میں بیان نہیں کی گئیں) سوال نہ کیا کرو۔ اگر انہیں تمہارے لئے ظاہر (بیان) کر دیا جائے تو وہ باعثِ تکلیف ہو جائیں گی۔ اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت دریافت کرو جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو انہیں تمہارے لئے بیان کر دیا جائے گا۔ (جو سوالات تم اس وقت تک کر چکے ہو) اللہ اس سے درگزر کرتا ہے۔ وہ غفور و حلیم ہے۔ تم سے پہلے ایک قوم نے (اس قسم کے) سوالات پوچھے تھے (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) انہوں نے (بعد ازاں) ان کے ماننے سے انکار کر دیا۔

قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی جزئیات متعین کرنا، اسلامی مملکت کی مجلسِ مقننہ کا کام ہو گا۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے، لیکن ان کی جزئیات میں عند الضرورت تغیر و تبدل یا حک و اضافہ ہوتا رہے گا۔ ان اصولوں کے متعلق فرمایا:-

وَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى النَّاسِ إِذْ أَنْزَلَ فِيهِ الْفُصُولَ الْأُولَىٰ ۚ وَلَهُ الْأَمْرُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ عَزِيزٌ ۝ (۱۱۶)

اور تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں۔ (اس لئے کہ یہ اس خدا کی متعین کردہ باتیں ہیں) جو سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اس میں نہ کسی سے کسی قسم کی مفاہمت (COMPROMISE) کی جا سکتی ہے، نہ کسی کی رعایت کی جا سکتی ہے۔

سورہ یونس میں ہے :-

وَإِذَا نَسَخْنَا إِلَهُاتِهِمْ آيَاتِنَا أَنْتَبِيتُمْ لِأَقَالِ السَّيِّئِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا أَنتَ بَقْرَانٍ
غَيْرِ هَذَا أَتَدَّبَّرْتُمُ الْفُلَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَ لَهٗ مِنْ تِلْقَائِي نَفْسِي
إِنْ أَتَّبِعْ إِلَّا مَا يُوَسَّعِي إِلَىٰ - إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۰۱)

اور جب ان کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو وہ لوگ جو ہمارے سامنے آنے کے
آرزو نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن (ضابطہ و قوانین) لاؤ (تو ہم
تمہارے ہمنا ہوں گے یا کم از کم) اس میں (ہماری منشاء کے مطابق) تبدیلی کر دو۔ ان سے کہہ دو کہ
مجھے کیا اختیار ہے جو میں اپنی طرف سے اس میں کوئی رد و بدل کر سکوں؟ میں تو صرف اپنی وحی کی
پیروی کرنے (کے لئے بھیجا گیا ہوں) اگر میں اس باب میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک
سخت مصیبت انگیز عذاب سے ڈرتا ہوں۔

لہذا اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہوگی کہ

مملکت کی مجلسِ مفسنہ، قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے
اپنے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق، جزئی قوانین مرتب کرنے کا اختیار رکھے گی۔ ان اصولوں
میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ البتہ ان کی حدود کے اندر جو جزئی قوانین باہمی
مشاورت سے مرتب ہوں گے، عند الضرورت ان میں ترمیم و تنسیخ یا حکم و اضافہ ہو سکے گا۔
ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو قرآنی حدود سے ٹکرائے۔

باب ہفتم

- اسلامی مملکت کا پورا نظام، عدل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ
- (۱) تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکرم سمجھا جائے۔
 - (۲) ہر ایک کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔
 - (۳) معاشرہ میں ان کی پوزیشن ذاتی صلاحیتوں کی رُو سے متعین کی جائے۔

(۴) ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام دیا جائے۔

(۵) کسی کو بنیادی حقوقِ انسانیّت سے محروم نہ کیا جائے۔

(۶) متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے اُسی قانون کی روش سے کئے جائیں جو قرآن کے اصولوں پر متفرع ہو

اور جس کا اطلاق ہر ایک پر یکساں طور پر کیا جائے۔

عدل کے لئے قرآنِ کریم نے خاص طور پر کہا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ..... (۱۶) یقیناً اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا مطلق حکم ہے جس میں کسی حالت میں استثناء نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ جو لوگ ہم سے دشمنی کریں ان سے بھی عدل کرنا ضروری ہوگا۔ سورہ مائدہ میں ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هَوًىٰ أَقْرَبَ لِلتَّقْوَىٰ (۵) ”کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ بہر حال عدل کرو۔ یہ روش تقویٰ سے قریب تر ہے۔“

عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ مجرم کو اس کے کئے کی سزا ملے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ ۚ يَا أُولِی الْأَلْبَابِ..... (۲) ”اے صاحبانِ عقل و بصیرت! تمہارے لئے قانونِ قصاص میں زندگی کا لازمی شیعہ ہے۔ لیکن سزا ہمیشہ باندازہ جرم ہونی چاہیے۔ جزاء و سبیلہ یَمِثْلُهَا لا۔ (۱۱) اور جہاں دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور اس میں اصلاح کا امکان ہے اسے معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ فَ مَن عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (۲۲) جو شخص (مجرم کو) معاف کر دے اور اس طرح اس کی اصلاح کر دے تو اس حسنِ عمل کا بدلہ اللہ سے ملے گا۔

عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جرم کی سزا صرف مجرم کو ملے۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَذَابَهَا۔ (۱۶) اور جو جرم کرے گا اس کا دباں اسی پر پڑے گا۔ نیز یہ بھی کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری آپ اٹھائے۔ لَا تَنۢبِرُ رُۖوَاۤیۡرَہٗ وَ زَرَ اٰخِرٰی۔ (۶) ”کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“

قرآنِ کریم نے نظامِ عدل کی تمام تفصیلات کو دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ لَا تَظْلِمُوۡنَ وَلَا تُظْلَمُوۡنَ (۲۹) ”نہ تم کسی پر زیادتی کرو اور نہ تم پر زیادتی ہو۔“

ظاہر ہے کہ اس نظامِ عدل کو ایسے افراد ہی قائم رکھ سکتے ہیں جو نہ اپنے میلانات اور عواطف سے اثر پذیر ہوں اور نہ ہی جن پر کسی قسم کا کوئی خارجی دباؤ ہو۔ عدل کے معاملے میں مفاہمت (COMPROMISE) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ اپنی ذات کے ساتھ اور نہ ہی کسی خارجی قوت کے ساتھ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی

طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ **وَدُّواْ اَلْوَسَدُ مِمَّنْ قَبِیْذٌ مِّمَّنْ هُنُوْۤا** (۶۸) یہ چاہتے ہیں کہ تو مہانت اختیار کرے تو یہ بھی مہانت اختیار کر لیں۔ تو مہنڈرا سا اپنے مقام سے ہٹ جائے تو یہ تم سے مفاہمت کر لیں۔ نظامِ عدل میں ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے اسلامی مملکت میں عدلیہ کو خارجی اثرات سے قاطعیتاً آزاد رکھنا چاہئے۔ لہذا اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہونی چاہیے کہ

مملکت کا پورا کاروبار عدل کے بنیادی اصول کے مطابق طے پائے گا۔ عدل سے مختصراً مراد یہ

ہے کہ

- (i) تمام انسانوں کو پیدائش کے لحاظ سے یکساں واجب التکلیف سمجھا جائے
- (ii) ہر ایک کی صلاحیتوں کے لئے یکساں ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔
- (iii) معاشرہ میں ہر ایک کی پوزیشن اس کی ذاتی صلاحیت اور کردار کی رُو سے متعین کی جائے۔
- (iv) ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام دیا جائے۔
- (v) کسی کو بنیادی حقوق سے محروم نہ کیا جائے۔
- (vi) مجرم کو اس کے جرم کی سزا ملے اور سزا باندازہ جرم ہو اور جہاں اصلاح کا امکان ہو وہاں سزا سے معافی دے دی جائے۔

(vii) ہر شخص اپنا اپنا بوجھ خود اٹھائے

(viii) نہ کوئی تم پر زیادتی کرے نہ تم کسی پر زیادتی کرو۔ اور

(ix) تمام متنازعہ فیہ امور کے فیصلے اس قانون کی رُو سے طے پائیں جو قرآن کے اصولوں پر متفرع ہو۔

عدلیہ، نظامِ عدل کے قیام کا ذمہ دار ہوگا۔ وہ ہر قسم کے خارجی اثر یا دباؤ سے آزاد ہوگا۔ عدالت

عالیہ کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا تقرر پارلیمان کی تصویب سے ہوگا۔

(x) عدل کا حصول بلا معاوضہ ہوگا اور حکومت کی طرف سے مفتی مقرر ہوں گے جو لوگوں کو بتائیں گے

کہ قانون کی رُو سے ان کے دعوے یا مطالبہ کی پوزیشن کیا ہے۔

باب ششم

مملکت کے مقاصد

قرآن کریم کی رو سے مملکت مقصود بالذات نہیں مقصود بالذات فرد ہے اور مملکت فرد کی انفرادیت کے تحفظ اور اس کی ذات کی نشوونما اور استحکام کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے مملکت کے سامنے جو پروردگار م رکھا ہے وہ اسی بلند مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ اسے اس نے مختلف مقامات پر مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مثلاً سورہ نور میں ہے:-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ
وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ - (۲۴/۵۵)

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لاتے ہیں اور اعمال صالحہ کرتے ہیں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسی کہ اس نے ان قوموں کو حکومت عطا کی جو ان سے پہلے سہ گزری ہیں۔ (حکومت عطا کرنے سے مقصد یہ ہے کہ) وہ ان کے لئے ان کے اس دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم کر دے اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے۔ (اور اس طرح انہیں اس قابل بنادے کہ) وہ صرف میری حکومت اختیار کریں اور میری حکومت میں کسی اور کو شریک نہ کریں جو اس کے بعد بھی اس دین سے انکار کرے تو یہی لوگ ہیں جو ناسق ہیں۔

اس کے بعد ہے:-

وَآتُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ - وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ - لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ - (۲۴/۵۶)

اور تم نماز قائم کرو اور دیتائے زکوٰۃ کا انتظام کرو، اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تمہاری نشوونما ہوتی رہے۔

ان آیات میں مجمل طور پر اسلامی مملکت کے مقاصد کو بیان کیا گیا ہے، یعنی مملکت سے مقصود یہ ہے کہ

(۱) الدین کے نظام کا استحکام ہو۔ (۲) افرادِ مملکت کو کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو۔

(۳) اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو۔

(۴) ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں ہر فرد از خود پوری دلجمعی سے قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلے (اسے

نظامِ صلوٰۃ کہتے ہیں) اور

(۵) پہلے افرادِ مملکت کو، اور اس کے بعد تمام نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما ملتا رہے۔

افرادِ مملکت، اس نظام کے مرکز کی اطاعت انہی مقاصد کے بروئے کار لانے کے لئے کریں گے اور اسی سے ان کی

اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔

اس جگہ قرآن کریم نے ان مقاصد کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دوسرے مقامات پر انہیں ”اقامتِ صلوٰۃ“ اور ”ایتائے زکوٰۃ“ کے جامع اصطلاحات میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ مثلاً سورہ حج میں ہے۔

الَّذِينَ إِذَا مَكَتُّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِأُمُورٍ مَّعْرُوفٍ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَاللَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۲۲)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ملک میں حکومت مل جائے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور تمام امور اللہ کے لئے سرانجام پائیں گے۔

لہذا اسلامی مملکت کا بنیادی مقصد افرادِ مملکت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق چلانا اور ان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا ہے۔ نشوونما میں، افراد کی تمام طبعی ضروریات بھی شامل ہیں اور ان کی ذات کی مضمحلہ حیثیتوں کی برومندی بھی۔

قبل اس کے کہ ہم اس اجمال کی تفصیل تک پہنچیں، ایک بنیادی نمک کی وضاحت ضروری ہے۔ جب اسلامی مملکت انسانوں سے خدا کے قوانین کی اطاعت کراتی ہے تو انسانوں کے متعلق جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، مملکت ان ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ ان ذمہ داریوں کا پورا کرنا اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔

ان ذمہ داریوں میں سب سے اہم اور بنیادی ذمہ داری سامانِ رزق کا بہم پہنچانا ہے۔ ”رزق“ میں وہ سامانِ زیست آجاتا ہے جس سے انسان کے جسم کی پرورش اور اس کی ذات کی مضمحلہ حیثیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ سورہ ہود میں ہے:-

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا — (۱۱)

اور زمین میں کوئی متنفس (چلنے والا) ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

یہی وہ ذمہ داری ہے جس کے پیشِ نظر اسلامی مملکت، افرادِ مملکت کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّا هُمْ (۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

جہاں تک انسان کی جسمانی ضروریات کا تعلق ہے قرآن نے روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ کو ان میں شامل کیا ہے۔ (دیکھیے ۲۸)

لہذا اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہوگی۔

مملکت مقصود بالذات نہیں مقصود بالذات فرسہ ہے۔ مملکت فرد کی انفرادیت کے تحفظ اور اس کی

ذات کے استحکام کا ذریعہ ہے اس مقصد کے حصول کیلئے مملکت ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے گی جنہیں ان لوگوں کے ضمن میں خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ ان میں رزق (سماں زلیست) کی بہم رسانی سب سے مقدم ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے مملکت ایسا انتظام کرے گی جس سے تمام افراد مملکت کو (ان کی اور ان کے بیوی بچوں کی) بنیادی ضروریات زندگی باطمینان ملتی رہیں اور کوئی فرد ان سے محروم نہ رہے۔ نیز مملکت وہ تمام اسباب و ذرائع بہم پہنچائے گی جن سے ہر فرد کی ذات کی معزز صلاحیتیں نشوونما پاسکیں۔

وسائلِ پیداوار

ظاہر ہے کہ مملکت ان عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وسائل پیداوار مملکت کی تحویل میں نہ ہوں۔ قرآن کریم نے وسائلِ پیداوار (ارض) کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھنے کے لئے کہا ہے (سَوَاءٌ يَلْسَآئِلِيْنَ - ۲۱) اور (مَتَّاعًا يَلْمُزُوهَا - ۵۶) ”بھوکوں کے لئے متاعِ حیات“ قرار دیا ہے۔ وسائلِ پیداوار کے علاوہ فاضلہ دولت بھی اصل مملکت کی تحویل میں رہتی ہے۔ (اصلاً سے مراد یہ ہے کہ اساسی طور پر وہ مملکت کی تحویل میں ہوتی ہے لیکن مملکت اپنی انتظامی سہولتوں کے لئے چاہے تو اسے افراد کے پاس بطور امانت رکھ سکتی ہے) فاضلہ دولت کے ضمن میں سورہ بقرہ میں ہے: يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ — (۲۴۱) ”تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (دوسروں کے لئے) کس قدر دولت کھلی رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے سب“ اسلامی مملکت میں نہ وسائلِ رزق کسی کی ذاتی ملکیت میں رہتے ہیں اور نہ فاضلہ دولت۔ مملکت کے پاس بھی یہ چیزیں بطور امانت رہتی ہیں تاکہ وہ انہیں قرآنی اصولوں کے مطابق صرف کرے۔

لہذا اسلامی آئین کی اگلی شق یہ ہوگی کہ

مذکورہ صدر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مملکت کے ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں ہوں اور فاضلہ دولت افراد کی ملکیت متصور نہ ہو یہ سب بطور امانت مملکت کی تحویل میں رہیں تاکہ مملکت انہیں لوہے کی لٹائی کی نشوونما کے کام میں لائے بالفاظِ دیگر، مملکت میں قرآن کریم کا نظامِ ربوبیت نافذ ہو۔

طا اس اجمال کی تفصیل کے لئے میری کتاب ”نظامِ ربوبیت“ دیکھئے۔

باب نہم

افراد اور مملکت کا تعلق

چونکہ مملکت کا فریضہ ان تمام ذمہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو انسانوں کے سلسلے میں خدائے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، اس لئے افراد مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ خدائے جو واجبات ان پر عائد کر رکھے ہیں، وہ مملکت کو ادا کریں۔ اس سلسلہ میں قرآن نے، مملکت اور افراد کا تعلق ایک معاہدہ کی رو سے قائم کیا ہے جو بڑا جامع ہے۔ سورہ توبہ میں ہے:-

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآتٍ لَهُمُ الْجَنَّةُ (۹)

یقیناً اللہ نے مومنین سے اُن کے نفوس اور اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔
یعنی افراد مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی جان اور مال، حکومتِ خداوندی کی امانت سمجھیں اور مملکت کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان کے لئے ایسا انتظام کرے کہ انہیں یہاں بھی جنتی زندگی میسر ہو اور آخرت میں بھی۔ اس معاہدہ کو اسلامی آئین کے اندر شامل ہونا چاہیئے۔

لہذا اس آئین کی اگلی شق یہ ہوگی کہ

افراد مملکت، اپنی جان اور مال کو مملکت کی امانت سمجھیں گے کہ وہ انہیں عند الضرورت احکامِ خداوندی کے مطابق طلب کرے اور مملکت ایسا انتظام کرے گی جس سے انہیں اس دنیا اور آخرت دونوں میں جنت کی زندگی میسر ہو جائے۔ یہ معاہدہ جانبین کی طرف سے مساوی ہوگا۔

باب دہم

بنیادی حقوق

مملکت میں افراد کو کون سے بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں؛ اس سوال نے ہمارے زمانے میں بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ اس ضمن میں، مختلف آئینی مملکتوں کے دساتیر میں بنیادی حقوق کی فہرست شامل

ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ نے اپنے خاص منشور میں ان حقوق کی تصریح کر رکھی ہے۔ لیکن کسی مملکت کا آئین ہو یا اقوام متحدہ کا منشور، ان میں تمام بنیادی حقوق مشروط ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ حقوق بہ طورِ استدار (VALUES) دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اقدار مستقل یا مطلق ہیں اور کچھ اضافی مستقل اقدار سے مراد ہیں ایسے حقوق جو غیر مشروط ہیں اور اضافی اقدار سے مفہوم، مشروط حقوق ہیں۔ مثلاً ذق (سامانِ زیست) کا ملنا ایک مستقل قدر ہے۔ یہ فردِ مملکت کو بلا شرط ملے گا۔ کوئی فرد کسی حالت میں بھی اس سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔ اس کے برعکس عہد کی حفاظت، اضافی قدر ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بے گناہ کو قتل کر دے گا تو اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جاسکے گی۔ اس سے مستقل اقدار اور اضافی اقدار کا فرق سمجھ میں آجائے گا۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) قرآن کریم میں بیشتر اقدار مستقل ہیں اور کچھ اقدار اضافی۔ اس کی تفصیل اس مقالہ میں دی چکی ہے جو انسان کے بنیادی حقوق کے عنوان سے، پہلے آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے۔

لہذا اسلامی مملکت کے آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ
افرادِ مملکت کو وہ تمام بنیادی حقوق حاصل ہونگے جن کی تفصیل قرآن کریم میں دی گئی ہے اور جسے
انگِ فہرست میں درج کر دیا گیا ہے، ان میں سے جو حقوق مشروط ہیں ان کی شرائط بھی وہی ہوں
گی جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں متعین کی جائیں گی۔

باب یازدہم

غیر مسلموں کی پوزیشن

اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کی پوزیشن کا سوال بڑا اہم ہے۔ اس لئے اسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دنیا کی مروجہ سیاست میں، قومیت کی تشکیل، وطن یا نسل کے اشتراک سے کی جاتی ہے، بالخصوص وطن کے اشتراک سے، یعنی ایک ملک کے بسنے والے تمام افراد، بلا تمیز مذہب ایک قوم بن جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کی رو سے، قوم کی تشکیل، ایڈیالوجی کی بنیاد پر ہوتی ہے یعنی جو لوگ اسلامی ایڈیالوجی کو

تسلیم کریں وہ ایک قوم کے افراد اور جو اس آئیڈیالوجی پر ایمان نہ رکھیں وہ قوم کے دائرہ سے باہر، خواہ وہ اسی ملک میں کیوں نہ بستے ہوں۔ قرآن نے نوح انسان کی تفریق اسی معیار کے مطابق کی ہے۔

هُدَا الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ - (۶۲)

اللہ وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو پیدا کیا سو تم میں سے کچھ کافر ہیں کچھ مومن۔

وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے، یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلا لحاظ رنگ، نسل، وطن، زبان، مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے اور ان سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر خود غور و فکر کریں اور اس کے بعد علی وجہ البصیرت اور بطیب خاطر یعنی دل اور دماغ کی رضامندی سے سمجھیں کہ یہ آئیڈیالوجی ان کے لئے قابل قبول ہے تو اسے قبول کر لیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو اسے مسترد کر دیں۔ اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہوگا۔ (لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ) یہ بھی قرآن کی مستقل قدیم افراد مملکت کا بلا مشروط حق ہے۔ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ

وَمَنْ مَّنَلْ فَإِنَّمَا يَمُوتُ عَلَىٰهَا ۚ وَمَا آنتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ - (۳۹)

ہم نے تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہے (جو شخص اسے قبول کرے) سیدھی راہ پر چلے گا تو اس کا فائدہ خود اسے پہنچے گا اور جو غلط راستہ اختیار کرے گا تو اس کا نقصان خود بھگتے گا! اے رسول! تو ان کے فیصلے اور عمل کا ذمہ دار نہیں۔ (نہ

ہی ان پر دار و ذمہ مقرر کیا گیا ہے کہ انہیں زبردستی صحیح راستے پر لائے)۔

اس سے قرآن نے، اسلامی ملت میں شامل ہونے اور اسلامی مملکت میں شریک کار بننے کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے اندر داخل ہو جائے۔ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا - (۳۰) جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ اس "إِذْنِ عَامٍ" کے بعد اگر کوئی شخص اس کے اندر نہیں آنا چاہتا تو وہ اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے۔ سورہ فاطر میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ ۖ - اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں حکومت عطا کی ہے۔ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ - اگر کوئی شخص اس آئین و دستور کو نہیں مانتا جس پر اس حکومت کی عمارت اُستوار ہے تو اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اس آئین مملکت (اسلامی آئیڈیالوجی) کو تسلیم نہ کرنے سے اگر وہ کسی

قسم کے نقصان میں رہتا ہے تو اسے اس کی شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ خود کردہ راعلا جہنمت۔
 قَمَاقَافٌ فَحَلَبٌ كُفْرًا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص کسی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے لیکن اسے
 تسلیم کرنے والوں کو جو مفاد حاصل ہیں ان میں برابر کا شریک ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے انکار
 سے اسے کچھ نقصان ہوتا ہے تو اسے اس نقصان کو برداشت کرنا ہوگا۔ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ
 كُفْرَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرَهُمْ إِلَّا خَسَارًا۔
 (۲۵)۔ اس انکار سے انہوں نے خیر و برکت کے جو دروازے اپنے اوپر بند کئے ہیں اس کے نقصان کے
 وہ خود ذمہ دار ہیں۔ اس کا افسوس ضرور ہے۔ (یا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ)۔ لیکن اس کا علاج
 ہمارے پاس نہیں۔ علاج خود ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے وہ جس وقت
 بھی اپنی غلطی کو محسوس کریں اس کا ازالہ کر لیں۔ اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کر لیں اور بلا روک اس کے اندر
 داخل ہو جائیں۔

انہیں شریک راز نہیں کیا جاسکتا

لہذا اسلامی مملکت میں بسنے والوں میں سے جو لوگ اسلامی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں انہیں شریک
 حکومت نہیں کیا جاسکتا۔ اس باب میں قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس شرح و بسط سے وضاحت کر دی
 ہے کہ اس کے اس تصور کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آسکتی۔ شریک حکومت کرنا تو ایک طرف وہ انہیں
 شریک راز بھی نہیں کر سکتا۔ سورہ آل عمران میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ لَا يَأْمُرُكُمْ
 خَبْرًا لَّا... إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ (۱۱۹-۱۲۳)

اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں
 اٹھا رکھیں گے جس بات سے تمہیں نقصان اور مصیبت پہنچے وہ اُسے دل سے پسند کرتے ہیں۔
 ان کے سینے کے اندر چھپے ہوئے جذبات بغض و عناد میں سے بعض اوقات کچھ (بے اختیار) ان
 کی زبان سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو ان کے سینے کے اندر چھپے رہتے ہیں وہ ان ظاہر ہو جانے
 والوں کے مقابلہ میں کہیں بڑھ کر ہیں۔ ہم نے تمام باتیں اچھی طرح واضح کر دی ہیں۔ اگر تم عقل و فکر

سے کام لوگے (توان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی)۔ ذرا سوچو تو سہی! کیا تم ان لوگوں سے محبت کرو گے جو تم سے کبھی محبت نہیں کرتے۔ حالانکہ تم (اپنی اور ان کی) تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور جب یہ لوگ تم سے ملنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی (تمہاری آئیڈیالوجی کو) صحیح تسلیم کرتے ہیں اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو غصے کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ اپنے غصے (کی آگ) میں جل مرو۔ اللہ تمہارے سینوں کے اندر چھپے ہوئے جذبات تک سے واقف ہے۔ اگر تمہاری حالت بہتر نہ جائے تو یہ چیز انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو یہ اُس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم استقامت سے رہو گے اور ان مخالفین سے اپنی حفاظت کا سامان کرتے رہو گے تو ان کی کوئی سازش تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اللہ ان کے تمام اعمال کو محیط ہے۔

قرآن کریم میں اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں (مثلاً ۲/۱۷۷، ۲/۱۸۰، ۲/۲۲۷، ۲/۲۳۰ وغیرہ)

یہ تنگ نظری نہیں

حیرت ہے کہ بعض حلقوں میں اس نظریہ کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے اور اسے "تنگ نظری" پر محمول کیا جاتا ہے۔ حالانکہ کوئی نظام جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو، ان لوگوں کو کبھی شریکِ حکومت نہیں کر سکتا جو اس آئیڈیالوجی کے مخالف ہوں۔ آئیڈیالوجی تو خیر بہت بڑی چیز ہے، عام جمہوری حکومتوں میں جو پارٹی برسرِ اقتدار ہو وہ مخالف پارٹی کے افراد کو شریکِ حکومت نہیں کرتی۔ اسلام کے معاملہ میں بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین درحقیقت اس کی آئیڈیالوجی ہوتا ہے۔ جو لوگ آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ اس مملکت کے آئین کو تسلیم نہیں کرتے۔ اب سوچئے کہ دنیا میں کوئی مملکت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ان لوگوں کو شریکِ حکومت کرے جو اس کے آئین کو تسلیم نہ کریں؟ کیا یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ اسلامی مملکت کا مقصد اور نصب العین تو قوانینِ خداوندی کی عملاً تنفیذ ہو اور اس مقصد کے حصول میں ان لوگوں کو شریک کر لیا جائے جو خود اس مقصد ہی کے خلاف ہوں؟

غیر مسلموں سے حسن سلوک

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جنہیں قرآنِ کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ ان کی جان، مال، عزت، عبادت گاہیں سب محفوظ ہوں گی۔ انہیں شخصی مذہب کی آزادی ہوگی۔ ان سے حسن سلوک کیا جائے گا۔ (۶) ان سے ہر حال میں عدل کیا جائے گا۔ (۵) حقیقت یہ ہے کہ ایک لحاظ سے یہ مسلمانوں سے بھی زیادہ فائدہ میں رہیں گے کہ گائے کے سینک مسلمانوں کے سپرد ہوں گے اور اس کے دودھ میں یہ غیر مسلم بھی حصہ دار ہوں گے۔ دشمن حماء آور ہوگا تو مسلمان فوجیں اپنے سینوں پر گولیاں کھا کر غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کریں گی۔ (۲۲)۔

اگر ترک وطن کرنا چاہیں

ان تمام مراعات کے باوجود، اگر غیر مسلم ترک وطن کرنا چاہیں تو انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام اسلامی مملکت کے ذمہ ہوگا۔ قرآن میں ہے:-

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلِمَ
اللَّهِ ثُمَّ ابْلِغْهُ مَّا مَنَّهُ ذَٰلِكَ يَأْتِيهِمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ۔ (۹)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لئے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر (اگر وہ کہیں اور جانا چاہے تو) اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ یہ بات سمجھتے نہیں (کہ قرآنِ کریم کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں)۔

لیکن اگر وہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے اس کے آئین سے سرکشی برتیں تو انہیں بغاوت کی سزا ملے گی۔ (۳۳-۳۴) بغاوت کی سزا مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے یکساں ہے۔

لہٰذا اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ

مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، امورِ مملکت میں شریک نہیں کئے جاسکیں گے، کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے اور اس وجہ سے مسلم قوم کے افراد نہیں بننا چاہتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی

حقوقِ انسانیت حاصل ہوں گے۔ ان کی جان، مال، آبرو، پرستش گاہیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں شخصی مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ ان سے عدل و انصاف کرنے میں ان میں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

اس کے باوجود اگر یہ لوگ کسی ایسی مملکت کی طرف منتقل ہونا چاہیں جو انہیں اپنی طرف لہانے پر آمادہ ہو تو اسلامی مملکت انہیں ان کے ماسن تک بہ حفاظت پہنچانے کا انتظام کرے گی۔ لیکن اگر یہ مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس کے آئین و قوانین سے سرکشی برتیں گے تو انہیں اس بغاوت کی وہی سزا دی جائے گی جو مسلمان باغیوں کے لئے مقرر ہوگی۔

باب دوازدهم

بین الاقوامیت

عالم گیر برادری

اسلامی مملکت ابتداءً ایک خاص خطہ، زمین میں قائم ہوتی ہے تاکہ یہ زمین، قوانینِ خداوندی کی عملاً نتیجہ خیزی کے لئے تجربہ گاہ بن سکے۔ اس تجربہ سے جو خوشگوار اور انسانیت ساز نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ خطہ، زمین تک محدود نہیں رہتے۔ ان کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ نظام پوری نوعِ انساں کے لئے آیہ رحمت ہے۔ اس کا مقصد عظیم تمام نوعِ انسان کے باہمی اختلافات مٹا کر اسے ایک عالم گیر برادری بنانا ہے۔ خدا کی طرف سے سلسلہ درشد و ہدایت کی غرض و غایت یہی تھی اور یہی اب قرآن کا مقصود ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَنفَقَعَتْ اللَّهُ السَّبِيحَاتِ مَبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ
وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُخَكِّمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۖ (۲۴۱)

تمام انسان درحقیقت ایک برادری کے افراد ہیں (لیکن یہ آپس میں اختلاف کرنے کی وجہ سے مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں)۔ سو اللہ نے انبیاء کو مبعوث کیا جو انہیں غلط راستوں کی

تباہیوں سے آگاہ کرنے والے اور صحیح راستے کی خوشگوار رہی کی خوشخبری دینے والے تھے اور ان کے ساتھ اللہ نے حق کے ساتھ ضابطہ و قوانین بھی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اخلاق و معاملات میں (حق و صداقت کے ساتھ) فیصلہ کرے (اور اس طرح انہیں پھر سے اُمتِ واحدہ بنادے)۔

انسانی مساوات | اس نے تمام نوعِ انسان کو واضح الفاظ میں بتا دیا کہ خون، رنگ، نسل وغیرہ کے امتیازات جو ان کے اُمتِ واحدہ بننے کی راہ میں بُری طرح حائل ہیں انسانوں کے خود ساختہ ہیں۔ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ (۲۱) ”ہم نے تم سب کو ایک جرثومہ حیات سے پیدا کیا۔ حتیٰ کہ اس میں مرد اور عورت میں بھی کوئی فرق نہیں۔ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً۔ (۲۲) ”اور اس جرثومہ حیات سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان سے پھر کثیر تعداد میں مرد اور عورت (سطحِ ارض پر) پھیلا دیئے۔ پیدائش کے اعتبار سے ہر انسانی بچہ یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ بَلَدًا)۔ اس لئے کہ ہر انسانی بچہ انسانی

احترامِ آدمیت | ذات کا حامل ہے (۲۳) اسلامی مملکت کے قیام کا مقصد، ساری دنیا میں عدل کا قیام ہے۔ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۲۴) ”تاکہ نوعِ انسان انصاف پر قائم رہے“ اور قیامِ امن بھی (وَلَا تَعْتَدُوا فِي الْأَمْرِ مِنْ مُمْسِكِينَ)۔ ۲۴۔ دنیا میں فساد پھیلانے ہوئے حد سے نہ بڑھو۔ جو جماعت اس مملکت کے قیام کا باعث بنتی ہے اُسے جماعتِ مومنین کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں وہ جماعت جو دنیا میں قیامِ امن کی ضامن ہو۔ اس نظام کے دوام و استمرار کے لئے یہ اصول بتایا گیا کہ

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَنَكُتْ فِي الْأَمْرِ مِنْهُ (طریقہ ۱)

اور جو چیز تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے اسے ہی زمین میں بقا نصیب ہوتی ہے۔

ربوبیتِ عالمینی | اسی لئے ”ربوبیتِ عالمینی“ تمام نوعِ انسان کی نشوونما — اس نظامِ خداوندی کا مقصود بتایا گیا۔ (۲۵)

ان مقاصد کے حصول کے لئے دنیا کی جو قومیں کسی قسم کی کوشش کریں گی، یہ مملکت ان سے تعاون کرے گی۔ اس کے خلاف اقدامات میں وہ کسی سے تعاون نہیں کرے گی۔ (وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ)۔ یہ مملکت اپنے تجربہ کے درخشندہ

نتائج کی روشنی میں، ان مقاصد کو عام کرتی جائے گی تا آنکہ
 وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا — (۳۹)
 زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔
 لہذا اس آئین کی ایک بنیادی شق یہ ہوگی کہ

۱۔ اس مملکت کے قیام کا منتہی یہ ہے کہ
 نوع انسان کے موجودہ اختلافات کو مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری (امّت واحدہ) کی لڑی میں
 پرو دیا جائے۔ اس کی عملی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ تمام انسانوں کا ضابطہ حیات اور
 نظام زندگی ایک ہو اور یہ ظاہر ہے کہ یہ ضابطہ حیات، خدا کے عطا فرمودہ ابدی اصولوں کے
 سوا اور کون سا ہو سکتا ہے۔

۲۔ دنیا میں امن اور عدل کا نظام قائم کیا جائے جو انسانی مساوات اور احترام آدمیت کے
 اصولوں پر مشتمل ہو۔

۳۔ ساری دنیا میں خدا کے نظام ربوبیت کو رائج کیا جائے تاکہ ہر فرد کی جسمانی پرورش اور
 اس کی ذات کی نشوونما کا اطمینان بخش انتظام ہو۔

۴۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، ان کے ماحصل کو نوع انسان کی منفعت کے لئے عام
 کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے پاکستان کی سرزمین کو تجربہ گاہ بنایا جائے تاکہ اسلامی آئین
 اور نظام کے درخشندہ نتائج دنیا کے سامنے آسکیں اور اس طرح اقوام عالم اس نظام کو
 عالی وجہ البصیرت قبول کر لیں۔ جو اقوام ان بلند مقاصد کے حصول میں کوئی عملی اقدامات کریں گی،
 انہیں مملکتِ پاکستان کا تعاون حاصل ہوگا۔

حرفِ آخر

یہ ہیں اس آئین کے بنیادی اصول جنہیں قرآنِ کریم، اسلامی مملکت کا اساسی ضابطہ قرار دیتا ہے۔
 اس آئین کے سوا کوئی اور آئین میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول قرار نہیں پاسکتا۔ اس لئے کہ یہ آئین ان

اصولوں پر مبنی ہے جن کے مطابق کائنات کی یہ کارگرہ عظیم اس حسن و خوبی سے سرگرم عمل ہے۔ قرآن میں ہے: **أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْتَخُونَ**۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور ضابطہ حیات اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ **وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا**۔ (۳۲) ”کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب طوعاً و کرہاً“ اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو خدا کے قوانین کو بطور ضابطہ زندگی اختیار کر لے اور چاہے تو اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرے، لیکن اسے اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ

مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳۳)۔

جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کا وہ دین (آئین) میرا خداوندی میں قابل قبول نہ ہوگا اور وہ آخر الامر دیکھ لے گا کہ وہ کس قدر نقصان میں رہا۔

یہ آئین قرآن کریم کی دفتیں میں محفوظ ہے۔ لہذا اسلامی مملکت کا ضابطہ حیات، قرآن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا، نہ ہی اس مملکت میں کوئی ایسا نظریہ، تصور یا قانون بارپا سکتا ہے جو قرآنی اصولوں کے خلاف ہو۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ ابْتَغَىٰ حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا وَالَّذِينَ اتَّيْنَهُمْ أَلْيَاتٌ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنْزَلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (۶۱)۔

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔ سو تو اس باب میں جھگڑا کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اس آئین کے اصول ہر طرح سے مکمل ہیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

وَقَسَمْتُ لَكُمْ رَبِّكَ مِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶/۶۶)
اور تیرے رب کی بات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔
وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہی آئینِ خدا کی ابدی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ، انسانوں نے جو آئین و ضوابط بھی مرتب کئے ہیں وہ ظن و قیاس پر مبنی ہیں، خواہ ان کے متبعین کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ملتِ اسلامیہ خدا کے دیئے ہوئے الدین کے سوا کسی اور کا اتباع نہیں کر سکتی۔

وَإِنْ تَطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ مِنْ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ
إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۶/۶۷)

اگر تو ان لوگوں کی بات ماننا جائے جو دنیا میں اکثریت میں ہیں تو تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ (خود) ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور محض اٹکیں دوڑاتے ہیں۔
(اس لئے ان کے پیچھے لگنے والے بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوٹیاں مارتے رہتے ہیں)۔

اس لئے آئینِ خداوندی کو چھوڑ کر دیگر اقوام کے آئین و ضوابط کا اتباع کرنا، مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ دوسری اقوام کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن ان کے ہاں کی کوئی ایسی چیز قبول نہیں کی جاسکتی جو قرآن کے آئین اور نظام کے خلاف ہو۔ اسلامی آئین کی اصل و بنیاد صرف خدا کی کتاب ہے۔ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ — (۲۱/۸)۔

